السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مارچ 2021ء کا شمارہ آپ کے ذوق مطالعہ کی نذر ہے۔

موسمِ بہار قدرت کا انمول عطیہ ہے۔ مارچ کے آغاز سے ہی بہار کے خوشگوار جھونکے فضا میں رنگ بکھیرتے محسوس ہوتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ رنگوں کی بہار آگئی ہو، پھولوں کا جوبن قابلِ دید ہوتا ہے۔ موسمِ بہار ترقی، خوشی، خوشحالی، امن وسکون اور آزادی کی علامت ہے۔

پاکستان، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی موسمِ بہار کا یادگار تحفہ ہے۔ جب دوقومی نظریے کی بنیاد پر رہنمایانِ ملت نے وطنِ عزیز پاکستان کو دنیا کے نقشے پر اُبھارنے کی نشاندہی کی اور آزاد مملکت کا خواب برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں بسایا اور آزادی کا خواب ہر دل کو سکون کی دولت سے مالا مال کرگیا۔ آزادی کو بھی بہار سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ سبحان وتعالیٰ ہمارے وطن پاکستان کو بہار کی طرح دلکش، حسین اور خوشگوار رکھے اور ہم سب کو آزاد بہاریں نصیب کرے آمین۔

۸ مارچ کو خواتین کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ سیمینار، مذاکرے، ورکشاپ کے ذریعے اس دن کی اہمیت کو اُجاگر کیا جاتا ہے۔ عصرِ حاضر میں پاکستانی خواتین ہر شعبے میں نمایاں ہیں اور اپنی تخیلاتی فکر اور ذہنی شعور کے ساتھ اپنی ذمے داریاں احسن طریقے سے ادا کررہی ہیں اور نسلِ نو کو بھی تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ کررہی ہیں۔ عورت، ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے روپ میں قوسِ وقزح کی صورت ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔

ادب شناس، ادب ساز اور تخلیق کار خواتین اوجِ ثریا سے بھی آگے اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور فطری حجاب کے اوصاف کے ساتھ اپنے مقام پر صورتِ کہسار کھڑی ہیں۔

ہر لمحہ اللہ کی شکر گزاری کیجیے کہ پاکستان جیسی نعمتِ ارضی دنیا میں کہیں نہیں ہے، اس کی قدر کیجیے۔ اپنا خیال رکھیں اور مجھے دعاؤں میں یاد رکھیں۔

اس ماہ کے ستارے:۔

عائشہ نازعلی، حمیرا فضا، سارہ عمر، زینب راجپوت، حنا دیہ احمد، ماریہ پارس خان، عائشہ اختر بٹ اور حنا احمد خان۔

دعا گو

مدیرہ

سعیدہ نثار

حمد

ذکر کرتی رہے زباں تیرا
لب پہ ہر دم رہے بیاں تیرا

گرچہ تیرا نشاں کوئی نہیں
ہے مگر ہر جگہ نشاں تیرا

تیری قدرت سے کچھ نہیں باہر
ہے مکاں تیرا، لا مکاں تیرا

رہنما تو ہی ہر سفر میں ہے
منزلیں تیری، کارواں تیرا

میری معراج ہے فقط اس میں
ہو جبیں میری، آستاں تیرا

تیری جانب سے خیر و شر کا وجود
ہر یقیں تیرا، ہر گماں تیرا

اشرف نقوی

نعت

میں سو جاؤں یا مصطفیٰ ﷺ کہتے کہتے
کھلے آنکھ صلی علیٰ کہتے کہتے

ستم پہ ستم سہہ گئے دشمنوں کے
حبیب خدا ﷺ یا خدا کہتے کہتے

گزرتے تھے کانٹے بھرے راستوں سے
رسول خدا ﷺ مرحبا کہتے کہتے

اندھیروں میں ہم نے کیا ہے اجالا
عقیدت سے نور الہدیٰ ﷺ کہتے کہتے

دل مضطرب کو قرار آگیا ہے
شب و روز یا مجتبیٰ ﷺ کہتے کہتے

مصیبت کے ماروں کٹھن منزلوں سے
گزر جاؤ یا مصطفیٰ ﷺ کہتے کہتے

کٹے کاش اقبال اب عمر ساری
فقط نعت خیر الوریٰ ﷺ کہتے کہتے

اقبال عظیم

آنگن کی چڑیاں

ارم آصف

سوال:۔کیا آپ کے گھر میں صنفی امتیاز برتا جاتا تھا اور آپ اس پر احتجاج کرتی تھیں؟

جواب:۔ ہمارے گھر میں بیٹا یا بیٹی میں فرق نہیں برتا جاتا، بیٹیاں تو اللہ پاک کی رحمت ہوتی ہیں۔ ہمارے گھر میں تو نہیں البتہ ہمارے خاندان میں برتا جاتا ہے فرق اور اگر ہمیں ایسا محسوس ہو کہ بیٹا یا بیٹی میں فرق کیا جارہا ہے تو میرے خیال میں میں ضرور احتجاج کروں گی۔

سوال:۔ اکثر گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھا جاتا ہے آپ کا کیا تجربہ ہے؟

جواب:۔ میں نے اکثر گھرانوں میں دیکھا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ پڑھ کر کرنا تو چولہا ہانڈی ہی ہے تو پھر پڑھنے کا کیا فائدہ، بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشی حالات اتنے خراب ہوتے ہیں کہ والدین چاہ کر بھی بیٹیوں کو تعلیم نہیں دلوا سکتے اور جہاں تک میری بات ہے میں اپنے خاندان کی واحد لڑکی ہوں جس نے تعلیم حاصل کی جب میرے بابا جانی میرا اسکول داخلہ کرانے گئے تو میرے چچاؤں اور دادا نے سخت مخالفت کی کہ تم بیٹی کو کیوں اسکول داخل کرا رہے ہو لیکن میرے بابا اور امی جان نے مخالفت کے باوجود ہمیں پڑھایا اور مجھے خوشی ہے کہ ہماری دیکھا دیکھی اور بھی ہمارے خاندان کی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں۔لڑکیوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملنا چاہیے کیونکہ اگر ماں پڑھی لکھی اور باشعور ہو تو اگلی نسلیں بھی سنور سکتی ہیں۔

سوال:۔آپ کے نزدیک علم حاصل کرنے کا کیا مقصد ہے؟

جواب:۔میرے نزدیک علم حاصل کرنے کا مقصد اپنی شخصیت کو سنوارنا ہے کیونکہ تعلیم ہی ہمیں اچھے اور برے کی تمیز سکھاتی ہے اور تعلیم ہی ایک انسان کو اچھا انسان بناتی ہے اچھے گھرانے میں شادی تو ظاہر ہے اگر آپ اچھے انسان ہیں تو اچھے گھرانے میں شادی بھی ہوجائے گی اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ہنر بھی سیکھنا چاہیے۔

سوال:۔کیا آپ ملازمت کرنے والی خواتین کے حق میں ہیں؟

جواب:۔بالکل بھی نہیں کیونکہ کمانا تو مردوں کی ذمہ داری ہوتی ہے اور گھر سنبھالنا خواتین کا کام اور اگر خواتین کے پاس ہنر ہو تو وہ گھر بیٹھے ہی اپنا کما سکتی ہیں عزت کے ساتھ اور جہاں پر خواتین کی عزت کی جاتی ہو وہاں پر میرے خیال میں ملازمت کرنا صحیح ہے۔

سوال:۔آپ کے خیال میں روشن خیالی اور لبرل ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب:۔میرے خیال میں روشن خیال ہونا بری بات نہیں ہے لیکن حد سے زیادہ روشن خیال اور لبرل ہونا بری بات ہے ہمیں اپنے دائرے حدود میں رہنا چاہیے سب کی عزت کریں اور جو کام ہمارے پیارے دین اسلام نے

ممنوع قرار دیے ہیں ان سے ہمیں دور رہنا چاہیے۔

سوال:۔ اپنی مذہبی اور ثقافتی روایات سے آگاہی ہونے پر کیا ان کی پیروی کرتی ہیں؟

جواب:۔ جی بالکل میں اپنی مذہبی و ثقافتی اقدار سے آگاہ ہوں اور پیروی بھی کرتی ہوں اور کرنی بھی چاہیے۔

سوال:۔ کیا لڑکیوں کو خواب پورے کرنے کا موقع ملنا چاہیے؟

جواب:۔ جی ہاں اگر خواب جائز ہوں تو پورے کرنے کا موقع بھی ملنا چاہیے کیونکہ لڑکیاں بہت زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ ان کے معصوم سے خواب پورے کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔

سوال:۔ زندگی گزارنے کے لیے کیا اہداف مقرر کیے ہیں؟

جواب:۔ کوئی بھی اہداف مقرر نہیں کیے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو قسمت میں لکھا ہے وہی بہتر ہوگا ان شاء اللہ ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ کب ہمارا سانس رک جائے۔

سوال:۔ کس رشتے سے سب سے زیادہ محبت ہے؟

جواب:۔ مجھے خود سے وابستہ سب سے محبت ہے پہلے نمبر پر اللہ پاک سے بہت زیادہ محبت ہے اور ہمارے نبی حضرت محمد ﷺ سے بھی بہت زیادہ محبت ہے والدین، بہن بھائی دوست پاکستان آنچل و حجاب سے محبت ہے لیکن سب سے خوب صورت رشتہ ماں کا ہے وہ ہستی ہے جس کے قدموں تلے اللہ پاک نے جنت رکھ دی ہے۔

سوال:۔ سسرال سے کیا توقعات وخدشات ہیں؟

جواب:۔ اگر آپ خود اچھے ہیں تو سب اچھے ہیں اور اگر آپ کسی کو عزت دیں گے تو وہ بھی آپ کو عزت دے گا۔ بس ان میں انسانیت باقی ہو اور بہو کو بہو نہیں اپنی بیٹی سمجھیں ویسے میں ابھی سسرال نامی رشتے سے دور ہوں ہاہاہا۔

سوال:۔ گھر کے کام میں کتنی دلچسپی لیتی ہیں؟

جواب:۔ دلچسپی ہو یا نا ہو گھر کے کام تو کرنا ہی ہوتے ہیں ناں جب میرا کام کرنے کو دل کرتا ہے تو جلدی جلدی سے کام کر لیتی ہوں اور اگر دل نہ ہو تو سستی سے کرتی ہوں چھوٹی بہنیں بھی ساتھ کام کراتی ہیں اور امی جان کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اکثر اس لیے سارے کام مجھے ہی کرنا پڑتے ہیں پہلے دلچسپی نہیں لیتی تھی مگر اب لیتی ہوں کیونکہ امی نے گھر کا سارا کام ہم پر ڈال دیا ہے کہ آپ سیکھو گی تو کل آگے کام آئے گا ناں۔

سوال:۔ کیسے لوگوں سے دوستی کرتی ہیں؟

جواب:۔ جو دل کو اچھا لگے ان سے دوستی کرتی ہوں جو میرے آنچل و حجاب فرینڈز ہیں وہ سب مجھے بہت اچھی لگتی ہیں میں جن سے دوستی کرتی ہوں ان کو بھولتی نہیں ہوں اور نا ہی انہیں چھوڑتی ہوں جو خود چھوڑنا چاہیں تو میں ان سے دس قدم آگے ہوتی ہوں، ہاہاہا۔

سوال:۔ آپ ڈائجسٹ کیوں پڑھتی ہیں؟

جواب:۔ پہلے تو ایسے ہی پڑھ لیا کرتی تھی لیکن اب میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے بہت زیادہ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ میری آنچل اور حجاب کے لیے

محبت بڑھتی جارہی ہےاور جوبھی ڈائجسٹ ملےوہ پڑھ لیتی ہوں۔ زمانے کی اونچ نیچ ہمیں ماں کے بعد یہی تو سکھاتے ہیں رسالے پڑھنا مجھے بہت زیادہ اچھا لگتا ہے۔

سوال:۔کوئی یادگارشرارت؟

جواب:۔ ہاہاہا، جی میں بچپن میں بہت شرارتی تھی اسکول لائف میں بھی بہت شرارتیں کی یہ اس وقت کی بات ہے جب میں سات سال کی تھی میں اور میرا بھائی مزمل ہم دونوں سپارہ پڑھنے کے لیے جاتے تھے راستے میں آم کا باغ تھا گرمیوں کا موسم تھا ایک دن ہم جارہے تھے دونوں بہن بھائی کچے آم دیکھ کر منہ میں پانی بھرآیا (فی الحال تو وہی پانی پی کر پیاس بجھائی) ہاہاہاہا۔ باغ والے انکل نے ٹیوب ویل چلاکر زمینوں کو پانی لگار کھا تھا۔وہ کسی کام سے گھر گئے تو میں نے مزمل کو نیچے بٹھایا اور خود اس کے کاندھوں پر چڑھ کر آم توڑنے لگی ہو ہوا کہ اسی وقت باغ والے انکل بھی آ گئے مزمل بھاگنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور میں زمین بوس ہوگئی جلدی سے اٹھی اور دونوں بہن بھائی بھاگنے لگے ہم آگے آگے اور انکل ہمارے پیچھے ہاہاہاہا۔ انکل تو تھوڑا بھاگ کر رک گئے لیکن ہمیں تب پتا چلا کہ ہمارے پیچھے تو کوئی نہیں ہے جب سپارہ پڑھانے والی باجی کے گھر کے قریب آ گئے ہاہاہا اور یہ تب کی بات ہے جب میں چھٹی کلاس میں تھی ٹماٹر چننے کا موسم تھا ساتھ والے ہمسائیوں نے ٹوکرا بھر کے ٹماٹر دیے تھے امی سے کہا کہ مجھے دو تین ٹماٹر دے دیں (مجھے ٹماٹر بہت اچھے لگتے ہیں پلیٹ میں کاٹ کر اوپر نمک ڈال کر کھانا مزہ آتا ہے) امی نے کہا کہ نہیں ہیں ٹماٹر ہیضہ ہوجائے گا اس وقت تو چپ کرگئی لیکن میں نے رات کو اٹھ کر تقریباً چھ سات بڑے بڑے ٹماٹر کھا گئی لیکن جو صبح میری حالت ہوئی آپ خود سوچیں ہاہاہا کچھ زیادہ نہیں ہوگیا۔

سوال:۔کس شخصیت یا واقعے نے اثر ڈالا؟

جواب:۔ بہت سارے واقعات ایسے ہیں جس نے مثبت اثر کیا اور منفی بھی۔ اب اگر لکھنے بیٹھوں تو صفحات کم ہوجائیں گے بس چند ایک کا نام لکھ رہی ہوں شخصیات میں سے۔ حضرت محمد ﷺ، قائداعظم محمد علی جناح، قیصرآرا آنی اور بھی بہت سی شخصیات ہیں جن سے میں بہت متاثر ہوں اس کے علاوہ آنچل وحجاب کے تمام ممبران کے لیے بہت ساری دعائیں کہ ان کی انتھک کوششوں اور محنت کے بعد ہمیں آنچل اور حجاب جیسے ڈائجسٹ پڑھنے کو ملتے ہیں اگر کوئی بات بری لگی ہو تو معاف کر دینا دوستوں اللہ پاک آپ سب کو خوش رکھے۔

سمندر کی طرح ہے ہماری پہچان
اوپر سے خاموش اندر سے طوفان

حصہ دو

ایک بار پھر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا، حقیقت کا ادراک ہوتے ہی اس کو ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی تھی، اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے، چیخنا چلانا چاہا اور اٹھنے کی کوششوں کی ناکامی نے اسے نڈھال کردیا تھا۔ اگلے پل سب یاد آجانے پر گھبراہٹ کا شدید حملہ ہوا اور اس نے ایمرجنسی گھنٹی بجائی اور ڈاکٹروں کے ساتھ پورا عملہ دوڑتا ہوا وارڈ میں داخل ہوا لیکن وہ ایک بار پھر ہوش کھو بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر جو اس کو وارڈ میں شفٹ کرنے کی تیاری میں تھے ایک بار پھر ایمرجنسی وارڈ میں ہی اس کا علاج کرنے لگا تھے۔

اچانک اور شدید گھبراہٹ اور تشویش کے زیر اثر اسے ایک بار پھر آکسیجن لگا دی گئی اور سسٹر جینی اس کے گھر اطلاع دینے کے لیے اس کی فائل میں لکھا فرحان کا نمبر ملانے لگی۔ اگلے پچیس منٹ میں فرحان، ایان اور امینہ پھر ہسپتال پہنچ گئے تھے اور بے حد پریشان اور فکر مند نظر آرہے تھے۔

"ڈاکٹر نے کیا کہا، پھر کیوں آکسیجن لگائی؟" امینہ نے پریشان حال ادھر ادھر ٹہلتے ایان سے پوچھا۔

"اسے ہوش آنا شروع ہوگیا ہے تو ظاہر ہے اسے اب سب یاد آئے گا اور کوئی ایسا چھوٹا نا سمجھ بچہ تو نہیں کہ سمجھ نہ پائے کہ کیا ہوا ہے؟" ایان نے فکرمندی سے کہا۔

"ایان بھائی آپ ایسا کریں بھابی کو لے کر گھر چلے جائیں، وہاں بھی تو ضرورت ہے اور ابو کی حالت تو آپ کے سامنے ہی ہے تعزیت کے لیے آنے والوں کے پاس ہم میں سے کسی کو ہونا چاہیے۔" فرحان نے ایان سے کہا تو اس نے سوالیہ نظروں سے امینہ کو دیکھا۔

''ایک بار ڈاکٹر کچھ بتا دے پھر ہم چلتے ہیں۔'' ابینہ نے کہا تو ایان اور فرحان نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تینوں انتظار گاہ میں ایک بار پھر ڈاکٹر کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگے۔ سسٹر جینی ان کے پاس آئی۔

''وہ ٹھیک ہے، بس کچھ یاد کرنے کی کوشش میں زیادہ اسٹریس لے رہا ہے اس لیے اسے پھر سلا دیا گیا ہے۔'' سسٹر جینی نے ایان کو بتایا۔

''کیا اب وہ پھر ایمرجنسی میں ہی رہے گا؟'' ایان نے پوچھا۔

''نہیں۔ آٹھ گھنٹے کی آبزرویشن کے بعد دوبارہ وارڈ میں شفٹ کردیں گے۔'' سسٹر جینی نے مسکرا کر انہیں تسلی دی اور دوبارہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

''ایان بھائی آپ بھابی کو لے کر چلے جائیں۔ میں ابھی ادھر ہی ہوں۔'' فرحان نے ایان اور ابینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرے خیال میں تو تمہارے رکنے کا بھی کوئی مقصد نہیں، ریان سو گیا ہے تو تم یہاں کیا کرو گے؟'' ابینہ نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں فرحان تم بھی چلو فریش ہو کر کچھ کھا پی لینا پھر دوبارہ وزٹنگ ٹائم میں آجائیں گے۔'' ایان نے ابینہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے فرحان سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

''کیا سوچنے لگے ہو؟ اگر خدانخواستہ کوئی بات ہوئی تو یہ لوگ بلالیں گے۔'' ایان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو فرحان اس کے گلے لگ کر رونے لگا۔

ابینہ بھی آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی یقیناً اس گھرانے کو کسی کی نظر لگ گئی تھی، ارمان نے ساری ذمہ داریاں اٹھا رکھی تھی، ریان سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے زیادہ من مانیاں کیا کرتا تھا، ایان اور فرحان کو کبھی کوئی پریشانی ہوئی ہی نہیں تھی۔ ارمان اور ریان کی دوستی زیادہ تھی اسی لیے ارمان ہر کام میں ریان کو اپنے ساتھ رکھتا تھا لیکن اب ساری ذمہ داریاں ایان اور فرحان کے کندھوں پر آ گئی تھیں اور انہیں سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کون گھر میں رہے اور کس کو ہسپتال رہنا چاہیے۔ ابینہ نے دونوں کو الگ کرتے ہوئے ہسپتال سے چلنے کا کہا۔ بے دلی اور بے حساب بیزاری لیے وہ تینوں ہسپتال سے باہر نکل گئے تھے۔

❁ ❁ ❁

مہمانوں کی آمدورفت اور گہما گہمی کے ساتھ تیز میوزک کی ڈھم ڈھم کے باعث کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، چہل پہل اور عورتوں کی چمک دمک کے ساتھ بچوں کے رونے اور بھوک سے چلانے کی آوازیں ہر طرف ایک ہنگامہ برپا ہوا معلوم ہو رہا تھا، ایک طرف نہایت خوب صورتی سے بنا مہندی کے اسٹیج پر گلاب کی کلیوں سے سجے جھولے پر نک سک سے تیار ہوئی ماہ نور اپنے کزن شایان کے ہمراہ زندگی کے نئے سفر کی شروعات کے حسین لمحات کے ہر ایک پل سے خوشیاں کشید کررہی تھی، اسٹیج کے سامنے نیچے دری بچھائی گئی تھی اور ڈھولکی کی تھاپ پر ایک طرف لڑکی والے اور دوسری طرف لڑکے والے ایڑی چوٹی کے زور پر ایک دوسرے کو ہرانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مہمان کرسیوں پر بیٹھے گلابی چائے کے کپ ہاتھ میں اٹھائے مہندی کے فنکشن سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے تھے۔

بلیک ستاروں والے لہنگے کے ساتھ، گہرے سرخ رنگ کی شرٹ اور گوٹے والے سرخ دوپٹے کو شانوں پر نفاست سے پھیلائے، تقریب کی مناسبت سے میک اپ اور رول کیے بالوں کے ساتھ ہر طرف کے انتظامات سنبھالتی وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی، کبھی مہمانوں کی آؤ بھگت میں جت جاتی کبھی مصروفیت کے ساتھ ساتھ دونوں ہاتھوں کو بلند کرکے تالیاں بجا کر دونوں ٹیموں کا ساتھ دیتی، دوسرے بہت سے چھوٹے موٹے کاموں کو نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ ڈھولکی بجاتے ٹولے میں بھی چلتے پھرتے اپنے مشوروں اور چٹکلوں سے بھرپور شرکت کررہی تھی۔

''ان کاموں کو بس کرو اور سب کے ساتھ بیٹھو۔'' کرسی

پر بیٹھی کسی عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بہت محبت سے اس سے کہا۔
''بس آنٹی ابھی میں بھی ان میں شامل ہونے ہی لگی ہوں۔ دیکھا آپ نے میرے بغیر ان کی محفل نہیں جم رہی۔'' اس نے کھلکھلاتی ہنسی کے ساتھ دونوں طرف کے اناڑی کھلاڑیوں کو دیکھ کر شوخی سے کالر جھاڑا تھا۔
''یہ بے ایمانی ہے منتہا۔ تم ہماری ٹیم میں ہو۔'' ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے دور سے ہی اپنے لیے جگہ ڈھونڈنے لگی اور پھر لڑکے والوں کی ٹیم کی طرف بڑھی تو سلمٰی نے شور مچا دیا۔ منتہا نے ہنستے ہوئے اسے دیکھا اور ان کی طرف بڑھنے لگی تو بلال جو سب سے آگے بیٹھا لڑکوں کو گائیڈ کررہا تھا اس نے احتجاج بلند کیا۔ کمال پھرتی سے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور دونوں بازو پھیلائے اس کا راستہ روک لیا۔
''اب آپ تو کہیں نہیں جاسکتیں۔'' بلال کے استحقاق بھرے لہجے پر اس نے حیرانی سے اس کو دیکھا تھا۔
''کیوں نہیں جاسکتی؟'' بلال کے پھیلے بازوؤں کو گھورتے ہوئے وہ تنک مزاجی سے بولی۔
''جس کے قدم ایک دفعہ ہماری طرف بڑھ جاتے ہیں پھر ہم ان کو پلٹنے نہیں دیتے۔'' بلال نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ نجانے کب سے منتہا کو دیکھتے ہوئے اس پر فدا ہو چکا تھا۔
''میں اپنی مرضی کی خود مالک ہوں۔'' منتہا نے سر اٹھا کر کہا۔ بلال نے سرتاپیر اس کے سجے ہوئے سراپے کو ایک گہری نظروں سے دیکھا۔
''ضرور ہوں گی لیکن جو ایک دفعہ ہماری طرف آجاتا ہے ہم اسے کہیں جانے نہیں دیتے۔'' بلال نے سب کو اپنی ہاں میں ہاں ملانے کا اشارہ کیا تو پیچھے سے سب 'منتہا..... منتہا' کی تکرار پر اس نے حیرانی سے سب کو دیکھا۔
''کبھی کسی دوسرے کی مرضی کو بھی اہمیت دینی پڑتی ہے مس منتہا۔'' بلال نے مدھم آواز میں کہا۔
''میں مرضی کی اہمیت سے انکار نہیں کرتی، لیکن زبردستی دوسرے کی مرضی کو اپنے اوپر مسلط کرلینے کو میں کبھی بھی عقل مندی نہیں سمجھتی۔ اس لیے آپ میرا راستہ چھوڑیں اور مقابلے کی تیاری اپنے بل بوتے پر کریں۔'' منتہا نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا تو سب نے مل کر نعرے لگائے تو مجبوراً شرمندگی سے بچنے کے لیے بلال کو واپس اپنی ٹیم کی طرف بڑھنا پڑا۔ منتہا بھی ہنستی ہوئی لڑکیوں کی ٹیم میں شامل ہوگئی۔ اس دوران منتہا نے محسوس کیا کہ بلال کی نظریں گاہے بگاہے اس پر جم رہی ہیں، اس کی ساری شوخی منتہا کی طرف منتقل ہوچکی تھی۔ منتہا مسلسل نظر انداز کررہی تھی۔ جب بلال کی نظریں اسے ناگوار گزرنے لگیں تو وہ وہاں سے اٹھ گئی۔
''آپ بہت مغرور ہیں۔'' بلال بہانے سے وہاں سے اٹھ کر منتہا کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔
''کسی کے پاس کچھ ہوتا ہے تو ہی وہ مغرور ہوتا ہے، آپ کس بات پر غرور کریں؟ نہ تو تمیز ہے نہ کوئی مینرز۔'' منتہا نے اس کے خود پر ٹکٹکی باندھنے پر طنز کیا۔
''تو آپ میری ہوکر مجھے بھی مغرور ہونے کا موقع دے دو۔'' بلال نے بے تکلفی کی انتہا کردی۔ منتہا نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔
''آپ کو تو واقعی تمیز نہیں ہے۔'' منتہا نے وہاں سے اٹھنے میں پیش قدمی کی۔
''مس منتہا۔'' بلال کے پکارنے پر اس کے بڑھتے قدم رکے تھے۔ وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے وہ اسے دیکھ رہا تھا۔
''آئی ایم سوری...... اگر آپ نے میری بے تکلفی کا برا منایا ہے۔'' کچھ دیر پہلے کی نسبت اب اس کا لہجہ خاصا معتبر تھا، منتہا کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔
''اِٹس اوکے لیکن آئندہ احتیاط کیجیے گا۔'' منتہا کے لیے اس کی معذرت کی کوئی اہمیت نہیں تھی بے نیازی سے بولی اور وہاں سے جانے لگی۔
''کیا ہم دوست بن سکتے ہیں؟'' اس کی پکار اور اس

کے الفاظ، منتہا کو انتہائی ناگوار گزرے۔

''جس بات پر ابھی ابھی آپ نے سوری کہا ہے پھر وہی بات دہرا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ کی معذرت محض الفاظ اور یہاں کھڑے ہونے کا بہانا تھا۔'' منتہا نے اسے دیکھتے ہوئے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں واقعی شرمندہ ہوں کہ میں نے معمولی جان پہچان کی بنیاد پر بہت بے تکلفی کا مظاہرہ کردیا لیکن اب میں......''

''میں آپ سے دوستی نہیں کرسکتی اور آئندہ آپ مجھ سے کسی قسم کی بے تکلفی کی کوشش نہیں کریں گے۔'' اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی منتہا اس کی بات کاٹ کر بے حد دوٹوک اور ترش لہجے میں کہہ کر اس کا جواب سنے بغیر وہاں سے چلی گئی۔ جبکہ بلال ہکا بکا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

''عجیب بد دماغ لڑکی ہے۔'' وہ بڑبڑایا اور وہاں سے چلا گیا۔

دھیرے دھیرے تقریب اختتام پذیر ہونے لگی تھی، دوسرے دن سادگی سے نکاح کے بعد ولیمہ کا ایک بڑا فنکشن تھا جس کی تیاری میں سب لڑکیاں رات گئے تک مصروف رہیں۔

''منتہا تمہیں بلال بھائی کیا کہہ رہے تھے؟'' ساری لڑکیاں ایک ہی کمرے میں دوسرے دن کے لیے اپنے اپنے کپڑے ہینگرز کے ساتھ لگا کر باقی چیزیں سیٹ کرنے میں لگی تھیں کہ سلمٰی نے آہستگی سے منتہا سے پوچھا۔

''کون بلال بھائی؟'' اپنے سوٹ کے ساتھ میچنگ چوڑیاں اور ائیر رنگ دیکھتے ہوئے منتہا نے لاپروائی سے پوچھا۔

''بلال بھائی جو شام کو تمہارے ساتھ کھڑے تھے۔'' سلمٰی نے اس کے انداز کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ اچھا وہ بلال بھائی ہیں۔ شایان بھائی کے کزن جو امریکہ سے آئے ہیں؟'' منتہا نے تصدیق کی تو سلمٰی نے اثبات میں سر ہلایا۔

''معاف کرنا سلمٰی باجی، بلال بھائی خاصے چھچھورے قسم کے بھائی ہیں۔ مجھے دوستی کی آفر کررہے تھے۔'' منتہا نے ناک بھوں چڑھا کر بدمزہ منہ بنا کر کہا تو سلمٰی کا قہقہہ بلند ہوا۔

''ہاں اس نے صرف تمہاری من موہنی صورت دیکھی ہوگی جانتا نہیں کہ تم کتنی بڑی شیرنی ہو۔'' سلمٰی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سلمٰی باجی خوب صورت لڑکیوں کو شیرنی بن کر ہی رہنا چاہیے ورنہ گلی محلے کے نکڑ پر تاک میں بیٹھے آوارہ عاشق کب خوابوں کو روندتے ہوئے نکل جائیں پتا بھی نہیں چلتا۔'' منتہا کی ادائے بے نیازی پر سلمٰی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''بلال بھائی آوارہ نہیں۔ اچھے خاصے معتبر اور پڑھے لکھے شخص ہیں۔'' سلمٰی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کردار کا سرٹیفکیٹ کسی کے ماتھے پر نہیں درج ہوتا، عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ کون کتنا شرافت کا علمبردار ہے اور کون کتنا آوارہ۔'' منتہا کے رویے میں کسی قسم کی کوئی لچک نہ دیکھتے ہوئے سلمٰی نے سر جھٹک کر مزید بحث نہ کی جانتی تھی کہ بلال کا پہلا تاثر غلط پڑ چکا تھا اور اب کوئی دلیل اس کی رائے نہیں بدل سکتی ہے۔

کل صبح نکاح اور شام میں ولیمہ کے لیے ساری تیاری مکمل کرکے اب سب کچھ دیر آرام کی غرض سے سب لائٹس آف کرکے سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں۔

❁......❁......❁

۱۵ مارچ ۲۰۱۰ء

تمہیں پتا ہے سوما کچھ لمحے ایسی چاشنی لے کر ہماری زندگی کا حصہ بنتے ہیں کہ ان کی مٹھاس دل کے اندر تک اتر جاتی ہے، وہ لمحے ایسے دلکش ہوتے ہیں کہ ان کا ہر ایک پل ذہن میں جذب ہوجاتا ہے، وہ جادوئی لمحے ہمارے دل کو ایسے احساس سے روشناس کراتے ہیں جن سے ہم مکمل انجان ہوتے ہیں، ہم سمجھ نہیں پاتے اور ہم ان کے حصار میں قید ہونے لگتے ہیں، ہم جان نہیں پاتے اور وہ پل ہم

سے ہمارا اپنا آپ چھین لیتے ہیں، ہم ان لمحوں کو جینا شروع کر دیتے ہیں، تمہارے ساتھ چاند کی رفاقت میں گزرے وہ لمحے میری زندگی کے بہت اہم پل تھے، یوں سمجھو سو مادہ لمحے میری زندگی کا حاصل تھے، ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی یہ احساس کس قدر حاوی تھا کہ تم میرے پاس ہو، چودھویں کے چاند کی وہ تیز روشنی اور سرد ٹھٹھرتی رات نے مجھے اس محبت کا احساس دلایا تھا جو میں نے پہلے کبھی نہیں محسوس کی، تمہارے ساتھ نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ جنوری کی آخری تاریخوں کی ٹھنڈ میری دھڑکنوں کو منجمد کر سکتی ہے، یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ محض ایک شال لپیٹے تم اپنے گارڈن میں ان سرد ہواؤں کی زد میں ہو جو اگر رگ و پے میں اتر جائیں تو بہت نقصان دے ہو سکتی ہیں۔ مجھے کوئی پرواہ نہیں تھی، نہ تمہارے بیمار ہونے کی نہ اپنی طبیعت کی ناسازی کا، احساس تھا تو بس یہ کہ کاش یہ لمحے کبھی نہ گزریں، یہ رات کبھی نہ کٹے، یہ چاند بس ایسے ہی جگمگاتا رہے۔ تم سوچ رہی ہو گی میں کس قدر نان سینس لڑکا ہوں لیکن تم شاید جانتی نہیں کہ وہ جو آسمان پر چمکتا چاند تھا جس کو اپنے اپنے ٹھکانے پر ہم دونوں نے ایک ساتھ دیکھا تھا وہ لمحے اپنی تمام تر بے وقوفی اور بچکانہ حرکت کے باوجود میرے دل میں اسی آب و تاب کے ساتھ براجمان ہیں، ان لمحوں نے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ اپنی پریشانیاں تم سے کہتے کہتے، تمہارے تمام سبق سنتے سنتے میرا دل تمہارے ساتھ کی خواہش کرنے لگا تھا۔ اتنے دن گزرنے کے باوجود میں آج بھی ان لمحوں کو جیتا ہوں۔

کافی دنوں سے تم نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ تم ٹھیک تو ہو؟ کہاں مصروف ہو گئی ہو؟ اور ایسی بھی کیا مصروفیت کہ یہ بھی نہ سوچا کہ میں انتظار کر رہا ہوں گا؟

اپنا خیال رکھنا

اللہ حافظ۔

۞......۞......۞

۱۶ مارچ ۲۰۱۰ء

میں نے اتنا پاگل اور سر پھرا بندا اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھا۔ اففف ایک عام سی بات کو اتنا خاص بنا دیا اور محبت؟ کیا واقعی یہ وہ لمحات تھے جن میں محبت کا ادراک ہوتا ہے؟ اور دیکھو میں کتنی کند ذہن ہوں بقول تمہارے اس ”بے وقوفی اور بچکانہ حرکت“ کو ایک فلمی سچوئشن سمجھ کر سر انجام دے دیا۔ (فلک شگاف قہقہہ) نہیں میں یہ نہیں سوچ رہی ہوں کہ تم کس قدر نان سینس لڑکے ہو اب چار سال کی دوستی میں اتنا تو اندازہ ہو ہی گیا تھا اب دوبارہ وہی بات کیا سوچنا۔

اچھا تمہیں ایک بات بتاؤں؟ زندگی میں پہلی بار مجھے ایسے لگا تھا جیسے وہ چاندنی کچھ کہہ رہی ہے۔ پہلی بار محسوس ہوا کہ کسی کے ساتھ کا احساس جنوری کی سردی کو بھی محسوس کرنے کی سکت چھین لیتا ہے۔ اچھی خاصی اداسی شیئر کرتے کرتے تم کبھی کبھی ایسی باتیں کہنے لگتے ہو کہ مجھے سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ میں تمہیں کیا جواب دوں۔

محبت کا ادراک ایسے چٹکیوں میں کہاں ہوتا ہے میرے پیارے دوست؟ یہ سفر تو بہت کٹھن ہے۔ محبت میں کبھی دکھ کا احساس ہوتا ہے تو کبھی اداسی ڈیرے جما لیتی ہے۔ کبھی لگتا ہے ساری دنیا حسین ہے، کبھی چاندنی رات میں چاند کی فسوں خیز خاموشی کسی کے دل کی دھک دھک کی آواز سناتی ہے تو کبھی یوں لگتا ہے چہار سو آندھیاں چل رہی ہیں اور میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں، چاہے تم اداس ہو یا خوش، سورج کی تپش میں ہو یا چاند کی ٹھنڈک میں اور ویسے بھی لوگ کہتے ہیں سو ما میں اور چاند میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ (ہاہاہا)

میں دراصل گھر سے باہر تھی اس لیے تمہاری ای میل کا جواب دیر سے دے رہی ہوں، دراصل آج میرا جاب انٹرویو تھا اور مجھے بھی جاب مل گئی ہے۔ تو بس اسی لیے تھوڑی مصروف رہی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ تمہیں بھول گئی۔ بس موقع نہیں مل سکا کہ تمہاری خیریت پوچھ سکتی۔

تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ جلدی بات کرتے ہیں۔

اللہ حافظ

تمہاری دوست جان سوما

❁......❁......❁

۲۲ مارچ ۲۰۱۰ء

میری دوست جان سوما

اچھی خاصی اداسی؟ اداسی کب اچھی خاصی ہوتی ہے، اداسی تو روح میں ایسے شگاف بنا دیتی ہے کہ نہ انسان خوش ہوسکتا ہے نہ مطمئن۔

تمہیں جاب مل گئی بہت مبارک ہو اب ہم مل کر کمیٹی ڈال سکتے ہیں۔ (ہاہاہا) کیا خیال ہے پھر؟

تم ہر موسم میں میرے ساتھ ہو۔ اس یقین کے سوا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ چاندنی یہی تو کہہ رہی تھی کہ تمہارا ساتھ میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ یہی تو بتا رہی تھی کہ سفر کٹھن ہو یا اداسی کا پہرہ ہو، دکھ کا احساس ہو یا چہار سو آندھیاں چل رہی ہوں یہ محبت ہمیشہ ایسی ہی نرم چاندنی کی طرح ہمارے سنگ رہے گی بس تم ساتھ نبھانا۔

مجھے ابھی جاب کے لیے جانا ہے۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ پھر بات کرتے ہیں۔

اللہ حافظ۔

❁......❁......❁

پندرہ منٹ کا راستہ بے حد خاموشی سے گزرا تھا۔ ایان، امینہ اور فرحان کے ساتھ گھر پہنچ چکا تھا جہاں کچھ مہمان تعزیت کے لیے ان کے منتظر تھے، امینہ، سلیمہ بیگم کی طرف بڑھی جہاں بہت سی عورتوں کے درمیان وہ آنسو کو پونچھتی خاموشی سی بیٹھی تھیں اور فوزیہ ان کے پاس بیٹھی انہیں تسلیاں دے رہی تھی، ایان اور فرحان، مختیار کے پاس دوسرے کمرے میں بیٹھے مردوں میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔ امینہ کمرے میں داخل ہوئی تو سلیمہ بیگم نے اسے دیکھتے ہی منہ دوسری طرف کرلیا، وہاں بیٹھی عورتوں نے اس سے تعزیت کی اور امینہ اپنے آنسو پونچھتی فوزیہ اور سلیمہ بیگم کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''کیسی طبیعت ہے خالہ؟'' امینہ نے سلیمہ بیگم سے پوچھا۔

''بھائی ریان کیسا ہے؟'' سلیمہ بیگم نے کوئی جواب نہ دیا تو فوزیہ نے اس سے ریان کے بارے میں پوچھا۔

''اسے ہوش آرہا ہے لیکن اب بھی بہت تکلیف میں ہے۔'' امینہ نے سلیمہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کی تکلیف تو کچھ دنوں میں دور ہو جائے گی۔ ہائے میرا ارمان...... اسے کیسے ہوش آئے گا؟'' سلیمہ بیگم نے آبدیدہ لہجے میں ارمان کو پکارا، فوزیہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں مزید رونے سے روکا۔

''میرا بچہ...... کہاں سے آئے گا؟ اس کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا۔'' سلیمہ بیگم رونے لگیں۔

''ممانی جان اللہ کو یہی منظور تھا، پلیز آپ حوصلہ رکھیں۔'' فوزیہ نے انہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

''ہائے کیسے حوصلہ کروں؟ کب سنتا ہے وہ میری؟ منع بھی کرتی تھی نہ چلاؤ گاڑی، نہ جاؤ ایسے۔'' سلیمہ بیگم کی باتیں امینہ کو تکلیف سے دوچار کر رہی تھیں۔

''کیا کیا خواب دیکھے تھے میرے ارمان نے اپنے آنے والے بچے کے لیے، کیسے منتوں میں اس کا گھر ہی ختم گیا۔ دو نہیں میرے ارمان کے گھر سے تین جنازے اٹھے ہیں اور تم کہہ رہی ہو حوصلہ کروں۔ میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے کیسے اپنے آپ کو سنبھالوں۔'' سلیمہ بیگم اب تیز آواز میں رونے لگی تھیں۔ ان کے آنسو دیکھتے ہوئے وہاں بیٹھیں عورتیں بھی رونے لگیں۔

''ماں کا دکھ کوئی کیسے سمجھ سکتا ہے، جس کا جوان جہان بیٹا اور بہو ہنستے مسکراتے گھر سے نکلیں اور ان کے جنازے سامنے آٹھہریں۔'' سلیمہ بیگم کا دکھ بیان سے باہر تھا۔

تھوڑی بہت ان بن اور معمولی جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں، مختیار فیملی بھی چند تلخیوں کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک یہ قیامت برپا ہوئی اور سب کچھ بہا کر لے گئی۔ سلیمہ بیگم نے جوان بیٹا اور ان کی خوشیوں میں اضافہ کرتی ان کے گھر کو بچے کی قلقاریوں سے نوازنے والی بہو کو کھو دیا تھا، اہل کی بچکانہ

عادتوں اور اس سے اختلاف کے باوجود سلیمہ بیگم اسے اہمیت دیتی تھی، ہر طرح کے صلح مشورے میں اس کو ساتھ رکھتی تھیں اور اب غم برداشت نہیں ہورہا تھا۔ سلیمہ بیگم کی آہ ازاریاں بڑھنے لگیں تو ابینہ وہاں سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''ابینہ بھابی۔'' ابینہ کمرے سے باہر نکلی اور ایک طرف کھڑی ہوکر رونے لگی تھی کہ فوزیہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''پلیز ابینہ بھابی آپ تو حوصلہ کریں۔'' فوزیہ نے گھگھیائی آواز میں کہا۔

''کیسے حوصلہ کروں؟ بہنوں جیسی جیٹھانی کھو دی، بھائیوں سے بڑھ کر خیال کرنے والا جیٹھ چل بسا اور ایک پیارا دیور جو سچا دوست اور بھائی ہے، جس کو زندگی اور موت کی کشمکش میں دیکھ کر آرہی ہوں۔'' ابینہ روتے ہوئے کہا۔

''بھابی پلیز اب آپ تو ایسی باتیں نہ کریں۔ آپ بھی جانتی ہیں کہ ممانی جان کو ارمان بھائی اور اہل بھابی سے کس قدر محبت تھی ان دونوں کی ایک ساتھ موت نے انہیں صدمہ میں مبتلا کردیا ہے۔'' فوزیہ آبدیدہ لہجے میں بولی۔

''ارمان بھائی اور اہل کے جانے کا دکھ خالہ جان کے اکیلے کا دکھ نہیں ہے فوزیہ۔ ہم سب نے انہیں کھویا ہے لیکن اب ریان کی حالت، دل بہت گھبرا رہا ہے فوزیہ کہ خدانخواستہ اس خبر سے اس پر کیسا اثر پڑے گا۔'' ابینہ حقیقتاً فکرمند تھی۔

''کچھ نہیں ہوگا بھابی، فرحان بتا رہے تھے کہ جب تک ریان کی حالت بہتر نہیں ہوجاتی اسے ارمان بھائی اور اہل بھابی کی ڈیتھ کی خبر نہیں دیں گے۔'' فوزیہ نے اسے تسلی دی۔

''وہ تو نہیں بتائے گا، لیکن کیا وہ پوچھے گا نہیں؟'' ابینہ، سلیمہ بیگم کے اس رویے سے بہت دلبرداشتہ ہورہی تھی۔

''آپ فکر نہ کریں بھابی۔ فرحان اور ایان بھائی سب سنبھال لیں گے۔'' ابینہ نے فوزیہ کی طرف دیکھا جو خلاف معمول اچھی خاصی سمجھداری کا مظاہرہ کررہی تھی، شاید وہ اہل کی جگہ لینے کی کوشش کررہی تھی، ورنہ آج سے پہلے تو اس نے ہمیشہ معاملے کو بگاڑا ہی تھا۔

''تم پلیز خالہ جان کا خیال رکھو اور کوشش کرنا کہ وہ کوئی بھی ایسی بات نہ کریں جو ہمارے گھر کی عزت پر انگلی اٹھائے۔ یہاں سے اٹھ کر عورتیں اپنے اپنے گھروں میں کیسی کیسی باتیں کرتی ہوں گی۔'' ابینہ نے فوزیہ کو کہا اور ایک طرف رکھے کھانے پینے کے سامان کو دیکھنے لگی کہ دور سے آئے مہمانوں کو کھانا بھی دینا تھا۔ کچھ رواج بہت دل دکھانے والے ہوتے ہیں، اپنوں کی ابدی جدائی پر دل خون کے آنسو رو رہا ہوتا ہے لیکن دنیا کے رواج اسی تسلسل سے چلتے رہتے ہیں، دکھ میں شریک ہونے والے دستر خوان پر بھی اپنی شرکت لازمی سمجھتے ہیں۔ ابینہ بھی آنسو پونچھتے ہوئے دنیا کی رسم کو نبھانے لگی تھی۔ فوزیہ واپس سلیمہ بیگم کے پاس چلی گئی اور ابینہ اس کے مثبت رویے کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

''اہل تمہاری یہ دیورانی کچھ چھاپے کٹنی قسم کی لگی مجھے تو۔'' ابینہ کی شریری سرگوشی پر اہل ایک دم اس نزدیک سرک کر بیٹھ گئی۔ ''تمہاری دیورانی نہیں...... ہماری دیورانی۔'' اہل کی تصیح پر ابینہ مسکرائی تھی۔

''اس گھر میں کچھ بھی تیرا میرا نہیں سب کچھ ہمارا ہے بڑی دیورانی صاحبہ۔'' اہل کی شوخ آواز کے ساتھ کھلکھلاتی ہنسی اس کی سماعت میں گونجی تو ابینہ نے ایک دم ادھر ادھر دیکھا تھا۔

اب ان شرارتوں کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کیسے اس ہنستے بستے گھر میں ویرانیاں اتر آئی تھیں، ابینہ نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے اور کھانا سرو کرنے کی تیاری کرنے لگی لیکن ہر ایک لمحہ اہل کی یاد اور شوخیاں اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو کی روانی میں اضافہ کرتے جارہے تھے۔

❁......❁......❁

منتہا سمیع، سمیع اللہ اور خدیجہ بیگم کی اکلوتی اولاد تھی، تین افراد پر مشتمل لندن میں رہائش پذیر یہ گھرانہ ایک اعلیٰ

زندگی گزار رہا تھا، چند دوست احباب اور رشتے دار بھی موجود تھے جس کی وجہ سے وقتاً فوقتاً ایک دعوت طعام کا انتظام کیا جاتا تھا تاکہ اگلی نسل جو یورپ میں پروان چڑھ رہی ہے اپنی ثقافت اور رشتوں کی قدر کو بخوبی سمجھ سکے، منتہا ایک بہت حساس اور نرم دل لڑکی تھی اور ان چند فیملیز میں کافی مشہور بھی تھی، خدیجہ بیگم لوکل کمیونٹی میں ایشین عورتوں کے لیے کافی کام سرانجام دے چکی تھیں، خود ایک ملنسار اور رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں اسی وجہ سے انہوں نے شروع سے ہی منتہا کی ایسی تربیت کی کہ کوئی بھی اس پر فخر کرسکتا تھا۔

والدین کی تربیت اور گھر کا ایسا ماحول جس میں قدریں بھی تھیں نے منتہا کو ایک مکمل انسان بنایا تھا، سانولی رنگت، تیکھے نین نقش کے ساتھ اخلاق کی اعلیٰ ترین مثال نے منتہا کو سب میں نمایاں کر رکھا تھا، لمبے بال، بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی دبیز تہہ اور ہلکی گلابی لپ اسٹک، خوب صورتی سے سر پر دوپٹا جمائے، جینز کے ساتھ لونگ شرٹ اس کا عام سا حلیہ مگر اس کے انداز بہت خوب صورت تھا کہ ہر کوئی اس پر رشک کرتا تھا، منتہا کوئی بہت خوب صورت لڑکی نہیں تھی لیکن خوب صورت نظر ضرور آتی تھی، ان دنوں ماہ نور جو سمیع اللہ کے دوست کی بیٹی اور منتہا کی بہترین دوست تھی کی شادی کی تیاری میں منتہا ہر ایک انتظام میں آگے آگے تھی، لندن میں مقیم بہت سے گھرانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

سلمٰی باجی منتہا کی کزن اور بہترین دوست تھیں جو زیادہ تر اس کے ساتھ رہتی تھیں، منتہا پروفیشنلی ڈریس ڈیزائنر تھی لیکن اسے سوشل ورکر بننے کا بھی بھوت سوار رہتا تھا، ہمہ وقت وہ دوسروں کی مشکلات میں بنا سوچے سمجھے کود جاتی تھی اور اپنے نایاب مشوروں سے نکال لایا کرتی تھی۔ ویسے کے فنکشن میں بھی منتہا نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، اگلے چند دنوں میں بہت سے دنوں کی مصروفیت کے بعد زندگی نارمل ہوئی تھی، ماہ نور شایان کے ساتھ ہنی مون پر جا چکی تھی، بلال نے بہت کوشش کی لیکن منتہا کو متاثر نہ کرسکا لیکن سلمٰی اور منتہا کے درمیان یہ بحث چھڑ چکی تھی۔

''سلمٰی باجی ایسے جتا کر کسی کو متاثر نہیں کیا جاتا، آپ سمجھیں اس بات کو۔'' منتہا ان دنوں اپنی بوتیک کی تیاریوں میں مصروف تھی، اس کے ساتھ ساتھ وہ ادھر ادھر کے بہت سے کام بھی سرانجام دے رہی تھی۔

''جتا کر متاثر کرنے کی کیا بات ہے؟ جب ایک انسان اچھا ہے بنا کسی حیل وحجت کے ایک شریفانہ انداز سے تمہیں اپروچ کر رہا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟'' سلمٰی نے ابرو اچکا کر اس سے پوچھا۔

''سلمٰی باجی میری زندگی میں فی الحال بہت کچھ ایسا ہے جو اس 'شریفانہ انداز کی اپروچ' سے زیادہ اہم ہے۔'' منتہا نے ایک برائیڈل ڈریس جو اس نے تیار کیا تھا اور اب اس کا فوٹو شوٹ کرانا تھا تاکہ وہ اپنے کام کی پبلسٹی کرا سکے، جو ایک انڈین برائیڈل میگزین کے لیے 'ٹائٹل کور' پر سلیکٹ ہونے کے لیے جانا تھا۔ سلمٰی نے برائیڈل ڈریس دیکھتے ہوئے نگاہوں ہی نگاہوں میں اسے داد دی۔ جس پر منتہا مسکرانے لگی۔

''میں جانتی ہوں تمہاری زندگی کے بہت سے مقصد ہیں لیکن میری جان ان بہت سے مقصد میں ایک ہمسفر کا مقصد بھی کسی کونے کھدرے میں رکھو۔'' سلمٰی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''سلمٰی باجی جب وقت آئے گا ناں تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو مجھے اس بوتیک کا نام روشن کرنا ہے اور اپنے شوق پورے کرنے ہیں۔'' منتہا نے اپنی پوری توجہ اپنے تیار کردہ ڈریسز کی طرف مبذول کی۔ سلمٰی اس کے ساتھ مل کر اوپن وارڈ روب میں کپڑوں کو ہینگرز پر لگانے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ کام کے ساتھ دونوں کی باتیں بھی جاری تھی۔

❁......❁......❁

کچھ ہی گھنٹے گزرے تو اس کی حالت ذرا سنبھلنے لگی تھی، ذہن ابھی تک دوائیوں کے زیر اثر غنودگی میں تھا، کھلی آنکھوں

سے وہ دیکھ رہا تھا لیکن ذہن اس قدر ماؤف تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس حادثے کے بعد کیا ہوا ہے۔ فرحان اور ایان کو دیکھ کر اسے یہ اندازہ تو ہونے لگا تھا کہ کچھ ایسا ہوا ہے جو بہت برا ہے لیکن جو ہوا تھا اس کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کی حالت اب اس قابل ہوچکی تھی کہ اسے وارڈ میں شفٹ کردیا جائے، اسے یہ بھی نہیں یاد تھا کہ کتنے دن گزر چکے ہیں، کب سے وہ یہاں ہے؟ جنرل وارڈ میں اپنے بستر پر اسے شفٹ کردیا گیا تھا اور ساتھ ہدایت کی گئی تھی کہ اس کو ذہن پر کوئی دباؤ نہیں ڈالنا مگر کچھ پل دستک دے رہے تھے۔

''ریان کے بچے صبر کرو میں بتاتی ہوں تمہیں۔'' وہ آنکھیں موندے پڑا تھا کہ تپے انداز میں چہکتی آواز پر زیر لب مسکرادیا۔

''لو کرلو گل...... ریان کے بچے کہاں سے آگئے؟ امل بجو پہلے پیارے دیور کی پیاری رانی تو لائیں۔'' وہ بھی شرارت سے گویا ہوا تھا۔

''یہ تم ان دنوں رانی صاحبہ کو کچھ زیادہ ہی نہیں یاد کررہے ہو؟'' کچن سے نمودار ہوتی امل نے ایک ہاتھ میں چمچہ اٹھائے دوسرے ہاتھ کو کمر پر رکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا تھا۔

''ان دنوں؟ نہیں ان دنوں نہیں میں تو بچپن سے ہی یاد کرتا آیا ہوں۔'' مسکراہٹ دباتے ہوئے ریان نے امل کو زچ کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

''تمہیں اب وہی آکر لگام ڈالے گی۔'' امل نے چمچہ لہراتے ہوئے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

''ہاں جیسے آپ نے ارمان بھائی کو ڈال دی...... لگام۔'' ریان بھی کہاں باز آنے والا تھا۔ فوراً بدلہ اتارا۔

''تم مجھ سے بات کیا کرو ارمان کو کیوں بیچ میں لاتے ہو۔'' امل نے کڑی نگاہوں سے اسے گھورا۔

''کیوں آپ اگر میری رانی کو درمیان میں لاسکتی ہیں تو میں آپ کے راجہ کو کیوں نہیں لاسکتا؟'' ریان، امل کو صحیح معنوں میں تنگ کرتا تھا۔

''باز آجاؤ ریان ورنہ خالہ جان کو بتادوں گی۔'' امل نے اسے دھمکی دی تو ریان ہنسنے لگا۔

''امل بجو یہ اپنی ساس کے ڈراوے مجھے مت دیا کرو۔'' امل نے اسے گھورا۔

''ہم بگڑے دل شہزادے ہیں اتنی آسانی سے نہیں قابو میں آنے والے۔'' ریان گنگنایا۔

''اچھا اب کچھ سدھر وگے۔ لڑکی والوں کو ذرا تو تسلی ہو اور ان کی بیٹی کسی سر پھرے کے ہاتھوں محفوظ ہے اور ان کی دعائیں قبول ہوں۔'' امل نے اس کی شوخیوں پر اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا تو وہ منہ لٹکا کر بیٹھ گیا۔

''ریان...... ریان......'' وہ ماضی کی خوشگوار یادوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ پکار پر اس کے حواس بحال ہونے لگے۔ اس کا کندھا ہلانے والے نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو ریان نے آنکھیں کھول دیں۔

''تم ٹھیک تو ہو؟'' فرحان کی گھبرائی آواز پر اس نے پلکیں جھپکائیں اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ وہ کہاں ہے۔

''ریان......'' اس نے کوئی جواب نہ دیا تو فرحان نے پھر پکارا۔

''ٹھیک ہوں۔ ارمان بھائی نہیں آئے؟'' ریان نے فرحان سے پوچھا۔

''ارمان بھائی کو بھی چوٹیں لگی ہیں...... وہ آئے تھے لیکن تم سو رہے تھے۔'' فرحان اس کے بیڈ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''زیادہ چوٹیں تو نہیں آئی ارمان بھائی کو؟'' ریان نے استفسار کیا تو فرحان نے بنا کچھ کہے نفی میں سر ہلایا۔

''اور امل بجو؟'' ریان نے امل کے بارے میں پوچھا۔

''وہ بھی ٹھیک ہیں، انہیں ڈسچارج کردیا ہے وہ گھر چلی گئی ہیں۔'' فرحان اس کی طرف دیکھے بغیر اسے بتا رہا تھا۔

''بجو مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئیں؟'' ریان نے فکر مند ہو کر کہا۔

''یار تمہیں تو پتا ہے ناں لڑکیوں کو ذرا سی چوٹ لگ

جائے تو کیسے چیختی چلاتی ہیں۔ وہ گھر چلی گئی ہیں اس لیے پھر نہیں آسکی۔ اب تم بھی جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ تا کہ ہم سب پھر سے اکٹھے ہوسکیں۔" فرحان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"سر درد کو آرام آجائے تو میں خود گھر جانا چاہتا ہوں یہاں بہت دل گھبراتا ہے۔ عجیب سے خوف ستاتے ہیں۔" ریان کی گھبراہٹ اس کے لہجے اور لفظوں کی بے چینی سے واضح تھی۔

"ہمت اور صبر سے اپنے آپ کو سنبھالو گے تو جلدی ٹھیک بھی ہو گے۔" فرحان اس کی بے چینی اور گھبراہٹ کی وجہ بخوبی جانتا تھا لیکن اس وقت اسے کچھ بھی بتانا اس کی حالت کو مزید خراب کرنا تھا، فرحان اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا، اگر ارمان اور امل کے بارے میں اس نے زیادہ کچھ پوچھا تو فرحان جانتا تھا کہ اس کا ضبط ٹوٹ جائے گا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت ریان کی ذہنی حالت ایسی نہیں کہ اسے ارمان اور امل کی ابدی جدائی کا صدمہ دیا جائے۔ فرحان اس کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا، کچھ دیر بعد ڈاکٹر کی آمد پر فرحان اس کے پاس سے اٹھا اور ڈاکٹر نے اس کا ایک بار پھر چیک اپ کیا، اس کی فائل پر ساری رپورٹ لکھی کچھ دوا کی تبدیلی کے بارے میں سسٹر جینی کو آگاہ کیا اور فرحان کو اس کی حالت کے بارے میں بتایا کہ کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں تھی، ریان کو سر پر شدید چوٹوں کے باعث کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، وہ بار بار سر درد کی شکائت کر رہا تھا، ڈاکٹر نے کہا کہ اسے مکمل ٹھیک ہونے میں وقت لگ سکتا ہے۔ فرحان نے ڈاکٹر کی ساری بات سنی اور بے فکر اور پریشانی لیے ریان کو ہسپتال میں چھوڑ کر گھر روانہ ہو گیا کیونکہ اب وزیٹنگ ٹائم بھی ختم ہو رہا تھا۔

❁......❁......❁

۱۹ اپریل ۲۰۱۰ء

میری دوست جان

کیسی ہو تم؟ اتنے دن ہو گئے ہیں تم نے کوئی ای میل نہیں بھیجی، میں بھی جاب کی وجہ سے ایسا مصروف ہوا ہوں کہ وقت کے ساتھ پہلے جیسے عیاشی نہیں رہی، ویسے تھوڑی بہت خیریت تو معلوم ہو جاتی ہے اس لیے بھی ای میل کے سلسلے میں تھوڑا وقفہ آ گیا ہے، آج میں جاب سے جلدی آ گیا ہوں، تمہارے آنے میں ابھی چند گھنٹے ہیں تو میں نے سوچا ایسے اکیلے بور ہونے سے بہتر ہے تم سے غائبانہ باتیں ہی کی جائیں، کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے نا کہ کہنے کو کوئی بات نہیں ہوتی لیکن جی چاہتا ہے، بہت سی باتیں کی جائیں، یوں ہی بے معنی سی، بلا مقصد سی، اور پھر جی چاہتا ہے کوئی ہماری ان لایعنی باتوں کو بہت غور سے سنے اور میں جانتا ہوں میری ان بے سرا پا باتوں کو تمہارے سوا کوئی سن سکتا ہے نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ کوئی دوسرا ایسا سر پھرا ہے، ہی نہیں نا میرے پاس۔ (ہاہاہا)

کیا واقعی ہی تمہیں یہ لگتا ہے کہ میں تمہاری کسی بات سے اداس ہو جاؤں گا؟ نہیں ایسا بالکل بھی نہیں ہے، میری زندگی میں اداسیوں کی کافی ساری فیکٹریز لگی ہوئی ہیں وہ چوبیس گھنٹے چلتی رہتی ہیں، کبھی رکتی نہیں ہیں، اس لیے اداسی کے لیے مجھے تمہاری کسی بات کی ضرورت نہیں۔ ہاں خوشی کے لیے مجھے تمہارے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری دوستی اب ایسی نہیں کہ ہر ایک بات کو الفاظ میں پرو دیا جائے، کچھ رشتے احساسات کی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان سمجھتے نہیں ہیں، تمہارے ساتھ بھی میرا ایسا ہی رشتہ بن چکا ہے سوما جس میں مجھے ہر وقت الفاظ کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تمہارا ساتھ محسوس ہو جاتا ہے، تم میرے لیے 'سوما' ہو، وہ روشنائی، جس نے مجھے اندھیروں سے نکالا ہے، وہ نور جس نے مجھے شدید ڈپریشن سے نجات دلائی ہے۔ مجھے ہمیشہ نظر انداز کیا گیا، میری کسی بات کو سنا نہیں گیا سوما، مجھے محبت کے لیے ترسایا گیا لیکن پچھلے کچھ سالوں سے میں نے اپنے اندر بہت تبدیلی محسوس کی ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ میں کوئی بہت نا سمجھ تھا جسے کوئی سمجھ بوجھ نہ تھی، ہاں لیکن مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ضرور تھی جو مجھے سمجھ سکے، میری بے مقصد پریشانیوں کو میرے ذہن سے نکالنے میں میری مدد کرے۔ مجھے یہ یقین کرنے میں میری مدد کر سکے کہ میں

اپنوں کے لیے اہم ہوں۔

تم جب یاد آتی ہو تو جی چاہتا ہے ایک لمبی مسافت ہم ساتھ قدم سے قدم ملا کر طے کریں اور وہ راستہ کبھی ختم نہ ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ کا یقین ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہارے سنگ سفر تو حسین ہوگا ہی مجھے منزل بھی جگمگاتی ہوئی ملے گی۔

خیر اب بہت ہوگئی تمہاری تعریف۔ زیادہ نہ پھولو۔

اپنا خیال رکھنا۔ پھر جلدی بات ہوتی ہے۔

اللہ حافظ

❁……❁……❁

۲۳ اپریل ۲۰۱۰ء

پیارے دوست

میں بالکل ٹھیک ہوں، لیکن تم سے بہت ناراض بھی ہوں، اتنے دن سے تمہاری ای میل میرا راستہ دیکھ رہی ہے، ہر روز ٹیکسٹ میسج کر رہے ہو لیکن تم نے مجھے بتایا بھی نہیں کہ تم نے ای میل سینڈ کی ہے، ویسے اگر بتا دیتے تو اتنی خوشی نہ ہوتی تمہارا مجھ سے غائبانہ باتیں کرنا مجھے بہت پسند آیا، ہاں جاب تو بہت اچھی ہے اور بہت مصروف بھی ہوگئی ہوں۔ میں اب زیادہ اچھی بچی بن گئی ہوں ناں…… جاب کے ساتھ ساتھ گھر کے کام بھی سیکھ رہی ہوں، تو کچھ وقت اب گھر کو بھی دیتی ہوں۔ تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ تمہاری باتیں اور سوچیں بے معنی یا بے مقصد ہیں؟ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ تم شاید جانتے نہیں کہ تمہاری سوچیں اور لایعنی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں، تم بار بار مجھے ایسے نہ کہا کرو، ہر فیملی میں مسائل ہوتے ہیں لیکن یاد رکھنا کبھی کبھی جو ہمیں نظر آتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی ہے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو ہم محسوس کر رہے ہوتے ہیں وہ ہمارا وہم اور خوف ہوتا ہے، ہماری اپنی منفی سوچیں ہمیں دوسروں کے رویوں میں نظر آنے لگتی ہیں، ہر انسان کی زندگی مشکلوں میں گھری ہوتی ہے۔ بس فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ کوئی بہادر ہوتا ہے اور اپنے آپ کو سنبھال لیتا ہے اور کوئی تمہاری طرح کم حوصلہ اور کم ہمت، میں جانتی ہوں تمہاری محرومیاں تمہارے سوا اب صرف میں جانتی ہوں، ہمارے اپنوں کی طرف سے ملنے والی کچھ ناانصافیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا انہیں بھی اندازہ نہیں ہوتا، تمہیں ایک دوست کی ضرورت تھی جو تمہاری چھوٹی چھوٹی پریشانیوں اور ان کہی محرومیوں کو سن کر تمہارا بوجھ ہلکا کر دے اور میں تمہاری وہ دوست بن گئی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ تمہارا مجھے 'سوما' کہنا میرے لیے بہت قیمتی ہے، مجھے کبھی کسی نے اس نام سے نہیں پکارا، تمہیں بتاؤں کہ تمہارا مجھے 'سوما' کہنا تم پر بہت جچتا بھی ہے۔ (ہاہاہا)

اب کبھی کوئی منفی سوچ اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دینی، جانتے ہو ناں کہ اب میں تمہارے ساتھ ہوں تو بس اب خوش رہنا اور…… ایسے ہی مجھے یاد کرتے رہنا لیکن اتنا زیادہ بھی نہ یاد کرو کہ خود ہی بیمار پڑ جاؤ۔ (ہاہاہا)

اپنا خیال رکھنا۔

تمہاری دوست جان سوما۔

اللہ حافظ۔

❁……❁……❁

''منتہا تم سمجھ نہیں رہی ہو۔'' سلمیٰ کا جھنجلایا انداز اس کی سماعت سے ٹکرایا تو ڈریس کے اسکیچ بناتی منتہا نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

''سلمیٰ باجی میں سمجھنا بھی نہیں چاہتی ہوں۔'' منتہا کے بیزار لہجے پر سلمیٰ اس کے قریب آئی۔

''آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''کیا مطلب ہے کیا چاہتی ہوں؟ میں نے بتا دیا تھا آپ کو کہ میرے لیے کیا اہم ہے تو آپ کو کس نے کہا خوامخواہ میرے لیے اپنا وقت ضائع کریں؟'' منتہا اسے دیکھتے ہوئے کچھ بگڑے تیوروں سے بولی۔

''اسی کو کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔'' سلمیٰ نے منہ بسور کر کہا۔

''تو کون کہتا ہے کہ ایسی نیکیاں کریں جن کو دریا میں ڈالنا پڑے؟'' منتہا نے دوبدو جواب دیا، سلمیٰ کے جواب دینے سے پہلے ہی منتہا کا موبائل بجنے لگا، سلمیٰ نے

ناگواری سے دیکھا منتہا موبائل کی طرف متوجہ ہوئی تو سلمٰی نے منتہا کے بنے اسکیچ پر نظریں جمائیں۔ منتہا نے اسکرین پر لکھے نام کو دیکھا اور ایک دم کال ریسیو کی۔ سلمٰی نے حیرانی سے اسے دیکھا، اگلے پل سلمٰی نے اشارے سے منتہا سے کافی پینے کا پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سلمٰی کافی بنانے چلی گئی۔
''آپ یہ بتائیں کے عمار کے ساتھ نے وہ ایکٹیویٹز شروع کی ہیں جو میں نے بتائی تھیں؟'' منتہا کے سوال پر سلمٰی نے پلٹ کر دیکھا، تاسف سے پیشانی پر ہاتھ مارا اور پھر سر جھٹک کر کافی کی طرف متوجہ ہوئی۔
''جب تک آپ خود ایکٹیو نہیں ہوں گی عمار کو کیسے سنبھال سکیں گے؟'' منتہا کے لہجے میں ہلکا سا جھنجلاہٹ کا تاثر تھا۔
''میں اکیلی ہوتی ہوں منتہا تم سمجھ نہیں رہی ہو، کیسے سب کچھ سنبھالوں؟'' دوسری طرف سے اپنی صفائی میں ایک بار پھر ایک بودا سا عذر تراشا گیا۔
''تو کیا آپ کے شوہر آپ کی مدد نہیں کرتے؟'' منتہا نے حیرانی سے سوال کیا۔
''ان کے پاس کہاں وقت ہوتا ہے، مسجد کے سارے انتظامات ان کے پاس ہیں اور پھر وقت بے وقت ان کو کمیٹی ممبرز کے ساتھ میٹنگ بھی کرنی پڑتی ہے، وہ زیادہ تر مصروف ہی رہتے ہیں۔'' مدھم آواز میں بتائی گئی وجہ پر منتہا کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔
''لیکن ریحانہ آپ یہ بھی تو سمجھنے کی کوشش کریں کہ عمار کی اسپیچ تھراپی بہت ضروری ہے، اگر آپ گھر کے کاموں میں ایسے ہی الجھی رہیں گی تو عمار کے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔'' منتہا اپنے سارے کام چھوڑ کر مکمل طور پر اس کال کی طرف متوجہ تھی، سلمٰی کافی بنا کر لائی تو اس کے سامنے مگ رکھا اور اشارے سے اس سے کال کی بابت پوچھا۔ منتہا نے بھی اشارے سے اسے بعد میں بتانے کا کہا۔
''جانتی ہوں مسئلہ بن جائے گا لیکن میں کیسے کروں؟ پورا دن گھر کے کاموں میں گزر جاتا ہے اور پھر احسان کی مسجد کی مصروفیات بھی بہت ہیں۔'' ریحانہ کی بات پر منتہا نے بہ مشکل اپنے غصے کو قابو کیا۔
''دیکھیں ریحانہ آپ ہی اپنے شوہر کو بتا سکتی ہیں کہ عمار کو اس وقت آپ دونوں کی سپورٹ کی ضرورت ہے، اگر عمار کے اسکول کی طرف سے آپ کو عمار کی ذہنی اور جسمانی حالت کے بارے میں بتایا جارہا ہے تو خدارا اس مسئلے کو بعد کے لیے نہ رکھیں یہ پہلے حل کرنے والا ہے۔'' منتہا کا لب ولہجہ دوٹوک اور مضبوط تھا۔
''نہیں...... نہیں منتہا وہ مدد تو بہت کرتے ہیں لیکن بس میں ہی کچھ سست ہو جاتی ہوں۔'' ریحانہ منمنائی تو منتہا نے گہری سانس خارج کی۔
''اگر آپ کے اپنے پاس ہی وقت نہیں ہے تو پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں، میں تو آپ کا حوصلہ ہی بڑھا سکتی ہوں کرنا تو آپ نے خود ہی ہے۔'' منتہا نے مایوسی سے کہا۔
''میں کرتی تو ہوں لیکن کچھ دن بعد پھر بوکھلا جاتی ہوں۔'' ریحانہ کو اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی زندگی کی اس بے ترتیبی کا الزام کس کو دے۔
''اچھا آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھتی ہوں کہ آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔'' منتہا اس کی پریشانی پر ایک دم موم ہوئی۔
''تم جو کہو گی میں کرلوں گی۔'' ریحانہ کی آواز پر منتہا کی پیشانی پر بل پڑے۔
''ویسے ابھی تک تو آپ نے میری ایک بات نہیں مانی۔'' منتہا نے ہنستے ہوئے جتایا، لہجے کو دوستانہ رکھا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔
''میں کوشش تو کرتی ہوں۔'' ریحانہ کی آواز سے منتہا کو محسوس ہوا تھا کہ وہ منہ بسور کر بولی۔
''اچھا آپ سب سے پہلے اپنا ٹائم ٹیبل سیٹ کریں، اس حساب سے کہ زیادہ وقت آپ کا عمار کے ساتھ گزرے اور اپنے ہزبینڈ کو بھی احساس دلائیں کہ عمار کے معاملے میں کچھ تو آپ کی مدد کریں۔'' منتہا جو کچھ دیر پہلے ریحانہ کی باتوں پر سوچ رہی تھی کہ اب اسے کوئی مشورہ نہیں

دے گی اپنی عادت سے مجبور ہو کر پھر اس کو سمجھانے لگی۔
''ایک مکمل ٹائم ٹیبل بنائیں جس میں عمار کے ناشتہ سے لے کر اس کے رات کے کھانے تک ہر ایکٹیویٹی ہونی چاہیے، عمار سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتی رہا کریں۔'' منتہا نے ایک بار پھر اسے وہی سب بتایا جو پچھلے چند ماہ سے بتا رہی تھی۔ اس کے بعد کافی ساری چھوٹی بڑی ہدایت دے کر منتہا نے فون بند کر دیا۔
''جہاں تک میں جانتی ہوں تمہارے وسیع و عریض حلقۂ احباب میں ریحانہ نامی کوئی ایسی بندی نہیں ہے جس کا بیٹا عمار اور شوہر شاید مولوی ہے۔'' فون بند کرتے ہی منتہا نے ٹھنڈی ٹھار کافی ایک ہی سانس میں ختم کی جس نے اس کی جھنجلاہٹ اور غصہ دونوں ہی میں واضح کر دیا تھا۔ سلمٰی نے متغیر نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کون ہے یہ ریحانہ؟'' منتہا نے اس کی تائید میں ہاں میں سر ہلایا تو سلمٰی نے سوال کیا۔
''بوتیک پر آئی تھی، اپنے بارے میں بتانے لگی چار سال کا بیٹا ہے شوہر یہاں مسجد میں امام ہے یہ لاہور کی لڑکی اور اپنے ماحول سے بالکل الٹ ماحول میں آ گئی ہے وجہ وہی ہماری روائتی سوچ کہ انگلینڈ پہنچ جائے گی۔'' منتہا اسکیچ بنے پیپرز کو ایک فائل میں رکھتے ہوئے انتہائی بیزاری سے ریحانہ کے بارے میں سلمٰی کو بتانے لگی۔
''یہاں آنے کے کچھ ہی ماہ بعد بیٹا پیدا ہو گیا اور وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں ہے، اسے بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے لیکن ریحانہ کو اب سمجھ میں ہی نہیں آ رہا کہ گھر کے کاموں کے ساتھ عمار کی اس ذہنی حالت کا کیسے مقابلہ کرے اور ستم بالا ستم اس کے شوہر نامدار کسی مسجد کے امام مکمل اسلامی تعلیم پر عبور حاصل ہے اس کے باوجود اسے اتنی سمجھ نہیں کہ اپنی بیوی کا خیال کرے۔'' منتہا بولنے پر آتی تو ایسے ہی بات سے بات نکال لیا کرتی تھی۔
''اچھا اور اب حسب عادت تم نے سارا کیس ہی سنبھال لیا۔'' سلمٰی نے اسے گھورا۔
''اور مجھے سمجھ میں نہیں آتی جب ایسے عالم فاضل لوگ اپنے گھر کو نہیں توجہ دے سکتے تو مجھے یا آپ جیسے عام لوگ اپنے مسئلے حل کروانے کس کے پاس جائیں؟'' منتہا نے سوالیہ نظروں سے سلمٰی کو دیکھا۔ سلمٰی نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔
''یہی تو بات ہے سلمٰی باجی کوئی بھی نہیں جانتا اور اسی بات پر میرا دل ہمیشہ پریشان رہتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس علم ہے، کچھ کرنے کی صلاحیت ہے وہ عملی طور پر اتنے پیچھے کیوں ہیں؟ کیوں وہ عملی طور پر اپنے آپ کو رول ماڈل نہیں بناتے؟ تاکہ ہمارے پاس کچھ تو ہو جس کو ہم بھی فالو کر سکیں۔'' منتہا کے اکتائے انداز پر سلمٰی نے متعجب نظروں سے اسے دیکھا۔
''اب تمہاری ان باتوں کا میں کیا جواب دوں؟؟ ویسے تم یہ درزی والا کام چھوڑ کر سوشل سروسز کیوں نہیں شروع کر دیتی؟ جگہ بھی ہے تمہارے پاس اور ماشاءاللہ سمجھ بوجھ بھی۔'' سلمٰی نے ہنستے ہوئے کہا۔
''یہ میرا پروفیشن ہے اور سوشل ورک میرا شوق۔ دونوں ساتھ ساتھ چلا سکتی ہوں۔'' منتہا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
''سنو......'' منتہا نے اپنی چیزیں سمیٹنی شروع کیں تو سلمٰی نے اسے پکارا۔ منتہا نے حیرانی سے سلمٰی کے رازدرانہ انداز کو دیکھا۔
''بلال اچھا لڑکا ہے اور تم اسے اچھی بھی لگتی ہو۔'' سلمٰی نے بنا کسی تمہید کے بات کی تو منتہا کی پیشانی پر ناگواری جھلکنے لگی۔
''تم اسے جاننے اور سمجھنے کی ہامی بھی تو بھر سکتی ہو۔ ایسے بنا کسی کو جانے دوٹوک انکار کہاں کا انصاف ہے؟'' اب کے سلمٰی جھنجلائی۔
''سلمٰی باجی بلال اچھا ہوگا، میں اسے اچھی بھی لگتی ہوں گی لیکن یہاں سوال میری ساری زندگی کا ہے اور مجھے بلال اچھا نہیں لگا۔ اس لیے آپ مجھ سے اس کے بارے میں مزید کوئی بات نہ کرنا۔'' منتہا نے اچھی خاصی ترش مزاجی کا مظاہرہ کیا تو سلمٰی نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ

سمجھا۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ منتہا کے دل میں جگہ بنانے کے لیے بلال کو بہت سارے پاپڑ بیلنے ہوں گے۔ منتہا اپنی اسکیچ اور دوسری چیزیں سمیٹنے میں لگی تھی اور سلمیٰ نے بھی اب گھر روانہ ہونا تھا اس لیے اب دونوں ہی خاموشی سے اپنی چیزیں سمیٹنے میں لگی تھیں۔

❁ ❁ ❁

دن ایسے ہی ہسپتال کے چکر لگاتے گزر رہے تھے، پچھلے دو تین ہفتوں سے فرحان اور ایان نے ایک روٹین ترتیب دے لی تھی، ریان کے پاس دو دن فرحان جاتا تھا اور دو دن ایان، اسی طرح دو ماہ گزر گئے تھے، کبھی ریان کی طبیعت میں فرق نظر آنے لگتا تو کبھی حالت بگڑنے لگتی، اس سب میں کچھ اطمینان اس بات کا تھا کہ پچھلے کچھ دنوں سے ریان کی حالت میں واضح تبدیلی محسوس ہو رہی تھی، جو اس کا نقصان ہوا تھا اس نے ریان کو شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیا تھا، وہ جان چکا تھا کہ اس ایکسیڈنٹ میں اس نے اپنی ٹانگ گنوادی ہے، فرحان اور ایان نے جس مشکل سے ریان کو اس حقیقت کے آشکار ہونے پر سنبھالا تھا یہ وہی جانتے تھے، اب ان کے لیے ارمان اور امل کی موت کی خبر دینا اور اس کو سنبھالنے کا مرحلہ باقی تھا، ڈاکٹروں کے مطابق ریان اگلے چند دنوں تک ڈسچارج ہوسکتا ہے، یہ خبر جہاں خوشی کی تھی وہاں انتہائی دل سوز بھی تھی۔

امینہ فی الحال واپس مختیار ہاؤس آ گئی تھی اور فوزیہ کے ساتھ مل کر کافی سارے معاملات سنبھال لیے تھے، جب آندھی آتی ہے تو گلشن کا تنکہ تنکہ بکھرنے لگتا ہے، مختیار ہاؤس میں بھی کچھ ایسے ہی ہوا تھا، سلیمہ بیگم کا رویہ، ان کی ضد اور ہر آئے گئے کے سامنے عجیب وغریب قسم کی دہائیاں اور رونا دھونا ایک عجیب ہی منظر پیش کر رہا تھا، ارمان اور امل کے جانے کا کسی کو یقین آ رہا تھا نہ آنسو تھم رہے تھے، جس ماں کا جوان بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے منوں مٹی تلے جا سوئے اسے صبر کیسے آ سکتا ہے سلیمہ بیگم ہر وقت انہیں یاد کرتیں، آنسو بہاتی رہتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریان کو نظر انداز کرنا ایک ناقابل یقین حقیقت تھی، جو امینہ کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی غم سے دوچار کر رہی تھی۔

گھر میں ارمان اور امل کی موت پر اب آنے والوں کی تعداد میں کمی تو ہونے لگی تھی، ویسے بھی کوئی کب تک کسی دوسرے کے دکھ کا مداوا کر سکتا ہے، جن پر گزرتی ہے انہیں تو پھر ساری عمر جھیلنی پڑتی ہے، لوگ بس وقتی سہارے دے کر اپنے جھمیلوں میں الجھ جاتے ہیں۔ امینہ اور ایان کو احساس تھا کہ سلیمہ بیگم ایک دفعہ بھی ریان سے ملنے ہسپتال نہیں گئی تھیں، مختیار بھی ایک ادھ دفعہ ہی اس کے پاس گئے تھے، ریان نے کئی بار سلیمہ بیگم اور مختیار کا پوچھا بھی۔ فرحان اور ایان نے ان کی مصروفیت کا بہانہ بنا دیا لیکن امینہ جانتی تھی کہ سلیمہ بیگم کس وجہ سے ریان سے ملنے نہیں جا رہیں۔

ملنے والی عورتیں ابھی تک ارمان اور امل کی تعزیت اور ریان کی عیادت کے لیے آیا کرتی تھیں تو ریان کے ذکر پر ان کا لہجہ دل دکھانے والا ہوتا تھا۔ اب جب ڈاکٹر اس بات پر پرامید تھے کہ ریان جلدی ڈسچارج ہوسکتا ہے تو امینہ اور فوزیہ کو یہ پریشانی ہونے لگی تھی کہ ریان کے گھر آنے پر سلیمہ بیگم نے اگر کوئی ایسی بات کر دی تو ریان کیسے برداشت کرے گا۔ عورتوں کے جانے کے بعد چائے کے برتن اٹھاتے ہوئے امینہ، سلیمہ بیگم کے پاس بیٹھ گئی۔

''خالہ جان ریان بہت بار آپ کا پوچھ چکا ہے، ارمان بھائی اور امل کے اس سے نہ ملنے کے بہانے بنا بنا کر ایان اور فرحان نے اب فیصلہ کیا ہے کہ اسے سب بتا دیں، لیکن آپ کے اس سے نہ ملنے کی کیا وجہ بتائیں؟'' امینہ کے پوچھنے پر سلیمہ بیگم نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

''خالہ جان پلیز ارمان بھائی اور امل کے جانے کا ہم سب کو بہت دکھ ہے لیکن اس میں ریان کا کیا قصور؟ آپ کی اس کے ساتھ یہ ناراضی جائز نہیں۔'' امینہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اس کا قصور یہی ہے کہ اس نے میری کوئی بھی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے، کتنی بار منع کیا تھا ابھی کچا ڈرائیور ہے نہ گاڑی لے، ساری دنیا بسوں اور ٹیکسیوں میں سفر کرتی

ہے کچھ عرصہ ایسے کرلے جب ہاتھ پکا ہوجائے گا تو اسی نوے کی اسپیڈ بھی کرلے گا لیکن نہیں...... مار دیا ناں میرے ارمان کو؟ اجاڑ دیا ناں میرے بچے کا آنگن۔" سلیمہ بیگم بین کرتے ہوئے رونے لگیں۔

"خالہ جان کیسی باتیں کررہی ہیں آپ؟ ارمان اور امل تو اس کی زندگی تھے وہ جان بوجھ کر کیوں ان کی جان لے گا؟ اور اگر ان کی جان لینی ہوتی تو اپنی یہ حالت کیوں کرتا؟ دو مہینے سے ہسپتال میں پڑا ہے اور آپ بھی جانتی ہیں اس کا کیا نقصان ہوا ہے؟" ایسے کھلے لفظوں میں ریان کو قاتل کہنا اس سے برداشت نہیں ہوا تھا۔

"اس کا نقصان...... دو مہینے اور گزرے تو پورا ہوجائے گا لیکن میرا نقصان وہ کیسے پورا ہوگا؟" سلیمہ بیگم نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ ریان بھی آپ کا ہی بیٹا ہے خالہ جان۔ ایک بیٹے کو گنوادیا اور اب دوسرے کو کیا جیتے جی ماردیں گی؟" اینہ پہلی بار بولی، اسے حقیقت میں دکھ ہورہا تھا، اسے یہ تو اندازہ تھا کہ وہ ریان سے ناراض ہیں لیکن اس کے تو وہم وگماں میں بھی نہیں تھا کہ سلیمہ بیگم اس حد تک بھی جاسکتی ہیں۔

"تم زیادہ اس کی طرف داری نہ کرو۔" سلیمہ بیگم نے انتہائی ناگواری سے اینہ کو دیکھا۔

"خالہ جان جن کے لیے آپ ریان کو مجرم بنارہی ہیں ریان میں ان کی جان بستی تھی۔ ایان بتارہے ہیں کہ ریان ایک دو دن میں گھر شفٹ ہوجائے گا اللہ کے واسطے خالہ جان اس کے ساتھ ایسا ظلم نہ کیجئے گا، وہ اس قابل نہیں کہ ارمان بھائی اور امل کی موت کے ساتھ ساتھ ان کے قتل کے الزام کا بھی دکھ سہہ پائے۔" اینہ کو سلیمہ بیگم کی سوچ اور ان کے طرز عمل پر بے حد دکھ پہنچا تھا۔

"اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں ریان کے سامنے کچھ نہ بولوں، اس سے اس سب کی باز پرس نہ کروں تو کوشش کرنا وہ میرے سامنے نہ آئے۔" سلیمہ بیگم نے اپنا مدعا سامنے رکھا۔

اینہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ سلیمہ بیگم جو ٹھان چکی ہیں اب اس سے ٹس سے مس ہونا ان کے لیے ناممکنات میں سے تھا، ویسے بھی بہت انا پرست تھیں، اپنی ضد سے ہٹ جانا انہیں تسکین نہیں دے سکتا تھا، اینہ نے خاموشی اختیار کرلی اور ان کے پاس سے اٹھ گئی۔

❁......❁......❁

ہائے کتنے برس بیتے تم گھر نہ آئے رے
راہ دیکھے ساون بھادوں، دریا پہاڑ
تیرے لیے راہ دیکھے سجنا سارا سنسار
دل ترسے، پھر برسے میرے بالم کے لیے
ہائے کتنے برس بیتے تم گھر نہ آئے رے
راہ دیکھے کالے میگھا، ندیا کا پانی
تیرے لیے راہ دیکھے بلما ساری زندگانی
دل ترسے، پھر برسے تم گھر نہ آئے رے
ارے لوٹ آؤ سجنا میرا دل بلائے رے

شوبہا مدگل کی پرسوز آواز اس گہرے سناٹے میں دل کو چیرتی ہوئی محسوس ہورہی تھی، ہر طرف پھیلی سوگواریت اور رنجیدگی نے دل ودماغ پر مکمل قبضہ جمارکھا تھا، وہ آنکھیں پھر اداس تھیں، انتظار کی لذت اب درد کی صورت اختیار کرنے لگی تھی، دل ودماغ کو اس اداسی کے حصار سے آزاد کرانے کا ہر ایک حربہ بے سود ٹھہرا تھا۔ کھڑکی سے باہر آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ میں چاند چمک رہا تھا لیکن چاندنی پھر بھی بجھی بجھی ہوئی تھی مگر مایوس تھی اور اداسی نے اس کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، انتظار لاحاصل پر بے اختیار زبان پر شکوہ مچلا، بے آواز آنسوؤں کا بند ٹوٹا اور بے بسی و مایوسی کے بادل اس قدر گہرے ہوئے کہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور وہ آنکھیں ان بہتے آنسوؤں کا بوجھ برداشت نہ کرسکیں اور بند ہوگئی تھیں۔

❁......❁......❁

۱۵ مئی ۲۰۱۰ء

"بس میں آج اداس ہوں۔"

ہیں کیوں؟ اور یہ تم آج میری لائن کیوں بول رہی

ہو؟“
”بس ہوں اداس......وجہ نہیں جانتی۔“
”کیا ہوا میری انارکلی، ایسے اداس اور پریشان کیوں ہو؟“
”نہیں جانتی۔ بس ایسے ہی دل اداس ہے۔“
”تم جانتی ہو تم ایسے اداس اچھی نہیں لگتی ہو۔“
”نہیں جانتی تم بتادو۔“ (ہلکی سی شرارتی ہنسی)
”اگر تم اداس ہوگی تو میری اداسی کہاں جائے گی پھر؟ یہ اداسیاں تمہارے لیے نہیں بنیں۔“
”اداسیاں تو تمہارے لیے بھی نہیں بنیں۔“
”ہاں لیکن میں اپنی دوست جان کو کبھی اداس نہیں دیکھ سکتا۔“
”اداس تو میں بھی تمہیں نہیں دیکھ سکتی۔“
”اچھا میں اب اداس نہیں ہوں گا چلو اب جلدی سے مسکراؤ اور کوئی ایسی اچھی سی بات کرو جو تمہاری اداسی دور کردے۔“
”یہ کیا بے ایمانی ہے؟ اداس بھی میں اور کوئی بات بھی میں ہی ایسی کروں جس سے اداسی دور ہوجائے۔“
”تم تو جانتی ہو مجھے باتیں کرنی نہیں آتی ہیں۔ میں بس جواب اچھے دے سکتا ہوں۔“ (شرارتی لہجہ)
”جب سے ٹیکسٹ میسج اور کال کا سلسلہ شروع ہوا ہے ای میل کا چارم ہی کم ہونے لگا ہے۔“
”اب ایسی بھی بات نہیں۔ تم ای میل کا چارم برقرار رکھو۔“
”ساری باتیں میسج یا کال میں ہوجاتی ہیں تو ای میل میں کیا لکھا کروں۔“
”ہاں یہ تو بہت گمبھیر مسئلہ ہے۔“
”خیر اب ایسا گمبھیر بھی نہیں۔“
”تم نے بتایا نہیں تم اداس کس بات پر ہو؟“
مجھے برگر کھانا تھا لیکن مما نے اتنا اچھا کریلے گوشت پکایا کہ میں برگر نہ کھاسکی۔ برگر کو مس کرتے کرتے اداس ہوگئی۔“
”ہائے برگر کتنا خوش بخت ہے۔ کاش میں برگر ہی ہوتا۔“
”ہاہاہا تم برگر ہوتے تو اب تک تمہیں کھاپی چکی ہوتی۔ تو میرے خیال میں تم انسان کے بچے ہی ٹھیک ہو۔“
”ہاہاہا......توبہ ہے تم بھی ناں......ویسے اس وقت آن لائن آکر تم نے مجھے فریش کردیا۔“
”جانتی ہوں۔“
”لیکن تمہاری اداسی؟“
”میری اداسی تمہاری خوشی دیکھ کر بھاگ گئی۔“
”اچھا اب چھوڑو یہ برگر شر گر کھانا اور کھانا پکانا سیکھ لو میرے لیے......میرا مطلب ہے اگلے گھر جاؤ گی تو کیا کروگی۔“
”تمہارے......میرا مطلب ہے اگلے گھر جاؤں گی تو دیکھا جائے گا۔“
”ہاہاہا......فنٹاسٹک“
”مجھے اب آف لائن ہونا ہے۔“
”جانتا تھا اب یہی کہنے والی ہوگی۔“
”بہت جاننے لگے ہو؟“
”ہاں اور چاہنے بھی......“ (ہنسی)
”اچھا اب زیادہ ڈائیلاگ سے پرہیز کرو۔ خیال رکھنا اپنا۔“
”ہاہاہا......اچھا ڈاکٹر صاحب۔ اللہ حافظ۔“

❁......❁......❁

ان دنوں بہروز کی بے چینی اور بے کلی عروج پر تھی، نہ دن کو قرار تھا نہ رات کو چین۔ ہر وقت ایک دھڑ کا سا لگا رہتا تھا اور ستم یہ کہ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے، بہروز اختر، مختیار اختر کے چھوٹے بھائی تھے، دونوں بھائیوں میں بے پناہ محبت بھی تھی اور انسیت بھی، ارمان کی موت اور ریان کی حالت نے بہروز اختر کی حالت بھی غیر کررکھی تھی، بہروز اختر کو اس وقت ریان کی بہت فکر تھی، سارے خاندان میں ارمان اور اہل کی جوان موت اور ریان کی حالت پر ایک سوگواریت طاری تھی، لیکن اس وقت ہر کسی کو ریان کی زیادہ

فکر تھی جن کو جانا تھا وہ چلے گئے لیکن جو زندہ ہے اس کی زندگی اب پل پل مرتے گزرے گی۔

"ابو......" سورج کی کرنیں رات کے اندھیرے میں ڈھل رہی تھیں اور بہروز اختر ابھی تک اپنے کمرے میں نہیں گئے تھے، انہیں گہری سوچ میں محو دیکھ کر مومنہ ان کے پاس آئی۔

"ابو آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" پکار پر وہ کچھ نہ بولے تو مومنہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں متوجہ کیا۔

"ہاں بیٹا میں ٹھیک ہوں۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے دھیرے سے مسکرائے۔

"ٹھیک تو ہیں لیکن پریشان کیوں ہیں؟" مومنہ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے فکر مندانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں بیٹا پریشان تو نہیں ہوں۔" بہروز اختر نے اس کو ٹالنا چاہا۔

"ہاں جیسے کہ میں جانتی نہیں ہوں۔" مومنہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"نہیں پریشان نہیں ہوں، بس یہی سوچ رہا ہوں کہ کیسے آناً فاناً مختیار بھائی کے گھر میں ماتم بچھ گیا اور ریان......"

"ہاں ابو ارمان بھائی اور اہل باجی کے انتقال نے سب کو ہلا کر رکھ دیا، ریان بھائی کے لیے بھی سب ہی فکر مند ہیں، آپ فکر نہ کریں اللہ کرے گا وہ بھی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔" مومنہ کے لہجے میں بھی ارمان اور اہل کے انتقال کا صدمہ تھا۔

"بیٹا فکر تو ہوتی ہے۔ بس اللہ کرے وہ جلدی سے ٹھیک ہو جائے ورنہ...... ایسی کج پڑی کہ اسے ارمان اور اہل کے جانے کے دکھ کو ماند ہی نہیں پڑنے دے گی۔" بہروز اختر کے لہجے کی بے بسی در آئی تو مومنہ بھی اداس ہو گئی۔

"آپ مختیار چاچا کو کال کرلیں۔" مومنہ نے کہا تو بہروز نے پرسوچ نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہیں بیٹا بار بار کال کرنا بھی اچھا نہیں لگتا، تم فوزیہ اور اینہ سے رابطے میں رہو۔" بہروز اختر نے کچھ سوچ کر کہا۔

"آپ دونوں باپ بیٹی یہاں بیٹھ کر گپیں ہانک رہے ہیں اور ادھر روٹی ٹھنڈی ہوگئی ہے۔" مومنہ کے کچھ بھی کہنے سے پہلے ہی عالیہ بیگم کی دھماکے دار آمد پر مومنہ نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

"تمہیں میں نے بھیجا تھا کہ ابو کو بلا کہ لاؤ کہ کھانا کھا لیں...... خود بھی تم یہاں آ کر بیٹھ گئی ہو۔" عالیہ بیگم کی تنک مزاجی کو بہروز اختر نے نظر اٹھا کر دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سوری امی یہاں آئی تو ابو خاموش بیٹھے تھے تو مجھے یاد نہیں رہا۔" مومنہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے مدھم لہجے میں وضاحت دی۔

"ایک تو ان کی بھتیجوں کی محبت سے سخت عاجز ہوں۔" عالیہ بیگم کی جھنجلائی آواز پر مومنہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔

"جو چلا گیا اب اسے بخش دو۔ پر نہیں تمہارے باپ کو شوق ہے دوسروں کے لیے جلنے کڑھنے کا۔" عالیہ بیگم کے انداز میں جھانکتی لاپروائی نے مومنہ کو خاصا متعجب کیا۔

"امی کیسی باتیں کررہی ہیں، مختیار چاچا نے ہمیشہ ہماری مدد کی ہے اب اگر وہ پریشان ہیں تو کیا ہم ان کے اس دکھ میں کچھ دن پریشان بھی نہیں رہ سکتے؟" عالیہ بیگم کے لہجے پر مومنہ کو حقیقتاً رنج ہوا تھا۔

"رہنے دو تم، اپنی طرف داریاں اپنے پاس رکھو۔ سب جانتی ہوں ان کی مدد کو بھی اور چال بازیوں کو بھی۔" عالیہ بیگم پل کی پل رک کر ترش لہجے میں بولیں تو مومنہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"امی یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ بھلا ہماری مدد کرنے میں ان کا کیا مفاد ہوگا؟" مومنہ حیرانی سے گویا ہوئی۔

"تم نہیں سمجھو گی، بس اتنا سمجھ لو زر، زمین کا لالچ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔" عالیہ بیگم کے لہجے کی نفرت اور تیکھا پن مومنہ کے لیے نیا نہیں تھا لیکن اس موقع پر

جب ہر کوئی ارمان اور امل کے جانے پر غمگین تھا اور ریان کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا ایسے میں عالیہ بیگم کے ایسے رویے نے مومنہ کو دکھ دیا تھا۔

''امی اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔''

''اچھا بس...... تم کچھ نہیں جانتی اس لیے خوامخواہ کسی کی طرف داری نہ کرو۔ چلو جلدی کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' عالیہ نے اسے سرزنش کیا اور اس کی مزید کوئی وضاحت سننے سے پہلے ہی وہاں سے چلی گئی۔ مومنہ بھی کچھ دیر وہاں رکی اور پھر سر جھٹک کر کھانا کھانے کچن کی جانب بڑھ گئی۔

بہروز اختر اور مختیار اختر دو ہی بھائی تھے، باپ دادا کی زمینوں کی باگ ڈور بہروز کو سونپ کر عرصہ دراز سے مختیار انگلینڈ میں مقیم اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے، بہروز پاکستان میں زمینوں کی دیکھ بھال اور فصلوں کی کٹائی میں مصروف رہتے تھے، عالیہ بیگم بہروز کی دوسری بیوی تھیں، عالیہ بیگم کی بھی پہلے شادی ہو چکی تھی، اس کا ایک بیٹا حسنین بھی ان کے ہمراہ آیا تھا، مومنہ، عالیہ اور بہروز کی بس ایک ہی بیٹی پیدا ہوئی، اس کے بعد وہ ماں نہ بن سکی۔ پہلے پہل تو زمین جائداد کی دیکھ بھال اور فصلوں کی کٹائی پر اسے کوئی اعتراض نہ رہا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا انہیں بہروز اختر کی اس ذمہ داری سے چڑ ہونے لگی تھی۔

''بہروز اختر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ محنت ساری ہم کریں اور آخر میں آدھا حصہ مختیار بھائی کے نام لکھ دیا جائے؟'' فصلوں کی کٹائی اور دیکھ بھال کوئی آسان کام نہیں تھا، عالیہ کچھ عرصے سے کھلے لفظوں میں اس ناانصافی پر بولنے لگی تھی۔

''یہ ناانصافی نہیں ہے عالیہ۔ اس احسان کا بدلہ ہے جو مختیار بھائی نے مجھ پر کیا ہے۔ میری مجبوری میں، جب تم ساتھ نہیں دے سکی تھی تب مختیار بھائی نے ہی میرا ساتھ دیا اب میں کیسے مکر جاؤں؟'' بہروز اختر ہمیشہ ایک ہی بات کرتے تھے۔

''جب محنت کا وقت ہوتا ہے تب تو پوچھتے نہیں لیکن جب سارے کام ہو جاتے ہیں تو چودھری بن کر آ ٹپکتے ہیں۔'' عالیہ بیگم نخوت سے بولیں۔ ''اور احسان کیسا؟ میں تو ساتھ دینے کو تیار تھی آپ ہی نہیں مانے تھے تو میں کیا کرتی؟'' بہروز اختر کے ساتھ نہ دینے کے الزام پر عالیہ تلملا اٹھی۔

''تمہاری شرائط کے ساتھ تمہارا ساتھ مجھے منظور نہ تھا۔'' بہروز اختر مدھم آواز میں بولے۔

''فرق صرف اتنا ہے چودھری بہروز اختر کہ میں نے اپنی شرائط بتا دی تھیں اور مختیار بھائی نے خاموشی سے وہی سب کروا لیا جو میں نے کہا تھا۔'' عالیہ بیگم کے لفظوں میں ایسی کاٹ تھی کہ بہروز سے مزید کچھ کہتے نہ بنا۔ وہ جانتے تھے انہوں نے کسی کو بے مول کیا ہے، وہ یہ بھی جانتے تھے انہوں نے اپنے لیے بے چینی اور اضطراب کے انبار لگا لیے ہیں لیکن اب وقت اتنا گزر چکا تھا کہ وہ کسی بھی فیصلے کو دوبارہ کرنے کا اختیار کھو چکے تھے۔ اب خاموشی سے ان تکلیفوں کو سہنے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا جو ان کی اپنی بزدلی یا کم ہمتی کی وجہ سے ان کا نصیب بنی تھیں۔

۞......۞......۞

ان دنوں منتہا کی مصروفیت کافی زیادہ تھی، وقت بے وقت وہ کام میں مصروف اپنے آپ کو بھی بھولی جاتی تھی، تھکاوٹ اور نیند کی کمی نے اس کی صحت پر بھی برا اثر ڈالا تھا، ابھی بوتیک کا کام اتنا زیادہ نہیں تھا کہ منتہا کوئی ورکر رکھ سکتی یوں بھی وہ پہلے اپنا نام بنانا چاہتی تھی پھر ہی کوئی اور قدم اٹھانا چاہتی تھی، اسے فیملی سپورٹ بھی حاصل تھی اور اسی لیے خدیجہ ان دنوں زیادہ وقت منتہا کے ساتھ اس کی بوتیک کو سیٹ کرنے میں گزارنے لگی تھی، لندن کے مشہور برائیڈل میگزین کے فرنٹ پیج پر منتہا کا ڈیزائن کیا گیا برائیڈل ڈریس آویزاں تھا جو منتہا کی محنت اور لگن کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سلمیٰ بھی کبھی کبھار اس کا ہاتھ بٹانے اور گپیں لگانے اس کے پاس موجود ہوتی تھی، اس کے علاوہ منتہا کا سوشل ورک بھی تواتر سے جاری تھا، کبھی کہیں تو کبھی کہیں

منتہا مدد کرنے اور مشورے دینے موجود ہوتی تھی۔
منتہا اور خدیجہ بوتیک میں مصروف تھیں کہ سلمیٰ اور بلال اس کی بوتیک میں داخل ہوئے، سلمیٰ کے ساتھ بلال کو دیکھتے ہی منتہا سمجھ گئی کہ اب پھر سلمیٰ اس کا سر کھانا شروع کردیں گی، بلال بوتیک کی سیٹنگ اور منتہا کے کام کی لگن سے بھی متاثر ہوگیا تھا۔ ستائشی نگاہوں سے اوپن وارڈ روب میں لگے ڈریس دیکھنے لگا۔ خدیجہ بیگم اپنی کسی مصروفیت کی وجہ سے وہاں سے جارہی تھیں تو بلال نے انہیں لفٹ کی پیشکش کی۔
''نہیں بیٹا میرے پاس گاڑی ہے، بہت شکریہ۔'' خدیجہ بیگم اس کی خوش اخلاقی سے متاثر ہوئیں۔ اس دوران منتہا نے اسے مکمل نظر انداز ہی کیا تھا، جو کہ سلمیٰ کو بہت کھٹکا تھا۔ خدیجہ کے جاتے ہی سلمیٰ نے منتہا کی طرف دیکھا۔
''تم اتنی روڈ کب سے ہوگئی ہو منتہا؟'' سلمیٰ کی بات پر منتہا نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا تو بلال بھی حیران ہوا۔
''بلال پہلی بار بوتیک میں آیا ہے اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ چائے کافی ہی پوچھ لو۔'' سلمیٰ نے مسکراہٹ دبا کر کہا تو منتہا کی پیشانی پر ناگوار لکیریں نمودار ہوئیں۔
''ارے نہیں نہیں سلمیٰ باجی میں تو نہیں پیوں گا۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔'' بلال نے سلمیٰ کو دیکھتے ہوئے منتہا کی طرف پلٹ کر کہا۔
''دراصل سلمیٰ باجی کے کافی پینے کا وقت ہے اس لیے..... خیر آپ بیٹھیں میں بنا لیتی ہوں۔'' منتہا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ بلال نے سلمیٰ کی طرف دیکھا تو مسکراتے ہوئے سلمیٰ نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
''نہیں مجھے تمہارے ہاتھ کی کافی نہیں پسند۔ تم بیٹھو میں خود ہی بنا لاتی ہوں۔'' سلمیٰ کہہ کر تیزی سے ایک طرف بنے چھوٹے سے کیبن کی طرف بڑھ گئی۔
''مجھے آپ سے بات کرنی ہے مس منتہا۔'' سلمیٰ کے جاتے ہی بلال منتہا کے پاس آ کھڑا ہوا اور بنا تمہید باندھے بولا۔ منتہا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔
''جانتی ہوں۔ جی بولیں؟'' منتہا کوئی ایسی چھوٹی بچی نا تھی کہ جان نا سکتی کہ بلال سلمیٰ کے ساتھ اگر آیا ہے تو ضرور کوئی بات ہی کرنی ہے۔
''میں اگلے ہفتے واپس یو ایس جارہا ہوں۔'' منتہا کی طرف دیکھتے ہوئے بلال وقت ضائع کیے بنا اصل بات کی طرف آیا، منتہا نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''میں اپنے پیرینٹس کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔'' بلال کی بات پر منتہا کی ناگواریت میں اضافہ ہوا۔
''مجھ سے اجازت مانگ رہے ہیں؟'' اس کے باوجود بھی منتہا نے بلال کے اس طرح بات کرنے کو پسند نہیں کیا اس نے بہت نرمی سے پوچھا۔
''یہی سمجھ لیں۔'' بلال ہنسا۔
''آپ بے شک بھیج دیں لیکن جس مقصد کے لیے آپ کہہ رہے ہیں وہ ممکن نہیں ہوگا اور آپ ماشاءاللہ بہت اچھے اور پڑھے لکھے ہیں میں نہیں چاہوں گی کہ آفیشلی آپ کو رجیکشن کا سامنا کرنا پڑے۔'' منتہا نے بتایا تو یک دم بلال کا چہرہ دھواں دھواں ہوا۔
''کیوں؟''
''میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی، کم از کم پانچ چھ سال اور.....''
''میں پانچ سال انتظار کرسکتا ہوں آپ کا۔'' بلال اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بولا۔
''پانچ سال کے بعد میرے پاس آپ کے ساتھ کی گنجائش نہ ہوئی تو آپ کے پانچ سال ضائع ہوجائیں گے۔ میں آپ کو کوئی امید نہیں دے سکتی ہوں۔ نہ یہ وعدہ کرسکتی ہوں کہ پانچ سال ہی مجھے چاہیے اس سے پہلے اگر مجھے.....''
''تو آپ صرف مجھے منع کررہی ہیں۔''
''بلال آپ بہت اچھے ہیں لیکن ضروری نہیں کسی بھی اچھے انسان کے لیے آپ کے دل میں ایسے جذبات بھی ہوں کہ آپ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھنا شروع کردیں۔ میں آپ کے بارے میں نہیں سوچ سکتی اس لیے آپ خود ہی اس بات کو سمجھ جائیں کہ ہاں میں

آپ کو منع کررہی ہوں۔" منتہا بہت نرم اور سلجھے انداز میں بات کررہی تھی، بلال کے دکھ کا اسے احساس تھا لیکن منتہا ابھی کوئی فیصلہ نہیں لینا چاہتی تھی۔

"آپ کے لیے کہیں کوئی بہت اچھی ساتھی موجود ہے۔ جس سے آپ اظہار کریں گے تو اس کا دل آپ کا ساتھ چاہے گا۔ آئی ایم ریئلی سوری میں وہ نہیں ہوں۔ آپ کی کسی بات سے میرا دل نہیں دھڑکا۔" منتہا کے لہجے میں اب کے ایک بے چارگی در آئی تھی۔ بلال کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"اوکے...... آئی ایم سوری۔ میں نے آپ کا وقت لیا۔ وش یو گڈ لک فار دا فیوچر۔" بلال سنجیدگی سے کہہ کر سلمٰی کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے چلا گیا تو منتہا نے ایک گہری سانس لی۔ طمانیت سے بھرپور آسودہ۔

❁......❁......❁

۷ جون ۲۰۱۰ء

دوست جان

السلام علیکم۔ تم ٹھیک ہو؟ ویسے تو میں تم سے متاثر تھا ہی لیکن ای میل کے چارم کو برقرار رکھنے کے معاملے میں تم نے مجھے اپنے متاثرین میں شامل کرلیا ہے، اب کتنے دن سے میں نے نا تمہاری آواز سنی نا میری موبائل کی اسکرین پر تمہارے نام کا دیا جلا۔ کچھ کچھ نا انصافی نہیں؟ اب میں تمہاری کون کون سی بات کا جواب دوں؟ ایک تو تم پانچ منٹ کے راستے کو دو گھنٹے میں طے کرتی ہو۔ جو بات دو جملوں میں کہی جاسکتی تھی اس کو تم نے چار صفحات میں بیان کیا اور میں ٹھہرا معصوم بھولا بھالا تمہارے ان چار صفحات کو بھی پوری دلجمعی سے پڑھا۔ بنا پلک جھپکے......

اچھا تمہارے کہنے کا مطلب تھا کہ میں اور تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور کوئی اور لڑکی خوامخواہ مجھے تم سے چھیننے کی کوشش کررہی ہے تو میں کیا کروں گا (ہاہاہا) میں تو کچھ نہیں کروں گا اگر وہ لڑکی اچھی ہوئی تو...... اور اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوا تو ہم مل جل کر زندگی گزار لیں گے۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ اب مجھے لگ رہا ہے تم نے ادھر ادھر دیکھا ہو کوئی چیز ہو اور اٹھا کر میرے سر پر مار دو اور سر پھوڑ دو لیکن تمہیں ایک بات بتاؤں سوما؟ میرا سر پھوڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، میں تمہیں اختیار دیتا ہوں کہ کوئی درمیان میں آئی تو اسے تم نکال باہر کرنا۔ میرا تو تمہیں پتا ہے ناں کہ مجھے لڑکیاں کتنی پسند ہیں تو میں کیوں چاہوں گا کہ کسی محبت کرنے والی کا دل توڑ کر گناہ کماؤں۔ (ہاہاہا)

میں تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ محبت کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے، محبت ہے تو اس کا اظہار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے، کسی کے دل میں کیا ہے کوئی نہیں جانتا لیکن اگر جذبے سچے ہوں تو ان کا عکس چہرے پر جھلکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ عکس محبت کا ہی ہو، کبھی کبھی محبت کی آڑ میں ہمدردی جتائی جاتی ہے، مجھے چہرے پڑھنے آتے ہیں دوست جان، رویوں کی بہت کڑی چوٹیں کھائی ہیں، اپنوں نے اپنا نہ سمجھا اور ایک تم ہو جس نے مجھے اتنا خاص بنا دیا کہ مجھے اپنا آپ ہی نیا لگنے لگا ہے۔ اس کے باوجود اگر تمہیں محبت ہے تو مجھے اس کا اظہار بھی چاہیے ہوگا تو کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ اچھا او کے میں پھر بات کروں گا۔ تم اپنا خیال رکھنا اور ہاں اب ضروری نہیں کہ تم اپنی آواز کو ترساؤ۔

اللہ حافظ

❁......❁......❁

۸ جون ۲۰۱۰ء

تمہاری ای میل پڑھتے ہی میرے تو چھکے چھوٹ گئے۔ بھلا کوئی ایسے سامنے آکر پوچھتا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ محبت کا اظہار ایسے کہاں ہوسکتا ہے؟ ویسے "کسی" کے دل میں کیا ہے "کسی" کو جان لینا چاہیے، تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ محبت کی آڑ میں ہمدردی نہیں جتائی جاسکتی، اگر ایسا ہو بھی تو، تا دیر نہیں رہتا، اس لیے میرے پیارے دوست چہرے پڑھنے کے ہنر سے واقف ہو تو دل پڑھنا بھی سیکھ لو اب۔ تمہارے مقابل اب سوما ہے اور سوما چار چار صفحات کی ای میل تو لکھ لیتی ہے لیکن چار لفظ بول کر ان چار صفحات کو بے مول نہیں کرسکتی۔

ہاں مجھے گلدان مل گیا ہے۔ تمہارا سر تو واقعی پھوڑنا پڑے گا۔ تم سے دو چار معصوم اور بھوے بھالے پیدا ہوگئے تو دنیا تو گئی کام سے۔

تم نے ہی تو کہا تھا کہ ای میل کے انتظار کا بھی اپنا ہی مزہ ہے، تعلق میں اعتبار اور خلوص کے ساتھ ساتھ جب تک انتظار نہ ہو کچھ پھیکا سا لگتا ہے اور سوما کی دوستی میں پھیکا پن...... کبھی ہو نہیں سکتا۔

تمہاری خیریت تو میں نے پوچھی ہی نہیں۔ امید ہے کہ تم خیریت سے ہوگے اور ہمیشہ کی طرح مجھے ہی یاد کر رہے ہوگے۔

اچھا اب تیار رہنا تمہارے موبائل کی اسکرین پر میرے نام کے اتنے دیے روشن ہوں گے کہ تم عاجز آجاؤ گے۔ (ہاہاہا) میں ابھی کچھ دیر پہلے جاب سے واپس آئی ہوں، فریش ہوکر اب کچھ دیر فیملی ٹائم کو انجوائے کرنے لگی ہوں پھر تمہاری خبر لیتی ہوں۔

خیال رکھنا اپنا۔

اللہ حافظ

تمہاری دوست جان سوما۔

❁......❁......❁

۸ جون ۲۰۱۰ء

ہاں ہمیشہ کی طرح تمہیں ہی یاد کر رہا ہوں۔ ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا کہ ساتھ ہی تمہارا پیغام مل گیا کہ تم بھی مجھے یاد کر رہی ہو۔ اچھا تم اپنا وقت انجوائے کرو پھر بات ہوگی۔

اللہ حافظ

❁......❁......❁

۸ جون ۲۰۱۰ء

پاگل۔ او کے تم بھی اپنا خیال رکھنا۔

اور ہاں میں تمہیں یاد کر رہی تھی۔ اچھا ہوگیا ابھی ہی تمہارا جواب بھی مل گیا۔ میں اب تسلی سے سب کے ساتھ وقت گزار سکوں گی۔

تمہاری دوست جان سوما

❁......❁......❁

پچھلے چند دنوں سے ریان کی حالت اس قابل ہوگئی تھی کہ اب اسے ڈسچارج کردیا جائے، اپنی معذوری پر جہاں وہ اداس تھا وہاں اسے بے حد خوشی بھی تھی کہ وہ اب سب کے درمیان ہوگا۔ ارمان اور امل بجو سے ملے گا۔ حسب معمول ایان اور فرحان اسے لینے آئے تھے، سسٹر جینی نے جس خلوص اور ہمدردی سے ان سب کا ساتھ دیا تھا، ریان کا خیال رکھا تھا اور تواتر سے فرحان اور ایان کو جس طرح ریان کی میڈیکل کنڈیشن کے بارے میں آگاہ کرتی رہی وہ قابل ستائش تھا، امینہ نے سسٹر جینی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اسے کچھ تحفے تحائف بھی دیے تھے، ریان کے ڈسچارج ہونے پر ہسپتال وارڈ میں چاکلیٹ بھی بانٹی گئی تھیں۔ ریان تقریباً تین ماہ بعد ہسپتال سے ڈسچارج ہوکر فرحان اور ایان کے ہمراہ گھر روانہ کی طرف رواں تھا، ادھر سلیمہ بیگم غصے میں مٹھیاں بھینچے بیٹھی تھیں اور مختیار خاموشی سے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے، امینہ اور فوزیہ ریان کے لیے جگہ سیٹ کررہی تھیں، جس پر سلیمہ بیگم انتہائی قہر آلود نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"سلیمہ بیگم تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ کیوں خوامخواہ خود کو ہلکان کررہی ہو؟" مختیار کی فکرمندانہ آواز پر امینہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کاش انکل آپ میں ہی اتنی ہمت ہوتی کہ آپ خالہ جان کو ایسا کرنے سے روک سکتے۔" امینہ کی زیرلب بڑبڑاہٹ پر فوزیہ اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"امینہ بھابی مجھے تو بہت خوف محسوس ہورہا ہے، ممانی جان تو بہت بگڑ رہی ہیں، اللہ جانے کیا ہو؟" فوزیہ کی بات تو سنجیدگی لیے ہوئے تھی لیکن اس کا لہجہ اب اپنے معمول پر لوٹ آیا تھا۔ امینہ نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا، وہ جانتی تھی فوزیہ بھی سلیمہ بیگم کے نقش قدم پر تماشائی بننے میں دیر نہیں لگاتی۔ امل نے کئی بار امینہ کو فوزیہ کے حوالے سے خبردار کیا تھا، وہ جانتی تھی کہ فوزیہ کس طرح کی سوچ کے حامل لڑکی ہے اور امل کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ فوزیہ کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس کو مرچ مسالہ لگانے کی گنجائش نکال سکے۔ امل اکثر امینہ کو سمجھایا کرتی تھی اسی لیے امل کے جانے کے بعد امینہ اپنے آپ کو بہت اکیلا سمجھنے لگی تھی۔

"امینہ بھابی میرے خیال میں تو ریان کو اس گھر میں نہیں آنا چاہیے تھا۔" فوزیہ کی بات پر امینہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ممانی جان کو بھی سنبھلنے کا کچھ وقت ملنا چاہیے، ریان کو دیکھتے ہی اگر وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں تو ریان کیسے برداشت کرے گا؟" فوزیہ کی بات تو ٹھیک تھی لیکن اس کا لہجہ اس کے ذاتی مفاد کی جھلکیاں دکھا رہا تھا۔ امینہ جانتی تھی کہ فوزیہ کوئی ایسی ذمہ داری نہیں اٹھا سکے گی جس کی وجہ سے اسے زیادہ کام کرنے پڑیں، ویسے بھی اس کی سوچ بہت روایتی تھی جس میں شوہر کے سوا کوئی دوسرا شامل نہ تھا، ایسے میں ایک بیمار انسان کی تیمارداری کا بوجھ وہ کیونکر اٹھا سکتی تھی۔

"یہ ریان کا گھر ہے فوزیہ اسے یہاں ہی آنا چاہیے اور رہی بات خالہ جان کی تو انہیں تو اس بات کو سمجھنا ہی ہوگا کہ اس سب میں ریان کا کوئی قصور نہیں اور کوئی ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ایسی ناانصافی نہیں کرسکتی۔" امینہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بھابی۔ میں تو ممانی جان کے رویے کی وجہ سے کہہ رہی تھی کہ اگر ریان، آپ یا امل بھابی کے گھر چلا جائے کچھ دن کے لیے تو خالہ جان خود کو سنبھال لیں پھر وہ آجائے۔" فوزیہ اس سے اتفاق کرتے ہوئے بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

"تم بہت بھولی ہوامینہ، اس کی چالاکیوں کو نہیں سمجھتی ہو، بس میں اتنا کہوں گی کہ ذرا سنبھل کر رہنا۔" امل کی آواز اس کی سماعت میں گونجی۔

"تم ہو تو مجھے کسی کا کوئی خوف نہیں۔ ویسے بھی تم تو میری نیچر جانتی ہو ناں مجھے یہ ہیرا پھیری نہیں آتی۔" امینہ نے اپنی کمزوری بیان کی تو امل ہنسنے لگی تھی۔

''میں ہوں تو لیکن اگر کبھی نہ ہوئی تو؟ تمہیں اپنی اس دیورانی سے نباہ کرنے کے لیے تھوڑی بہت ہیرا پھیری سیکھنی پڑے گی۔'' امل نے محبت سے اس کی بھولی بھالی صورت دیکھتے ہوئے کہا تو امینہ نے اسے دیکھا۔

''تم کہا جا رہی ہو؟'' امینہ کے سوال پر امل نے کندھے اچکاتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

''کہیں ہنی مون کا تو نہیں ارادہ کر لیا؟'' امینہ سے شریر لہجے میں پوچھا تھا۔

''یار مجھے تو شادی میں بس ہنی مون کا ہی شوق تھا لیکن دیکھو تو پاکستان سے ہجرت کر کے لندن پہنچ گئی لیکن ہنی مون ہوا ہی نہیں۔'' امل نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''ہنی کھایا پیا کرو کیا پتا کب مون مل ہی جائے۔'' امینہ کی شرارت سے بھرپور ذومعنی بات پر امل نے کھل سا قہقہہ لگایا تھا۔

''تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو اور جو میں کہہ رہی ہو کرو۔'' امل نے اسے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

''تمہارے ہوتے مجھے کوئی فکر نہیں اور تم نے کہیں جانا بھی ہوا تو مجھے دو چار بے ایمانیاں سکھا کر جانا تاکہ جب تک تم واپس آتی ہو میں تمہاری چھوٹی دیورانی سے دب نہ سکوں۔'' امینہ کی بات پر امل دل کھول کر ہنس دی تھی۔

''بے ایمانیاں سکھائی نہیں جاتی یہ تربیت میں پرورش پاتی ہیں۔'' امل آنکھ کا کونا دبا کر شرارت سے مسکرائی تھی۔ امل کی شرارتیں، اس کی باتیں، اس کے محتاط کرنے کا انداز اور اب امل کی جدائی، امینہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ کیسا خوشحال دور تھا اور کیسے سب کچھ ختم ہو گیا۔

''امل تم نے تو ابھی مجھے کچھ سکھایا ہی نہیں تھا، کچھ بتایا ہی نہیں تھا اور ایسے دیس جا بسی ہو جہاں سے میں چاہ کر بھی تم سے کوئی رابطہ نہیں کر سکتی۔'' امینہ کا دل امل کی جدائی پر خون کے آنسو رو دیا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسی زندہ دل لڑکی جسے جینے کی خواہش تھی کیسے زندگی کی بازی ہار سکتی ہے؟ اپنے منصوبوں میں امل بھی شاید بھولے بیٹھی تھی کہ ایک لمحے میں سب کچھ وہیں دھرے کا دھرا رہ جائے گا اور امل کی ذات محض ایک یاد بن جائے گی۔

''امینہ بھابی میرے خیال میں فرحان لوگ آ گئے ہیں۔'' فوزیہ کی بات پر امینہ نے سر کو جھٹک کر امل کے خیال کو پیچھے دھکیلا۔ باہر جانے کی بجائے وہ سلیمہ بیگم کے پاس آ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اب سلیمہ بیگم کچھ بھی ایسا کہہ دیں گی جو ریان کے ساتھ ساتھ اس کی بھی جان نکال دے گا اور پھر وہی ہوا جس کا خوف امینہ کے ساتھ ساتھ ایان اور فرحان کو بھی دہلا رہا تھا۔ ریان بیساکھیوں کے سہارے فرحان اور ایان کے ساتھ گھر میں داخل ہوا، شدید چوٹوں اور دوائیوں کے زیر اثر ابھی تک اس کے چہرے پر کمزوری کے آثار نظر آ رہے تھے، زرد رنگت اور شدید کمزوری کے باوجود ریان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، گھر میں داخل ہوتے ہی مختیار نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا اور ایان کو ہٹا کر ریان کے ساتھ ہوئے۔ اسے ہمراہ لیے وہ کمرے میں داخل ہوئے، ریان ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا، سب ہی جانتے تھے کہ وہ کسے ڈھونڈ رہا ہے اسی لیے کوئی بھی اس سے نظریں نہیں ملا پا رہا تھا۔

''وہیں رک جاؤ ریان۔ ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی سامنے سلیمہ بیگم کو دیکھتے ہی ریان ان کی جانب بڑھا، اس سے پہلے کہ ریان ان کے قریب ہوتا انہوں نے ہاتھ اٹھا کر انتہائی کرخت آواز میں اسے وہیں ٹھہرنے کا کہہ کر ریان کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی حیرت کا شدید جھٹکا دیا۔ ریان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزرا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مختیار اختر کو دیکھا جو سر جھکائے ایک طرف بیٹھے تھے، اس نے باری باری سب کو دیکھا لیکن اس کے ان کہے سوال کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''ارمان بھائی اور امل بجو کہاں ہیں؟'' سلیمہ بیگم کے کڑے تیوروں کو نظرانداز کرتے ہوئے ریان نے ارمان اور امل کے بارے میں پوچھا۔

"وہاں ہی جہاں......"

"امی......" ایان نے ایک دم آگے بڑھ کر انہیں کچھ بھی کہنے سے روکا۔ ریان وہیں کمرے کے درمیان کھڑے سب کو دیکھ کر کچھ سمجھنے کی کوشش میں آنکھیں پھاڑے کھڑا تھا۔

"تم چلو کمرے میں ریان تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" ایان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"نہیں......" ریان نے اس کا ہاتھ جھٹک کر ضدی لہجے میں کہا۔

"مجھے بتائیں ارمان بھائی اور اہل بجو کہاں ہیں؟" ریان سب کے چہرے پڑھنے کی کوشش کرنے لگا تھا، اسے احساس ہونے لگا تھا کہ کچھ ایسا ہوا ہے جو بے حد افسوس ناک ہے۔

"تم چلو میرے ساتھ میں بتاتا ہوں تمہیں کہ ارمان اور اہل کہاں ہیں۔" ایان نے تنبیہہ نظروں سے سلیمہ بیگم کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا، ابینہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، فوزیہ بھی دم سادھے کھڑی تھی، سلیمہ بیگم کرخت انداز میں بیٹھی تھیں، سفا کی ان کے چہرے پر عیاں تھی، ریان کے لیے سلیمہ کا رویہ ناقابل یقین تھا۔

"نہیں ایان بھائی مجھے بتائیں اور یہاں ہی بتائیں کیا ہوا ہے، کہاں ہیں ارمان بھائی، وہ ٹھیک تو ہیں ناں، اہل بجو کہاں ہیں، کیا امی نے کچھ کہا اہل بجو سے اور وہ ناراض ہیں؟" ریان نے بہ مشکل خود کو سنبھال کر ایان کے ساتھ ساتھ باقی سب کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امی نے کچھ کہا؟ ہاں یہ ٹھیک کہا۔ میں ہی تو کہتی ہوں جو بھی ہوتا ہے۔" ریان کی بات پر سلیمہ بیگم جیسے پھٹ پڑیں۔

"نہیں امی اس کا یہ مطلب نہیں تھا اللہ کا واسطے اب بس کریں دیکھیں اس کی حالت۔" ایان نے انتہائی جھنجلاہٹ سے سلیمہ بیگم کو کچھ بھی مزید کہنے سے منع کیا۔

"ایان بھائی۔ ابینہ بجو کیوں رو رہی ہیں؟" ریان کی نظریں باری باری سب کے چہروں پر ٹھہر رہی تھیں۔

"ریان تم بیٹھو ادھر۔" ایان نے فرحان کو اشارہ کیا کہ اسے بٹھائے فرحان نے اسے پکڑ کر صوفہ پر بٹھایا۔ دونوں بھائی اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

"ریان......" ایان نے کہنا شروع کیا لیکن اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔ ریان دھواں دھواں چہرے اور بوکھلائے انداز میں باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا ایان بھائی؟" ریان کے پورے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی، اسے اپنی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔

"سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں اسے کہ اس کی وجہ سے......"

"امی آپ خاموش رہیں۔" سلیمہ بیگم اتنی شدید غصے میں تھیں کہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ کیا کچھ کر گزرتی۔ اس سے پہلے کہ وہ سفاکانہ انداز کی حد پار کرتی ایان نے سختی سے انہیں منع کیا۔

"ریان اس ایکسیڈنٹ میں ارمان اور اہل ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔" ریان سکتے میں رہ گیا، اس سے کچھ بولا گیا نہ کوئی آواز نکلی۔

"اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے مجھ سے میرا بیٹا چھین لیا ہے۔" الزام تھا کہ اس کی سماعتوں میں کوئی بم پھوڑا گیا تھا جس نے اس کی ذات کو کرچی کرچی کر دیا تھا۔

ایان نے قہر آلود نظروں سے سلیمہ بیگم کو دیکھا جو بالآخر اپنی بھڑاس نکالنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ وہ اٹھیں اور ریان اپنے حواسوں پر قابو نہ رکھ پایا اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔

(ان شاءاللہ اگلی قسط آئندہ شمارے میں)

"آؤ آؤ فریدہ آج کیسے آنا ہوا؟" سعیدہ بیگم نے رشتے والی فریدہ بوا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس آپا آج پڑوس میں گئی تھی جمیلہ کے گھر اس کی بیٹی کے رشتے کے سلسلے میں تو سوچا تم سے بھی ملتی جاؤں۔" فریدہ بوا نے چادر اتارتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا کیا فریدہ جو چکر لگا لیا کافی دنوں سے تم سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی۔" سعیدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس بہن کیا بتاؤں۔" فریدہ بوا نے بھی اپنی بھڑاس نکالی۔ "دن بہت مصروف گزرتا ہے فرصت ہی نہیں ملتی آج بھی جمیلہ کے کہنے پہ آئی تھی اس کو دو تین رشتے بتائے تھے اپنی نصرت کے لیے اک رشتہ پسند آیا ہے ان کو کہہ رہی تھی کہ لڑکے والوں کو کہوں کہ کسی دن چکر لگا کے نصرت کو دیکھ جائیں۔" وہ تفصیل سے سعیدہ بیگم کو بتا رہی تھیں۔

"اچھی بات ہے اللہ پاک سب بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔" سعیدہ بیگم نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"صاعقہ...... بیٹا بوا آئی ہیں جلدی سے شربت بنا لاؤ۔" انہوں نے اپنی بیٹی کو آواز دی۔

"تم بتاؤ سعیدہ، صاعقہ کے لیے کیا سوچا؟ اب تو خیر سے یونیورسٹی کے آخری سال میں آ گئی ہے۔ کب اس کے فرض سے سبکدوش ہو رہی ہو، کوئی رشتہ ہے نظر میں تمہارے؟" فریدہ بوا نے سعیدہ سے استفسار کیا۔

"بوا ابھی تک تو کوئی نہیں میری تو بس رب سے یہی دعا ہے کہ جیسے میری صائمہ کا نصیب کھل گیا ایسے ہی میری صاعقہ کو بھی اک پڑھا لکھا اعلیٰ ڈگری یافتہ لڑکا مل جائے اور تم دیکھو ماشاءاللہ سے میری بچیاں خود بھی تعلیم یافتہ ہیں جیسے صائمہ نے یونیورسٹی سے ڈگری لی اسی طرح اب صاعقہ بھی

یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"دعا ہے کہ سلیم میاں ہی کی طرح کوئی ڈگری یافتہ لڑکا مل جائے تو میں اپنے اس فرض سے بھی فارغ ہوجاؤں۔" سعیدہ بیگم نے فریدہ بوا سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ارے سعیدہ تو تم اپنے داماد سلیم میاں کو کیوں نہیں کہتیں کہ وہ اپنے جاننے والوں میں سے ہی کسی کو اپنی صاعقہ کے رشتے کا کہیں کیونکہ اپنے محلے میں تو تم سب کو جانتی ہی ہو کالج کے بعد بمشکل ہی کوئی یونیورسٹی تک پہنچا ہوگا۔ سلیم میاں جیسا پڑھا لکھا اعلیٰ ڈگری یافتہ لڑکا مشکل سے ہی ملے یہاں تو سب کے اپنے اپنے کاروبار ہیں۔" فریدہ بوا نے سعیدہ کو حقیقت سے روشناس کرایا۔

فریدہ بوا کی بات سن کر انہوں نے سوچا کر بیٹی اور داماد سے بات کرنے کا تہیہ کرلیا۔

❁......❁......❁

سعیدہ بیگم اور عبدالجبار صاحب کی دو ہی بیٹیاں تھی صائمہ اور صاعقہ۔ شروع میں سعیدہ بیگم کو بیٹا نہ ہونے کا دکھ تھا لیکن عبدالجبار صاحب کی محبت اور بیٹیوں کی بہترین پرورش نے یہ غم بھلا دیا۔ عبدالجبار صاحب خود مقامی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ متوسط گھرانے سے تعلق کے باوجود اور اپنی محدود آمدنی میں انہوں نے دونوں بچیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔

❁......❁......❁

"صاعقہ کے ابا...... آج اپنے پڑوس میں سے اکرم علی کی بیوی ساجدہ آئی تھی۔" سعیدہ بیگم نے شوہر کو کھانا دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا وہ اکرم علی جس کا بیٹا اب اسٹور پر بیٹھتا ہے؟" عبدالجبار صاحب نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں وہی۔" سعیدہ بیگم نے جواب دیا۔

"خیریت...... کیا کہہ رہی تھیں؟" عبدالجبار صاحب نے پوچھا۔

"وہ آج اپنے بیٹے عادل کے لیے صاعقہ کا رشتہ لائے تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ انہیں اپنی صاعقہ بہت پسند ہے، انہیں ایسی ہی بہو چاہیے جو صرف پڑھی لکھی نہیں بلکہ سلجھی ہوئی بھی ہو تاکہ وہ ان کے گھر اور آنے والی نسلوں کو سنوار سکے۔" سعیدہ بیگم نے عبدالجبار صاحب کو جواب دیا۔

"لڑکا تو بہت اچھا ہے بیگم، نیک و شریف ہے، اپنا کماتا ہے اور اپنے ہی محلے کا ہے، اپنا گھر بار ہے، اچھا ہے ناں صاعقہ اپنے محلے میں رہے گی تو کم از کم آجا تو سکے گی ورنہ میں تو صائمہ کی شکل دیکھنے کو ترس گیا ہوں، کبھی سلیم میاں کچھ کہہ کر ٹال دیتے ہیں تو کبھی کچھ...... اور ویسے بھی عادل بیٹا کے بارے میں زیادہ چھان بین بھی نہیں کرنی پڑے گی یہ بچہ تو آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا ہے۔" انہوں نے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد نہیں سلیم میاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کتنی مشکل ہوئی تھی وہ تو شکر تھا کہ اکبر صاحب کے ان کے والد سے اچھے مراسم تھے اس لیے رشتہ کرتے وقت اطمینان تھا اور رشتہ ہوا بھی ان ہی کے توسط سے تھا۔" عبدالجبار صاحب نے اپنے اسکول کے پرنسپل کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "اور ویسے بھی رشتوں کو ٹھکرانا مناسب نہیں ہوتا خاص کر خلوص سے آئے ہوئے رشتوں کو۔" عبدالجبار صاحب نے کہہ کر کھانا ختم کرکے ہاتھ اٹھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

"وہ تو ٹھیک ہے عبدالجبار صاحب لیکن......"

"لیکن کیا بیگم...... آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"آپ خود دیکھیں ناں، ان کا عادل انٹر پاس ہے جبکہ اپنی صاعقہ ماسٹرز کررہی ہے، میری تو دعا ہے اپنی صاعقہ کو بھی سلیم میاں جیسا اعلیٰ ڈگری یافتہ جیون ساتھی ملے تاکہ وہ بھی صائمہ کی طرح خوش رہ سکے اور دونوں بہنوں میں کوئی فرق نہ ہو۔" سعیدہ بیگم نے اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا۔

"کیسی بات کرتی ہو بیگم؟ ہر بچی کا اپنا نصیب ہوتا ہے، سب کو ایک جیسی چیز نہیں مل سکتی۔ دعا کرنی چاہیے کہ بچیاں خوش رہیں۔ ڈگریاں خوشیوں کی ضمانت نہیں ہوتیں اور ویسے بھی میرے نزدیک کسی ڈگری سے زیادہ انسان کا اخلاق اہمیت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے ہی وہ عزت پاتا ہے......" عبدالجبار صاحب نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو ڈگری والے کو دنیا کی زیادہ سمجھ بوجھ ہوگی وہ ہماری بٹی کو زیادہ اچھے سے خوش رکھ سکے گا اور کم از کم آپ تو ڈگری کے بارے میں ایسا نہ کہیں۔ خود آپ ہیڈ ماسٹر ہیں لاکھوں بچوں کو تعلیم کی اہمیت سے روشناس کراتے ہیں۔" سعیدہ بیگم نے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں ڈگری کے خلاف نہیں بیگم مگر ڈگری کا مقصد شعور دینا ہے یہ نہیں کہ انسان دوسروں کو خود سے کمتر سمجھے، کیا تم نے کبھی سلیم میاں کے لب و لہجے پر غور نہیں کیا؟ جب بھی آتے ہیں ایسے باور کراتے ہیں جیسے ہماری سات نسلوں پر احسان کررہے ہیں۔" عبدالجبار صاحب نے بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہاں تو آپ کے یا میرے خاندان میں دور دور تک کوئی ایسا لڑکا ہے جو ایسی اعلیٰ ڈگری والا ہو؟"

"تو پھر آپ اپنی تسلی کے لیے صائمہ سے کہیے کہ سلیم میاں سے بات کرے کہ وہ کوئی اچھا سا رشتہ دیکھیں اپنی صاعقہ کے لیے کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ہمارے لیے ایسا کچھ کریں گے۔" عبدالجبار صاحب نے بیوی کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں صائمہ سے کہہ چکی ہوں لیکن وہ کہتی ہے کہ سلیم میاں کہتے ہیں ہم جس محلے میں رہتے ہیں وہاں ان کے دوست رشتہ کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کریں گے اور وہ اپنے دوستوں کے آگے شرمندہ نہیں ہونا چاہتے۔" سعیدہ بیگم نے افسردہ لہجے میں شوہر کو اپنے داماد کے خیالات بتائے۔

"اس لیے کہتا ہوں کہ اکرم علی کا گھرانا سلجھا ہوا ہے۔ لڑکا اچھا کماتا ہے، اپنی دکان ہے۔ وہ تو اکرم علی کو دل کا مسئلہ ہے اس لیے عادل کو دکان سنبھالنی پڑی ورنہ یقیناً وہ لڑکا آگے پڑھ کر کوئی نہ کوئی ڈگری ضرور لیتا اور ویسے بھی بات اگر ڈگری کی ہے تو عمر کے کسی بھی حصے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔" وہ انہیں سمجھاتے ہوئے بولے۔

"آپ اس معاملے پر ایک دفعہ سوچیے گا۔ خیر میں ذرا چہل قدمی کر کے آیا۔ آج لگتا ہے بہت کھالیا ہے۔" یہ کہہ کر عبدالجبار صاحب باہر چلے گئے۔

"لیکن میں کیا کروں اپنے دل کا جو کسی صورت یہ نہیں مانتا کہ اک داماد ایم بی اے پاس، شہر کی مشہور کمپنی میں اچھے عہدے پر ہو اور اک انٹر پاس اور دوکان دار۔ اے میرے رب تو ہی میری مدد فرما اور مجھے سیدھا راستہ دکھا۔" سعیدہ بیگم دل ہی دل میں دعا کرنے لگیں۔

❁ ❁ ❁

"خالہ سعیدہ، ماسٹر عبدالجبار کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔" محلے کے اک بچے نے اطلاع دی۔

"کیا...... کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟ ابھی ابھی تو وہ اسکول کے لیے نکلے تھے اور ایکسیڈنٹ؟" سعیدہ بیگم نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"خالہ پریشان نہ ہوں بس بازو اور ٹانگ پر چوٹیں لگیں ہیں محلے والے انہیں قریبی اسپتال لے گئے ہیں۔" بچے نے سعیدہ بیگم کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"یا میرے اللہ رحم کرنا۔" سعیدہ بیگم نے دعا کرتے ہوئے کہا۔

"صاعقہ بیٹا ذرا مجھے صائمہ سے فون پر بات کرادو اور تم آج یونیورسٹی مت جاؤ تمہارے ابو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔"

"خیریت امی...... کیا ہوا ابو کو؟" صاعقہ جو یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہورہی تھی فوراً پریشان ہوئی۔

"ہاں بس اللہ خیر کرے گا تم مجھے فون ملادو تاکہ میں سلیم میاں کے ساتھ تمہارے ابو کے پاس اسپتال جاؤں اور صائمہ تمہارے ساتھ رک جائے۔" سعیدہ بیگم نے جواباً کہا۔

"امی میں چلتی ہوں آپ کے ساتھ......" صاعقہ نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم گھر پر رکو ہم اکیلی عورتیں کہاں خوار ہوتی پھریں گی۔ تم فون ملادو مجھے۔"

"ٹھیک ہے امی میں کال ملاتی ہوں۔" وہ نمبر ڈائل کرنے لگی۔

"ہیلو بیٹا صائمہ۔" سعیدہ بیگم نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"امی سب خیریت ہے ناں؟ آپ نے آج اتنی صبح صبح

فون کیا ہے۔" صائمہ نے حیرانگی کے عالم میں پوچھا۔
"ہاں بیٹا بات ہی کچھ ایسی ہے تمہارے ابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔تم سلیم میاں کے ساتھ آجاؤ بیٹا تاکہ میں ان کے ساتھ تمہارے ابا کے پاس جاسکوں۔ وہ اسپتال کے معاملات کو دیکھ لیں گے اور تم بہن کے پاس رک جانا۔اس سے مجھے بھی تسلی رہے گی۔" سعیدہ بیگم نے بیٹی سے پریشانی کے عالم میں کہا۔
"ہاں ہاں...... امی ابا ٹھیک تو ہیں ناں؟ میں ابھی سلیم سے کہتی ہوں۔" صائمہ نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"سلیم...... سلیم۔" صائمہ نے وہیں فون ہاتھ میں پکڑے اپنے شوہر کو آواز دی۔
"کیا مسئلہ ہے چیخ کیوں رہی ہو؟" سلیم نے کہا۔
"وہ ابا کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے آپ مجھے اور امی کو اسپتال لے کر جائیں امی بہت پریشان ہو رہے ہیں۔"
"اوہ اچھا...... پر ابھی تو میرے پاس بالکل ٹائم نہیں ہے پہلے پتا ہوتا تو الگ بات تھی۔"
"سلیم کیسی باتیں کررہے ہیں آپ؟ بھلا کوئی ایکسیڈنٹ بتا کر ہوتا ہے؟"
"خیر جو بھی ہے تم آنٹی سے کہو کہ وہ خود چلی جائیں ویسے بھی تمہارا گھر یہاں سے تقریباً اک گھنٹے کی مسافت پر ہے پہلے میں تمہیں تمہارے گھر لے جاؤں پھر آنٹی کو اسپتال۔ اچھا ہے کہ ابھی آنٹی خود چلی جائیں یوں وہ جلدی پہنچ جائیں گی۔ہم شام میں وہاں چلے جائیں گے۔" سلیم نے دوٹوک جواب دیا۔
ادھر سعیدہ بیگم جو اپنے داماد کی ساری باتیں سن چکی تھیں انہوں نے خاموشی سے فون رکھ دیا کیوں کہ ان کے پاس بولنے کو کچھ بچا ہی نہیں تھا اور خاموشی سے آکر کرسی پر بیٹھ گئیں۔
"کیا ہوا امی؟" صاعقہ نے ماں کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔
"آپی آرہی ہیں ناں؟" لیکن سعیدہ بیگم نے جیسے اپنی بیٹی کی بات سنی ہی نہیں تھی اب وہ موبائل پر کوئی نمبر ملانے لگی تھیں۔
"جی بہن میں سعیدہ بات کررہی ہوں۔ نہیں خیریت نہیں، وہ عبدالجبار صاحب کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے میں اسپتال جارہی تھی اگر تب تک آپ صائمہ کے پاس رک جاتیں تو مجھے تسلی رہتی۔ ارے نہیں بہن اس کی ضرورت نہیں آپ کا بہت شکریہ۔"
"کیا ہوا امی آپ کس سے بات کررہی تھیں؟" صاعقہ جو خاموشی سے ماں کو دیکھ رہی تھی ان کے فون رکھتے ہی پوچھا۔
"عادل آرہا ہے ٹیکسی لے کر میں اس کے ساتھ اسپتال جارہی ہوں۔ دس پندرہ منٹ میں آجائے گا۔ تب تک تمہارے ساتھ ساجدہ بھابی ہوں گی۔" سعیدہ بیگم نے بیٹی کو جواب دیا۔
"تم اندر الماری سے میری چادر لے آؤ اور دعا کرنا اپنے باپ کے لیے کہ وہ خیریت سے گھر آئے تاکہ ہم تمہارے فرض سے بھی سبکدوش ہوسکیں۔" سعیدہ بیگم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"امی یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں اس وقت؟" صاعقہ نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔
"تم نہیں سمجھو گی صاعقہ یہی تو وہ وقت ہے جب میرے مالک نے میری آنکھیں کھول دیں ڈگری کی لالچ میں، میں اک ہیرے کو ٹھکرانے جارہی تھی پر آج مجھے سمجھ آگئی کہ اصل چیز یہ نام نہاد ڈگری نہیں بلکہ اصل خوبی اور بڑائی تو انسان کا اخلاق ہوتا ہے۔اچھی تربیت ہے اور دردمندی ہے۔ بعض دفعہ بہت سے ڈگری یافتہ نام کے پڑھے لکھے سطحی لوگ اندر سے بھی کتنی پستی کا شکار ہوتے ہیں یہ آج مجھے پتا چل گیا ہے اور شکر ہے میرے اللہ کا کہ میری بیٹی کا نصیب ایسی جگہ کھل رہا ہے جو بھلے تعلیم میں کم ہیں لیکن ان لاکھوں سے بہتر ہیں جو اپنی ڈگری کے زعم میں اپنے رشتوں کو بھول بیٹھے ہیں۔" سعیدہ بیگم نے مطمئن انداز میں فیصلہ کرتے ہوئے کرسی سے سر ٹکا دیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

قسط نمبر آٹھ

گزشتہ قسط کا خلاصہ

ہسپتال کی تاریک اور سرد راہ داری میں عورت کی چیخیں گونج رہی ہیں جو تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔اس کا شوہر بچی کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔

لامیہ سڈنی یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوتی ہے۔اذلان اس کا پھوپوزاد ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین دوست بھی ہوتا ہے۔
دوسری طرف طیبہ حیدر شاہ کو ان دونوں کی دوستی ناپسند ہوتی ہے اور وہ انہیں دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔

سفید حویلی میں احمد علی چٹھہ کا حکم چلتا ہے۔نور بی بی مزاج کی نرم ہونے کے باعث علاقے کی عورتوں کے مسائل حل کرنے میں مصروف رہتی ہیں اور نور العین اکثر ان کے ساتھ رہتی ہے۔

عبدالودود علی چٹھہ سفید حویلی کا بگڑا ہوا سپوت ہوتا ہے جو اپنی من مانی کرنے کا قائل ہوتا ہے جب کہ دوسری طرف تاشفین علی چٹھہ وکالت کے شعبے میں نام پیدا کر چکے ہوتے ہیں۔

مجتبیٰ شہر سے سفید حویلی آتا ہے اور راستے میں عزت نامی لڑکی سے گاڑی ٹکرا جاتی ہے۔عزت لاہور کی اندرونی گلیوں میں اپنی ماں رشیدہ بی بی کے ساتھ رہتی ہے اور ان کے تعلقات صرف میمونہ خالہ تک ہی محدود رہتے ہیں۔

حازم شفیق عزت کے لیے نرم جذبات رکھتے ہیں لیکن یہ راز ابھی ان کے سینے میں ہی دفن رہتا ہے۔

اب آگے پڑھئے

اس کے دروازے پہ ہونے والی دستک انجان تھی۔ وہ بستر پہ نیم دراز تھا لیکن ایک دم چونک کر دروازے کی طرف متوجہ ہوا۔اس نے ایک نظر ہاتھ پہ بندھی گھڑی کی طرف دیکھا جس پہ رات کے نو بجے کا وقت نظر آ رہا تھا۔

''آجاؤ۔'' وہ بلند آواز میں بولا اور منتظر نظروں سے دروازے کی جانب دیکھنے لگا تھا آنے والے کو دیکھ کر چونکا۔ یہ تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

''بڑی امی......! آپ کیوں آئیں؟ آپ نے مجھے بلا لیا ہوتا۔'' وہ حیران سا ہو کر اٹھ کھڑا ہوا اور احترام کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے انہیں تھاما اور بستر تک لایا۔

''میں نے سوچا آج خود اپنے بیٹے سے ملا جائے۔'' سفید دوپٹے کے ہالے میں چمکتا چہرہ اسے بہت معتبر محسوس ہوا اور ان کے جواب نے اسے بے پناہ خوشی سے ہمکنار کیا۔

''بڑی امی، آپ کی خواہش سرآنکھوں پہ لیکن خود کو ہلکان نہیں کرنا چاہیے تھا۔آپ پہلے ہی سارا دن عورتوں کے مسائل میں الجھی رہتی ہیں، حویلی کے حالات پہ نظر رکھتی ہیں۔آپ خود کو اتنا نا تھکایئے بلکہ اپنا بہت زیادہ خیال رکھا کریں۔'' وہ ان کے پہلو میں بیٹھا، ان کے ہاتھ کو دباتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

''میرے بچے میں خود کو بالکل ہلکان نہیں کرتی اس لیے تم فکر مند نہ ہوا کرو۔'' انہیں اس کی فکرمندی پہ بہت پیار آیا۔

''اب تو تم بھی ماشاءاللہ تاشفین کی طرح ذمہ دار ہوگئے ہو۔تمہاری ماں تمہارے متعلق بہت فکرمند رہتی تھی لیکن تمہارے بدلتے رویے نے اسے پرسکون کردیا ہے۔'' بات کے اختتام پہ وہ مسکرائیں۔

''میرا تو اب بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن امی اور ابو نے بڑے ابا سے نا جانے کون کون سی شکائتیں لگائی کہ اب انہیں میری ایک لمحے کی تاخیر برداشت نہیں ہوتی۔ میں کہاں آزاد پرندہ اور اب آپ کے حضور کی قید میں پھنس گیا ہوں۔'' وہ ان کے ساتھ آفس کی زیادہ باتیں نہیں کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ انہیں اس کے خیالات کی ذرہ بھر بھنک پڑ جاتی تو اس کے سارے ارادے ریت کا ڈھیر ثابت ہوتے۔

''اس معاملے میں تمہاری حمایت بالکل نہیں کروں گی۔تمہاری ماں کی فکرمندی بالکل جائز ہے۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی تو وہ جواباً مسکرا کے رہ گیا۔

''مجتبٰی جب سے گیا ہے اس سے دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی۔ کیا تمہارا اس سے رابطہ ہے؟'' انہوں نے اچانک باتوں کا رخ بدلا تو وہ چونکا۔وہ جو سوچ رہا تھا کہ بڑی امی کو یقیناً کوئی بات یہاں تک کھینچ لائی ہے وہ خیال درست ثابت ہوا۔

''جی...... کچھ دن پہلے بات ہوئی تھی، مصروف ہوگا اسی لیے رابطہ نہیں کر پایا ہوگا۔آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔'' وہ ان سے بات نہیں پوچھ سکتا تھا اسی لیے فقط تسلی دینے پہ اکتفا کیا۔''آپ کہیں تو میں ابھی آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔'' اس نے جھٹ سے فون اٹھایا۔

''نہیں...... رہنے دو۔'' یہ انکار نہ جانے کیوں اسے افسردہ کر گیا۔

وہ شاید کہنے یا نہ کہنے کی کشش وپنج میں گرفتار تھیں اور ان کے وجود میں چلتی اس جنگ کو وہ قریب سے دیکھ رہا تھا۔اتنا تو سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات تھی جو انہیں یہاں تک لے آئی ورنہ معمولی باتوں کو انہوں نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔

''بڑی امی...... آپ کو جو بھی بات پریشان کررہی ہے آپ وہ بلا جھجک مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔آپ کا پوتا آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔'' وہ ایک دم ان کے سامنے بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے اتنے پریقین لہجے میں بولا کہ ان کے لبوں پہ مدہم مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہلکی سی نمی جھلکنے لگی تھی۔

''میں نور کے متعلق بہت فکرمند ہوں۔'' انہوں نے بولنا شروع کیا۔''اب اس حویلی میں زیادہ رہنا اس کے لیے اچھا نہیں

ہے۔ اسی لیے میں چاہ رہی ہوں اسے اپنی زندگی میں کسی ایسے انسان کے سپرد کردوں جو اس کی آنکھوں سے آنسو چن کر مسکراہٹ بکھیر دے۔‘‘

’’نور کے لیے اس حویلی سے زیادہ محفوظ جگہ بھلا کون سی ہوسکتی ہے؟‘‘ وہ ان کی بات بالکل نہیں سمجھ پایا تھا۔

’’میرے بچے...... لڑکیوں کو ہمیشہ ماں باپ کا گھر چھوڑ کے جانا ہوتا ہے، یہ تو دنیا کا دستور ہے اور ایسے ہی چلتا رہے گا۔ کسی بادشاہ کی بیٹی ہو یا فقیر کی ایک مقرر وقت سے زیادہ بابل کے دیس نہیں رہتی اور ویسے بھی ان کا گھر تو وہ ہوتا ہے جہاں ان کا نصیب انہیں لے جاتا ہے۔ جہاں کی چار دیواری انہیں وہ تحفظ دیتی ہے جو دنیا کی پیاری سے پیاری اور محفوظ ترین عمارت بھی مہیا نہیں کرسکتی۔‘‘ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں اسے بتارہی تھیں کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں۔

’’آپ اس کی شادی کے متعلق سوچ رہی ہیں؟‘‘ وہ حد درجہ حیران ہوا۔ اس نے یہ کب سوچا تھا کہ ایسا وقت بھی آئے گا جب اس حویلی کے خاموش کردار کو حویلی سے دور کردیا جائے گا۔

’’ایسا ایک نا ایک دن تو ہونا ہے۔‘‘ انہوں نے اس کی بات کی تائید کی۔

’’آپ کیا چاہتی ہیں؟‘‘

’’مجتبیٰ ایک سلجھا ہوا لڑکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کا ساتھ نور کو مل گیا تو میری بچی بہت خوش رہے گی۔ اس کی زندگی کی ساری محرومیوں کا ازالہ ہوجائے گا اور یہ سب کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔‘‘ انہوں نے منتظر نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس کے وجود میں سوال و جواب کی عجیب جنگ شروع ہوگئی تھی۔ وہ کئی ان کہے سوال جو سالوں سے اس نے اپنے وجود میں دبا رکھے تھے اب باہر اُمڈنے کو بے تاب تھے لیکن مقابل کی حالت اسے یہ اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ ایسا کچھ سوچے۔ وہاں سے صرف ’’ہاں‘‘ سننے کے لیے سوال کیا گیا تھا اور یقین تھا کہ یہاں سے ملنے والا جواب من پسند ہوگا۔

’’آپ جو چاہیں گی میں وہ کروں گا بڑی امی۔ میں ہر طرح سے آپ کے لیے حاضر ہوں۔‘‘ اس نے سارے سوال واپس سوچ کی پٹاری میں ڈالے اور پورے یقین سے ان کے ہاتھوں پہ گرفت مضبوط کی۔

’’میں چاہتی ہوں تم مجتبیٰ سے ملو۔ اس سے نور العین کے متعلق بات کرو، وہ اس کے متعلق کیا سوچتا ہے یہ جاننے کی کوشش کرو۔‘‘ انہوں نے پرامید نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

’’آپ فکر نہ کریں۔ میں اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔‘‘ وہ ان کی باتوں سے اُلجھ کر رہ گیا تھا۔

’’ایک بات کا دھیان رکھنا کہ یہ باتیں تمہارے اور میرے درمیان رہیں۔ حویلی میں کسی کو بھی بھنک نہیں لگنی چاہیے۔‘‘ وہ حد درجہ محتاط تھیں اور اسے بھی اسی بات کی تلقین کررہی تھیں۔

’’میں احتیاط کروں گا۔‘‘ وہ اٹھ کر ان کے ساتھ بیٹھ گیا اور انہیں بانہوں میں بھرتے ہوئے اپنے ساتھ کا احساس کرایا۔

❁......❁......❁

اذلان کی چیخ نما آواز نے اس کو حواس باختہ کردیا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ کچھ انہونی ہوئی ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس نے پیچھے کی طرف دیکھنا چاہا لیکن مٹی کے غبار نے اس کی آنکھوں کو اس قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس لمحے وہ واقعی ڈر گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ اونچائی سے زیادہ کچھ اور بھی خوفناک ہے۔

’’لامیہ...... تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔‘‘ اسی لمحے اسے اپنے پہلو میں اذلان کی آواز سنائی دی تو سینے کے پنجرے میں پھڑ پھڑاتا دل پرسکون ہوا۔

’’یہ کیا ہورہا ہے؟ اتنی تیز طوفانی ہوا، یہ مٹی کا غبار اور کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔‘‘ اس کی آنکھیں کھولنے کی کوشش بار بار ناکام ہورہی تھی۔

’’یہ سمندر میں طوفانی ہواؤں کی وجہ سے ہورہا ہے۔ ہم لوگ اونچائی پہ ہیں اور ہوا اتنی تیز رفتار ہے کہ کھڑا ہونا خطرے سے خالی نہیں، راستہ خطرناک ہے اس لیے سب سے پہلے ہمیں کسی محفوظ جگہ پہ پناہ لینی ہوگی۔‘‘ وہ اسے پرسکون کرنے کے ساتھ

ساتھ بھرپور کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھول کر اردگرد دیکھ رہا تھا۔
''یہاں اردگرد کچھ بھی نہیں ہے۔تم کوئی محفوظ جگہ کیسے ڈھونڈو گے؟'' وہ ڈرنے کے ساتھ ساتھ جھنجھلائی۔ پرخار اور پتھریلے راستے پہ یوں لیٹے لیٹے اس کے بازو دکھنے لگے تھے۔
''میری بات دھیان سے سنو......ہم سے کچھ فاصلے پہ ایک بڑا پتھر ہے اور سمندر اس کے عقب میں ہے۔ہم اگر اس کی اوٹ میں ہوجائیں تو طوفانی ہوا سے قدرے محفوظ ہوسکتے ہیں۔ یہاں یوں لیٹے رہنا سراسر حماقت ہے کیونکہ کسی بھی وقت کوئی پتھر ہمیں زخمی کرسکتا ہے۔''
''لیکن ہم وہاں تک جائیں گے کیسے؟ یہاں چھوٹی بڑی سیڑھیاں ہیں، نیچے پتھر ہی پتھر اور آنکھوں میں اتنی مٹی گھس جانے کے ڈر سے میں دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کرپارہی۔''اس کی آواز بھرائی۔
''مجھے یہاں تمہارے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ جب جب تم میرے ساتھ ہوتے ہو ایک نئی مصیبت میری منتظر ہوتی ہے۔تم یہاں آئے ہی کیوں؟ کس نے تمہیں کہا کہ تم یوں ہمارے فیملی ٹرپ میں دخل اندازی کرو؟ میں نے کتنا منع کیا پاپا کو کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں جانا لیکن پاپا نے زبردستی بھیجا۔ مجھے سب سمجھ میں آرہا ہے کہ تم چاہتے ہی یہ تھے تب ہی تو ایک بار بھی منع نہیں کیا اور اب اس عذاب میں پھنسادیا۔'' وہ آنکھوں کو مسلتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔
''ہمیں یہاں سے چلنا چاہیے۔ ہوائیں تیز ہورہی ہیں اور کالے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا ہورہا ہے۔ بارش ہوگئی تو صورت حال مزید خراب ہوسکتی ہے۔'' ازلان نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔اس کے معتدل رویے نے لامیہ کو طیش دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن وہ اس وقت کچھ نہیں کرسکتی تھی۔
''مجھے واقعی کچھ نظر نہیں آرہا، میں کیسے آگے بڑھوں؟''اس کی بھیگی ہوئی آواز ازلان نے واضح محسوس کی۔
''یہ لو......''اس نے پانی کی بوتل لامیہ کی طرف بڑھائی۔''یہ پانی آنکھوں پہ ڈالو۔اس سے فرق پڑے گا۔''اس کی آنکھوں میں جتنی شدید جلن ہورہی تھی اس نے لمحے کا توقف نہیں کیا، وہ یوں ہی لیٹے لیٹے پانی کے چھینٹے آنکھوں پہ مارنے لگی اور کتنی ہی بار ایسا کرنے کے بعد اس کی آنکھیں تھوڑا کھلنے کے قابل ہوئی تھیں۔ بوتل ازلان کو واپس پکڑاتے ہوئے اسے احساس ہوا اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے اور کپڑے گیلے ہونے کے باعث نیچے کی ساری مٹی اس سے چپک گئی تھی۔
''لامیہ......!''اس کے آرام سے پکارنے پہ نا چاہتے ہوئے بھی وہ مندی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔
''آنکھوں کے گرد ہاتھوں کا حصار بنالو، تھوڑا راستہ دیکھو اور آنکھیں بند کرتے ہوئے بازوؤں کے بل چلو۔اس طرح کرنے سے ہم اس پتھر تک پہنچ جائیں گے لیکن یہ خیال بھی رکھنا کہ یہاں پتھر بہت نوکیلے ہیں۔''اس نے مکمل تفصیل سے آگاہ کیا لیکن لامیہ کے تاثرات سے اسے بالکل اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ وہ سمجھی ہے یا نہیں۔
لامیہ نے اس کی ساری باتیں سنی اور نہ چاہتے ہوئے بھی خود کو یہ سب کرنے کے لیے آمادہ کیا کیونکہ کالے بادلوں کا جھنڈ وہ دیکھ چکی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اور گیلے کپڑوں کی وجہ سے سردی محسوس ہونے لگی تھی۔اس نے ایک لمبی سانس لی اور ازلان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق آنکھوں کے گرد ہاتھوں کا حصار بناتے ہوئے آگے کا راستہ دیکھا۔مٹی کے شدید غبار کے باعث اسے صرف دو تین سیڑھیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔اس نے بازوؤں اور ٹانگوں کے بل ازلان کے پیچھے چلنا شروع کیا اور دوسری سیڑھی پہ ہی اس کے بازو میں کچھ چبھ گیا تھا لیکن اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے تکلیف کا اظہار نہیں کیا۔
''سب ٹھیک ہے ناں؟''اس کے رکنے کا احساس ہونے پہ ازلان نے پوچھا تو وہ بنا جواب دیے دوبارہ آگے بڑھنے لگی۔ اسی لمحے پہلی بوند اس کے چہرے سے ٹکرائی تھی۔ عام حالات ہوتے تو اس لمحے اس کی خوشی دیدنی ہوتی لیکن یہاں پہلے قطرے نے ہی اس کے وجود کو خوف کے آسیب میں لپیٹ لیا تھا۔ بارش کی رفتار تیز ہوجاتی تو پہاڑوں سے پانی کی رفتار کے ساتھ پتھر گرنے لگتے اور اس کے ساتھ سردی کی شدت میں اضافہ ہوجانا تھا۔
''اب گرد بیٹھنے لگے گی اور ہمیں راستہ صاف نظر آنے لگے گا۔ بارش تیز ہونے سے پہلے ہم پہاڑ کی اوٹ میں پہنچ جائیں

گے۔'' اذلان شاید اس کے ڈر کو جان گیا تب ہی فوراً سے وضاحت دینے لگا۔
لامیہ نے صرف اثبات میں سر ہلایا کیونکہ اسے اپنے بازو شل ہوتے محسوس ہورہے تھے۔ پتھریلے راستے نے اس کے بازو اور گھٹنے یقیناً زخمی کردیے تھے۔ کچھ لمحے بعد گرد بیٹھنے لگی کیونکہ انہیں اب وہ پہاڑ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اذلان نے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا جیسے کہہ رہا ہو دیکھا میں نے ٹھیک کہا تھا۔ گرد کے کم ہوتے اور راستہ کچھ صاف نظر آنے پہ اذلان تھوڑا سا اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا ہاتھ لامیہ کی طرف بڑھا دیا، اس نے نافہم نظروں سے اسے دیکھا لیکن بنا کوئی سوال کیے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اسے یہ لمحات غنیمت لگے اور وہ ان سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی سوچ رہا تھا۔ وہ یوں ہی کمر جھکائے تیز تیز آگے بڑھنے لگا، لامیہ نے اس کی پیروی کی اور اس کا ساتھ دینے کے لیے جسم میں اٹھنے والے درد کو نظر انداز کردیا۔ وہ چند لمحوں میں پہاڑ کی اوٹ میں پہنچ گئے لیکن بارش کی شدت بڑھ چکی تھی۔ بارش کی تیز رفتاری سے آنکھوں کے آگے قطروں کی چادر بچھ گئی تھی۔ وہ پریشان نگاہوں سے اردگرد دیکھنے لگا۔ طوفان کے سامنے اسے یہ پہاڑ اپنے بچاؤ کا ذریعہ لگا لیکن بارش نے ایک نئی مصیبت کھڑی کردی تھی۔ بارش کی تیز رفتاری نیچے کی طرف پانی کے بہاؤ کو تیز کردیتی اور یوں ان کا یہاں رکنا مشکل ہوجاتا اور اگر بارش تیز نہ ہوتی تو سردی ان کے لیے مصیبت کھڑی کردیتی۔ آگے بڑھنا مشکل تھا جب کہ نیچے جانا ناممکن تھا۔ وہ پہاڑ کی اوٹ سے نکل کر تھوڑا آگے ہوا کہ شاید کوئی آسرا مل جائے اور اسی لمحے پہاڑ سے سرکتے ہوئے کچھ پتھروں میں سے ایک پتھر اس کے سر پہ آن لگا۔ لامیہ کی چیخ اور اذلان کے زمیں بوس ہونے میں لمحے کا توقف نہیں تھا۔

❁ .... ❁ .... ❁

وہ دونوں اس وقت کچہری کے ہجوم میں پھنسے ہوئے تھے۔ آج کا دن نہایت مصروفیت کا حامل تھا اور کئی ضروری امور نبٹانے کے بعد دوپہر ڈھلے انہیں فرصت نصیب ہوئی تھی۔ تاشفین چند ہم عصر وکلاء کے ساتھ گفتگو سے فارغ ہوئے تو متلاشی نگاہوں سے اردگرد دیکھنے لگے اور چند لمحات بعد ہی ان کی نگاہوں کی تلاش ختم ہوگئی۔ وہ انہیں تھوڑے فاصلے پہ کچہری کے احاطے میں لگے جامن کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا نظر آیا۔
''جناب عالی، آپ کس مراقبے میں گم ہیں؟'' وہ اس کے پیچھے آہستگی سے کھڑے ہوتے ہوئے اس طرح بولے کہ وہ چونک گیا۔
''میں اس درخت پہ لگے سارے جامن اپنے پیٹ کی غذا بنتے دیکھ رہا ہوں۔'' اس کا انداز اتنا سنجیدہ تھا کہ وہ ایک پل کو یہ نہیں سوچ سکے کہ مقابل شرارت پہ آمادہ ہے۔
''تم کبھی کبھی ندیدے پن کی انتہا کردیتے ہو۔ ویسے تمہارا پیٹ ہے یا کوئی کنواں جو پورے درخت کا پھل اس میں سما جائے گا؟'' وہ اس کے بالکل سامنے، بازو پہ سیاہ کوٹ رکھے، سوالیہ نگاہوں سے مخاطب تھے۔
''جب اس چھوٹے سے دل میں ایک درجن لڑکیاں سما سکتی ہیں تو اس پیٹ کے ساتھ ظلم کیوں کیا جائے؟'' اس نے اپنے پیٹ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اس انداز میں کہا کہ تاشفین کے لبوں کو بے ساختہ مسکراہٹ چھوگئی۔
''تم کہیں سے اس معتبر شعبے سے وابستہ نہیں لگتے۔'' انہیں اس وقت اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں سوجھا۔
''جی مجھے اندازہ ہے۔ اس وقت تو میں آپ کو انسان بھی نہیں لگ رہا اور واقعی میں انسان نہیں ہوں بلکہ اس درخت کے اصل باسی جو کہ ہزاروں سال پرانے ہیں، میرے جسم پہ قبضہ کرچکے ہیں اور مجھے ایسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے پہ مجبور کررہے ہیں۔'' اس کا یہ جواب پہلے سے بھی بڑھ کر تھا۔
''تم یہاں سے چلو، اس سے پہلے کہ میں تمہاری اونگی بونگی حرکتوں کے ساتھ ساتھ تمہیں بھی ٹھیک کردوں۔'' وہ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے احاطے سے باہر لے آئے۔
وہ بنا کسی مزاحمت کے مسکراتے ہوئے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ انہیں کبھی کبھار اس پہ کسی بچے کا گمان ہوتا تھا جو پہلے جی بھر کے ستاتا اور بعد میں لاڈ اٹھوانے کا متمنی ہوجاتا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑے پارکنگ ایریا تک آگئے۔
''کہاں جانے کا ارادہ ہے؟''

''آفس ہی جا رہا ہوں۔ تھوڑا کام ہے وہ کرنے کے بعد گھر کے لیے نکلوں گا۔'' وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکے تھے۔
''کبھی آفس کی جان چھوڑ بھی دیا کرو۔ میرے ساتھ چلو مجھے ایک کام ہے۔'' وہ مکمل دھونس جمانے والے انداز میں بولا اور مقابل کے ساتھ صرف وہ ہی ایسا بول سکتا تھا۔
''کچھ پتا تو چلے کیا کام ہے؟'' وہ شش و پنج کا شکار ہوئے۔
''داتا دربار پہ حاضری دینی ہے۔''
''تم کب سے وہاں جانے لگے؟'' وہ ازحد حیران ہوئے۔
''میں نہیں جانا چاہتا لیکن ماں جی کا خاص حکم آیا ہے۔ انہیں لگتا ہے ان کا ہونہار بیٹا کسی مشکل میں پھنسنے والا ہے سو مجھے وہاں صدقہ کرنے کے لیے اور اپنے پیچھے لگی بلاؤں کو ٹالنے کے لیے وہاں جانا ہے۔'' اس کا انداز سرسری سا تھا سو انہوں نے زیادہ بحث کرنے کی بجائے گاڑی کا رخ اس راستے کی جانب کر دیا۔
''شوکت صاحب کی کوئی خبر نہیں آئی؟'' انہوں نے کئی دنوں سے پکتی سوچ اس کے سامنے رکھی۔
''میں بھی یہ ہی سوچ رہا تھا ہمیں ان سے رابطہ کرنا چاہیے۔'' نبیل نے ان کی تائید کی۔
''میں نے میل کی تھی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ انہوں نے ایک نمبر دیا تھا میں سوچ رہا ہوں اسی پہ کال کی جائے۔'' ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس حوالے سے کافی فکر مند ہیں۔
''ویسے اس کام کے لیے اتنی سوچ و بچار کی ضرورت نہیں تھی لیکن اگر کہتے ہو تو کوئی کانفرس وغیرہ بٹھا لیتے ہیں۔'' نبیل درانی کے لیے سنجیدہ رہنا دنیا کا مشکل ترین کام تھا۔
''تم یہ چٹکلے چھوڑنے کا کیا لو گے؟''
''تمہاری جان......'' ان کے سوال کا جواب بے ساختہ دیا تھا۔
''تمہاری یہ خواہش تو پوری نہیں ہوسکتی۔'' دربار ان کے سامنے تھا سو گاڑی رک دی تھی۔
''میرے چٹکلے بھی ختم نہیں ہوسکتے۔'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔
''جناب عالی، آپ جائیے اور جلدی سے اپنا کام نبٹا کر آیئے۔'' تاشفین نے بحث ختم کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔
''تم نہیں آرہے میرے ساتھ؟'' وہ دروازہ کھولتے ہوئے رکا۔
''نہیں...... مجھے ایسی رش والی جگہوں سے کوفت ہوتی ہے۔'' ان کا انکار سنتے ہی وہ کندھے اچکاتے آگے بڑھ گیا۔
ان دونوں کا مزاج، عادات، فطرت کچھ بھی ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے تھے۔ مشرق و مغرب جیسا وقفہ ان کی سوچوں میں حائل تھا۔ اس سب کے باوجود انہیں وہ چلبلا، شوخ لڑکا بے انتہا عزیز تھا۔ وہ ہمیشہ انہیں عبدالودود جیسا لگتا تھا۔ ان کی سنجیدہ مزاج طبیعت میں اگر کوئی مزاح کا پھول اگا سکتا تھا تو بلاشبہ وہ نبیل درانی کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک سادہ و سلیٹ دیوار کی مانند اور وہ اس دیوار سے لپٹی ایک پھول دار بیل کی مثل تھا۔ وہ اسی کے متعلق سوچ رہے تھے کہ اچانک شفقت صاحب کا خیال ذہن سے آیا۔ انہوں نے فوراً سے موبائل نکالا اور وہ نمبر ڈھونڈنے لگے جو شفقت حسین نے اسے کسی ایمرجنسی کے لیے دیا تھا۔ وہ نمبر جلد ہی انہیں مل گیا اور لمحہ کی سوچ و بچار کرتے ہوئے انہوں نے کال ملائی۔
''زارا حسین اسپیکنگ۔'' قریب تھا کہ کال بند ہوجاتی کہ اچانک دوسری طرف سے آواز گونجی۔
ایک لمحے کے لیے وہ بھول گئے کہ انہیں کس سلسلے میں بات کرنی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکیوں سے بات کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ یہ نمبر کسی ملازم کا ہوگا لیکن دوسری طرف ان کی بیٹی تھی۔
''ہیلو......!'' دوسری طرف سے دوبارہ آواز آئی۔
''میں تاشفین علی چٹھہ بات کر رہا ہوں۔ مجھے شوکت سر کی طبیعت کے متعلق پوچھنا تھا۔'' انہوں نے بنا کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھے سیدھا مطلب کی گفتگو کی۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی اور ان کے لیے یہ خاموشی تعجب انگیز تھی۔
''ڈیڈی کی طبیعت سنبھل نہیں رہی اور اسی وجہ سے آپریشن نہیں ہو پا رہا۔'' دوسری طرف سے چند لمحے بعد جواب آیا اور

انہیں لگا کہ مقابل کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پائے کہ وہ تسلی کا کون سا لفظ ادا کریں جو اسے اطمینان دے سکے۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم سب یہاں ان کے لیے دعا گو ہیں۔''

''تھینک یو......'' وہ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ دوسری طرف سے آنے والا رسمی سا جواب انہیں خاموش کروا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کال کٹ گئی تھی۔ کچھ لمحے تو اتنے غیر مناسب رویے پہ حیران ہونے کے بعد انہوں نے کندھے اچکا دیے۔

وہ سیٹ سے ٹیک لگائے نبیل درانی کا انتظار کرنے لگے لیکن ان کے وجود میں شفقت حسین کی فکرمندی ڈیرہ ڈال چکی تھی۔ وہ ان کے محسن ہونے کے ساتھ ساتھ استاد بھی تھے سو ایسا ہونا فطری عمل تھا۔

❁......❁......❁

دوپہر ڈھلنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ حویلی میں اس وقت کوئی ہلچل نہیں تھی۔ نور بی بی حسب عادت دوپہر کی نیند لے رہی تھیں۔ نور العین حویلی کی راہ داریوں میں عجیب بے چینی کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ یہ وقت اس کا بالکل اچھا نہیں گزرتا تھا اور وہ بے تابی سے شام کی منتظر ہوتی کہ بڑی امی کے ساتھ علاقے کی عورتوں کے ساتھ بیٹھ سکے۔ حویلی میں گھوم پھر کر تنگ آ گئی تو عقبی باغ کی سمت چلی آئی جہاں ڈوبتے سورج کا عکس تھا۔ درختوں کے لمبے سائے ڈھلتے دن کا پیغام دے رہے تھے۔ وہ برآمدے میں رکھے بڑی امی کے تخت کی جانب چلی آئی۔ ساری حویلی میں یہ گوشہ اسے ہمیشہ پرسکون محسوس ہوتا تھا۔ یہاں بیٹھ کر اس کے وجود میں سکون و اطمینان کے ساتھ مثبت اثرات بھی پیدا ہوتے تھے۔ اس نے سرسری سی نظر باغ کی جانب ڈالی لیکن نگاہیں واپس پلٹنے کی بجائے سنبل کے درخت پہ ٹک گئیں۔ ایک چڑیا بے چینی سے اپنے گھونسلے کے گرد گھوم رہی تھی، اس کی چوں چوں کی آوازیں سناٹے میں واضح محسوس ہو رہی تھیں۔ چڑیا کی بے چینی اسے اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئی اور اپنی ذات بھی چڑیا کی مانند لگی جس کا آشیانہ بکھر رہا تھا۔ یہ منظر اسے ایک پرانی پڑھی ہوئی نظم کی مجسم تصویر لگی تھی۔

پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
ہوا اک بار یوں
بستی کے باغوں میں
کسی بھی پیڑ کی ٹہنی پہ کوئی پھل نہیں آیا
ہرے پتوں کا موسم لوٹ کر واپس نہیں آیا

پرندے رو دیئے
اور دور کے باغوں میں ہجرت کر گئے سارے
بہت آزردہ ہو کر باغبانوں نے
دعائیں کیں
مناجاتیں پڑھیں
اپنے گناہوں کی
خدائے لم یزل سے معافیاں مانگیں
اور کیاریاں کاٹیں
ہرے پتوں کا موسم لوٹ کر واپس نہیں آیا
پرندے لوٹ آئے تھے
نئی بستی کے باغوں سے
ہرے پتوں کی ٹہنی توڑ لائے تھے

''نوری بی بی...... آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟'' وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن تھی کہ گل کی آواز پہ چونکی۔ گل ہاتھ میں تکیے اور

دیگر سامان لیے کھڑی تھی۔شام سے پہلے یہاں کا مکمل انتظام وہ پوری ذمہ داری سے پورا کر دیتی تھی اوراب بھی اسی غرض سے یہاں موجود تھی۔

''اندر دل گھبرا رہا تھا تو یہاں چلی آئی۔کھلی فضا میں اچھا محسوس ہوتا ہے اور بڑی امی کی جگہ پہ تو کچھ زیادہ ہی سکون محسوس ملتا ہے۔'' وہ تخت سے اٹھ کھڑی ہوئی تا کہ وہ وہاں بچھا بستر ٹھیک کر سکے۔

''آپ اب یوں اداس باتیں نہ کیا کریں اور یہ گھبرانا تو بالکل ہی چھوڑ دیں۔'' گل مسکراتے ہوئے بولی۔

''کیوں......اب ایسا کیا ہو گیا ہے؟'' اس نے حیرانی سے گل کی مسکراہٹ کو دیکھا۔

''کچھ ہوا تو نہیں بلکہ ہونے والا ہے۔میری ساری دعائیں آپ کے حق میں قبول ہو گئی ہیں۔'' اس کی مسکراہٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے بے پایاں خوشی ہے۔

''گل...... یہ پہیلیاں نہ بجھواؤ۔جو بھی بات ہے سیدھی طرح بتاؤ'' اس کی نظریں اب بھی اسی چڑیا پہ مرکوز تھیں جواب ایک شاخ پہ خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔

''آپ کو واقعی کچھ نہیں پتا؟'' گل اس کے بالکل پاس آ کر آہستگی سے بولی جیسے کسی کے سن لینے کا اندیشہ ہو۔

''تمہیں کچھ کہنا ہے میں جاؤں؟'' وہ اس کے پراسرار رویے سے تنگ آ گئی تھی۔

''میں رات کو اسٹور سے کچھ سامان لینے گئی اور عبدالودود صاحب کے کمرے سے گزرتے ہوئے میں نے بی جان کی بات سنی تھی۔'' وہ اسی پراسرار اور دھیمے لہجے میں بولی۔

''گل...... کسی کی چھپ کر باتیں سننا کتنی بری بات ہے۔'' اس نے بائیں آنکھ کے ابرو کو اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور یہ عموماً اس کی حیرانی کا اظہار ہوتا تھا۔

''باخدا نوری بی بی میں نے چھپ کر باتیں نہیں سنیں۔میں بس وہاں سے گزر رہی تھی کہ آپ کا نام سن کر ٹھٹک گئی اور بس ایک لمحے میں ساری بات سمجھ آ گئی۔'' وہ اب ڈر گئی تھی اوراس کے سامنے نام لینے پہ پچھتا رہی تھی۔

''میرا نام......؟ بڑی امی ودود بھائی سے میری بات کر رہی تھیں؟'' وہ از حد حیران ہوئی۔''کیا کہہ رہی تھیں؟'' اسے لگا کوئی خاص بات تھی جو بڑی امی خود ودود بھائی کے کمرے میں گئی تھیں۔

''میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ بہت جلد آپ یہاں سے چلی جائیں گی۔رات میں بی جان ودود صاحب سے کہہ رہی تھیں کی وہ مجتبیٰ صاحب سے آپ کے لیے بات کریں۔انہیں کہیں کہ آپ کو یہاں سے لے جائیں۔'' وہ آہستگی سے بولتے ہوئے بھی بے انتہا خوش تھی اوراپنی خوشی میں اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ نہیں سکی۔

وہ اس حقیقت سے آگاہ تھی کہ اس کے والدین کی زندگی میں اس کی حقیقت صفر تھی۔وہ دونوں اس کی ذات کے لیے اکھٹے تو تھے لیکن اس بات کا بدلہ بھی اسی سے لے رہے تھے۔بڑی امی نہ ہوتی تو شاید اس کے وجود کا نام ونشان بھی مٹ گیا ہوتا لیکن اس سب کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس کی عزت نفس نہیں تھی،اسے کے احساسات نہیں تھے،اسے کسی بات کا برا نہیں لگتا تھا۔وہ کوئی گڑیا نہیں تھی جسے زبردستی کسی دوسرے کے پلے باندھ دیا جائے۔اس کے وجود میں ایک غبار پیدا ہونے لگا جس نے اس کے حواس کو مفلوج کر دیا تھا،گل مزید کیا کہہ رہی تھی وہ سن نہیں پائی۔اسے حویلی کی اونچی دیواروں سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی،اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔

گل اپنی رو میں اسے ساری داستان سنا کر خوشی خوشی دوسری چیزیں لینے واپس حویلی کے اندر چلی گئی۔وہ اس کی خوشی میں اس قدر مگن تھی کہ آج اس کے سپاٹ چہرے کے پیچھے چھپے غم کو سمجھ نہیں پائی۔اس نے خالی برآمدہ دیکھا اور نہ جانے کیا سوچ کر قدم باغ سے باہر بیرونی راہداری کی طرف بڑھا دیئے۔وہ یہاں سے دور چلی جانا چاہتی تھی،ان سب لوگوں سے اسے نفرت محسوس ہو رہی تھی جنھوں نے اس کی ذات کو تماشہ بنا کر رکھ دیا تھا۔اس کے ماں باپ کو اس کی پروا نہیں تھی تو اس نے خود کو وہاں سے گم کر لینا چاہا تھا۔

''بی بی جی آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' وہ بیرونی دروازہ کھول رہی تھی کہ اسے اپنے عقب میں یوسف کی آواز سنائی دی۔

اس نے یہ آواز سنی ہی نہیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اس کے سامنے دور تک سیدھی سڑک تھی۔ ایک لمحے کو اس کے قدم رکے لیکن وجود میں جلتی آگ اس قدر شدید تھی کہ سنسان راستہ بھی قدموں کی زنجیر نہیں بنا۔

''بی بی جی رکیے...... نوری بی بی کہاں جارہی ہیں؟'' یوسف اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔

اسے رکنا تھا اور نہ وہ یوسف کے بار بار پکارنے پہ رکی تھی۔ کتنے ہی قدم وہ اس کے پیچھے بار بار پکارتے آیا لیکن اس کے نہ رکنے پہ واپس پلٹ گیا۔ وہ ہر چیز سے انجان بس چلتی جارہی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اس طویل راستے پہ اکیلے قدم رکھے تھے لیکن وہ ہر خوف سے بے نیاز نظر آرہی تھی، اسے کسی انجام کا ڈر نہیں تھا، بس اسے دور جانا تھا۔ ہر لمحے اس کے قدم تیز تر ہوتے جارہے تھے۔

❁......❁......❁

شام پھیلنے میں تھوڑا وقت تھا۔ کنزی کے بار بار بلانے پہ بھی وہ ان کی طرف نہیں گئی تو چند لمحوں بعد وہ خود ہی چلی آئی تھی۔ کنزی نے غصیلے تاثرات سے اسے دیکھا لیکن مقابل کو پروا کیا تھی۔

''تمہیں کتنی بار بلایا، سنتی کیوں نہیں ہو؟'' انہوں نے اس کے سر پہ کھڑی کڑے تیور لیے پوچھا۔

''تم آگئی ہوناں...... تو اب سنا بھی لو۔'' اس نے بے مروتی کی انتہا کردی۔

''ویسے کبھی کبھی مجھے تمہاری بالکل سمجھ نہیں آتی۔ بدلتے موسم کی طرح ہو تم...... پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔'' وہ نروٹھے پن سے خود ہی اس کے پاس رکھی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

''آپ مجھ پہ اتنا غور و فکر پھر کبھی کر لیجیے گا، پہلے یہاں تشریف لانے کی وجہ بتادیں۔'' کنزی کے طنز بھی اس کے رویے کو بدل نہیں پائے تھے۔

''بھائی تمہیں کال کررہے ہیں تم وہ نہیں اٹھارہی، میں تمہیں بلارہی تھی تم نے میری بات بھی نہیں سنی۔ آخر مسئلہ کیا ہے؟'' وہ اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والی نہیں تھی۔

''مسئلہ یہ ہے کہ میرا دل نہیں کررہا اور کچھ۔'' اس نے مصنوعی مسکراہٹ چہرے پہ سجاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ کنزی نے شدید کوشش کے بعد اپنی مسکراہٹ روکی تھی۔

''تم مجھ سے ناراض ہو؟'' وہ اس کے رویے کی وجہ جاننے کی کوشش کرنے لگی۔

''یہ نادر خیال آپ کو کہاں سے آیا؟'' اس کی آپ، آپ کی گردان کنزی کو پریشان کررہی تھی۔

''تم نے صبح یونیورسٹی میں مجھے کہا کہ تم لائبریری جارہی ہو، میں تھوڑی دیر بعد وہاں آئی تو تم وہاں نہیں تھیں۔ پھر کافی دیر بعد بھی تم مجھے نہیں ملیں اور واپسی پہ بھی ناراض ناراض لگیں۔ اس کا مطلب یہ ہی ہے ناں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔'' اب اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ وہ دونوں آپس میں جتنا بھی لڑلیتی لیکن ایک دوسرے سے ناراض نہیں رہ سکتی تھیں۔

''میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔'' آخر اسے ترس آ ہی گیا تب ہی کنزی کی بات کا سیدھا جواب دیا۔

''پھر چلوناں ہمارے ساتھ۔''

''کہاں......؟'' وہ حیران ہوئی کہ شام ڈھلے اسے کہاں جانا ہے۔

''بھائی جان سیر کرانے کا کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے اسی وجہ سے تمہیں فون کیے لیکن میڈم کے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' اب کنزی نے نروٹھے پن سے جواب دیا۔

''انہیں کہو اس افشین کے ساتھ سیر کرتے رہیں۔ عزت تو نہیں جانے والی اب ان کے ساتھ...... ہنہہ۔'' اس کی ''ہنہہ'' پہ کنزی بے اختیار ہنس دی۔

''تم دونوں میرے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہو۔ آپس کے مسئلے میں میں پستی ہوں۔'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا اپنا سر پھاڑے یا سامنے بیٹھی بے مروتی کی مورت کا۔

''آپس کا مسئلہ کہاں؟ تم بتاؤ تمہیں وہ نک چڑھی، مصنوعی نخرے والی افشین حازم بھائی کے ساتھ اچھی لگتی ہے؟'' وہ اپنی

ساری کاروائی گول کرگئی۔اسے معلوم تھا حازم بھائی نے بھی اسے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ وہ ان کے کمرے کی تلاشی لیتی رہی تھی سو اس نے سارا ملبہ ان پہ ڈال دیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں، امی کب سے ان کی شادی کے پیچھے پڑی ہیں اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ امی کو بتا دیتے۔''

''اب یہ انشیٔن نامہ بند کردو، یقین کرو ایسا لگ رہا ہے جیسے ساتویں گھر کی لڑائی لڑنے کا ذمہ تم نے لے رکھا ہو۔'' کنزی نے تنگ آکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔''اچھا ٹھیک ہے۔یہ ڈرامے بند کرو۔''اس کا مزاج قدرے بہتر ہوا۔

''پھر چل رہی ہو ساتھ؟''اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''نہیں۔امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے پھر کسی دن چلیں گے۔''اس نے کنزی کو تنگ کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا وگرنہ قریب تھا کہ وہ اس کا سر پھاڑ دیتی۔

''تم نہایت بدتمیز ہو۔ پہلے نہیں بتا سکتی تھیں کہ خالہ کی طبیعت خراب ہے اس لیے نہیں جا رہیں، میرا بے سبب آدھا خون سکھا دیا۔''اس نے واقعی ایک چپت رسید کردی۔

عزت کا قہقہہ بے ساختہ بلند ہوا تھا۔اس کی ساری ناراضگی وغصہ پل میں اڑن چھو ہوگیا۔کنزی نے اسے اس کے حال پہ چھوڑا اور خالہ کی طبیعت کا پوچھنے برآمدے کی سمت بڑھ گئی۔وہ بھی مسکراتی ہوئی اس کے پیچھے چلی آئی۔

❁......❁......❁

سڈنی کی فضاؤں میں پرندوں کی واپسی کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ نیلے پانی کے پار آفتاب کی شعاعیں ڈوب رہی تھیں۔ سبک روی سے چلنے والی ہوا اس وقت طوفانی رفتار میں بدل گئی تھی۔ ساحل سے ٹکرانے والی لہریں اتنی بلند تھیں کہ وہاں کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا سو انتظامیہ کی طرف سے ساحل خالی کروالیا گیا تھا۔palm beach کی سنہری ریت پہ اس وقت خوف کا رقص جاری تھا۔

''ابراہیم! آپ کچھ کیجیے ناں...... میرا دل خوف سے پھٹ جائے گا۔''ان کی آواز میں اندیشوں کی جھلک بہت واضح تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔وہ دونوں بالکل ٹھیک ہوں گے، میں امدادی کاروائی کرنے والوں کے ساتھ رابطہ کررہا ہوں لیکن آپ کی بگڑتی حالت مجھے فکرمند کررہی ہے۔میں آپ کو ایسی حالت میں چھوڑ کر کسی دوسری طرف توجہ نہیں دے پاؤں گا۔''وہ بالکونی میں فون کان سے لگائے مسلسل رابطہ میں مصروف تھے۔ایک بے چینی ان کے وجود پہ قابض ہوگئی تھی لیکن فاطمہ کی حالت ان کی بے چینی کو ہوا دے رہی تھی۔

لامیہ اور اذلان کے جانے سے وہ دونوں مطمئن تھے۔اس کے شوق کی تکمیل ہی ان دونوں کو خوش کیے دے رہی تھی۔ان کے واپس آنے سے پہلے وہ فنکشن پہ جانے کے لیے ساری تیاری مکمل کرلینا چاہتے تھے سو فاطمہ کو آرام کرنے کا کہہ کر وہ فون پہ مصروف ہوگئے تھے۔انہیں سردی محسوس ہوئی تو بالکونی کا دروازہ بند کردیا تاکہ فاطمہ کی طبیعت خراب نہ ہو۔وہ فون پہ ہی مصروف تھے کہ باہر سے آنے والی آوازیں چونکا گئیں اور صورت حال جاننے کے بعد ان کی حالت بے سروساماں مسافر کی مانند تھی۔وہ بالکونی میں کھڑے پشیماں نگاہوں سے اوپر اونچائی کی طرف دیکھ رہے تھے جہاں صرف گردوغبار تھا، کوئی منظر واضح نہیں تھا اور یہ نظارہ دیکھ کر ان کا دل ڈوب کر ابھرا تھا۔وہ چاہ کر بھی حالات کی نزاکت فاطمہ سے چھپا نہیں پائے تھے۔

''کچھ پتا چلا؟''انہوں نے موبائل کان سے ہٹایا ہی تھا کہ وہ بے چینی سے پوچھنے لگیں۔

''ابھی کوئی بھی امدادی کاروائی نہیں ہوسکتی، اوپر جانا خطرے سے خالی نہیں اور کچھ دیر تک اندھیرا ہوجانے کے بعد مزید مشکل ہوسکتی ہے۔ان کے پاس بہت ساری شکایات آرہی ہیں، کافی لوگ اوپر پھنسے ہوئے ہیں، وہ لوگ جلد از جلد کچھ کریں گے۔''

''ابراہیم میری بچی......''وہ روتے ہوئے ان کے سینے سے لگ گئی اور وہ انہیں دلاسہ دیتے ہوئے آنکھ میں آئی نمی کو چھپانے لگے تھے۔

''فاطمہ..... آپ کو اس وقت یوں پریشان ہونے کی بجائے اس کے لیے دعا کرنی چاہیے اور ویسے بھی وہ اکیلی نہیں ہے، اذلان اس کے ساتھ ہے۔ یہ طوفان تھم جانے دیں میں خود اسے ڈھونڈ کر لاؤں گا..... بس آپ ہمت رکھیں۔'' وہ انہیں ساتھ لگائے بستر کی طرف لے آئے۔ لامیہ اور اذلان کے ساتھ ساتھ انہیں اب فاطمہ کی فکر بھی ہونے لگی تھی۔

❁.....❁.....❁

وہ خود سے بیزار اور ارد گرد سے بے نیاز چلتی جارہی تھی۔ اس کے سفید پاؤں مٹی سے اٹ گئے تھے۔ اس کی بدحال حالت کو راہ گیر عجیب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اس کا حلیہ بتا رہا تھا کہ وہ اس علاقے کی دیگر عام عورتوں جیسی نہیں تھی اور یہ ہی وجہ تھی کوئی اس سے کچھ پوچھنے کی جسارت نہیں کر پایا تھا۔ اونچے درختوں کے سائے تلے کھڑی عورتوں کے لیے اسے دیکھنا ایک دلچسپ مشغلہ تھا سو وہ سرگوشیوں میں اس کے متعلق گفتگو میں مصروف تھیں۔ حویلی میں جن عورتوں نے اسے دیکھ رکھا تھا وہ حیرانی کی انتہا پہ تھیں۔ اسی لمحے ایک دھول اڑاتی جیپ اس کے پاس آن رکی اور ایک شخص دیوار کی طرح اس کے سامنے ایستادہ ہوگیا۔ اس کا راستہ بند ہوگیا تھا، سامنے وہ تھا، بائیں طرف گاڑی اور دائیں طرف نہر جس میں گدلا پانی سبک روی سے رواں تھا۔ اس کے بہت پیچھے سفید حویلی اپنی اونچے چوباروں کے ساتھ موجود تھی جہاں اسے نہیں جانا تھا۔

''میرا راستہ چھوڑو۔'' وہ آنے والے کو پہچان گئی تھی۔

''آپ کو یہ سب کرنا زیب نہیں دیتا، آپ کی یہ حالت سفید حویلی کی اجلی پیشانی کو داغ دار کرسکتی ہے۔ اس سے پہلے کہ بات ان عورتوں کی زبان پہ ہونے والی کھلبلی کے باعث علاقے میں پھیل جائے، میرے ساتھ چلیے۔'' وہ نگاہیں جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے لیے آگے بڑھتے ہوئے جیپ کا دروازہ کھولا لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔

''بات پھیلنے سے بچانا چاہتے ہو؟'' بات عام سی لیکن لہجہ کتنا تلخ تھا یہ مقابل واضح محسوس کررہا تھا۔

''جی.....'' کتنی تابعداری تھی اس کے لہجے میں۔ ''پھر کیا کرنا چاہیے مجھے؟'' اس کے سوال نے ضیغم عباس کو قدرے مطمئن کیا۔

''آپ گاڑی میں بیٹھیے تاکہ شام گہری ہونے سے پہلے میں آپ کو واپس حویلی میں پہنچادوں۔'' شام کا وقت تھا لوگوں کی کثیر تعداد واپس گھروں کو لوٹ رہی تھی اور وہ دونوں یوں سرِ راہ کھڑے سب کی نگاہوں میں آرہے تھے۔

''ٹھیک ہے۔ میں بیٹھ جاتی ہوں۔'' اس کے مثبت جواب پہ وہ دروازے سے پیچھے ہٹا تاکہ وہ آسانی سے بیٹھ سکے۔

''لیکن مجھے حویلی نہیں جانا۔'' نورالعین کی اگلی بات نے اس کے پیچھے ہٹتے قدم روک دیے۔

وہ سوالیہ نگاہوں سے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھنے لگا جس کے چہرے پہ چھایا حزن وملال زمین پہ اترتی شام کی طرح خوب صورت تھا۔ جس کا چہرہ کسی عروسہ سے زیادہ خیرہ کردینے والا تھا اور شاید مزید استعارے بھی وہ ڈھونڈ لیتا اگر اسے دیکھنے کا اس سے زیادہ حوصلہ رکھتا۔

''حویلی نہیں جائیں گی تو کہاں جائیں گی؟'' وہ پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگا، جو اس کی اندرونی بے چینی کی علامت تھی۔

''مجھے کہیں دور جانا ہے، اتنی دور جہاں کوئی اس علاقے کے نام سے بھی ناواقف ہو۔ تم اجڑے شجر کا دکھ جان لیتے ہو..... زرد پتوں کو نئی زندگی بخشنے کا ہنر جانتے ہو تو پھر میرا دکھ بھی سمجھو، میرے درد کی دوا بھی لادو، مجھے یہاں سے کہیں دور چھوڑ آؤ، کسی انجان راستے پہ ڈال دو کہ شاید وہاں کوئی منزل میرا مقدر ہو۔'' اس کے لہجے کی تکلیف اور آنکھ میں چمکتے چند قطرے ضیغم عباس کو بے بس کرگئے تھے۔

وہ ایک توانا مرد تھا۔ اس کے لیے قطعاً مشکل نہیں تھا سامنے کھڑی کمزور سی لڑکی کو زبردستی گاڑی میں بٹھالیتا یا اپنی مرضی کرتے ہوئے اسے حویلی کے دروازے پہ چھوڑ آتا لیکن وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر پارہا تھا۔ اس کی پلکوں کی باڑ سے نکلتے ایک نمکین قطرے نے اسے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا۔

''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے، اندھیرا ہورہا ہے اور اس وقت آپ کو حویلی میں نا پاکر سب لوگ پریشان ہوجائیں

گے۔ آپ بی جان کا ہی سوچیے کہ وہ آپ کے لیے کتنی فکر مند ہوں گی۔'' اس نے دل پہ پاؤں رکھتے ہوئے اسے ایک بار پھر قائل کرنے کی کوشش کی۔

''میرے راستے سے ہٹ جاؤ، مجھے کہیں نہیں جانا تمہارے ساتھ۔'' اس کے اٹل جواب نے اسے بے بس کردیا، اب اس کے سوا کوئی چارا نہیں تھا کہ اس کی مانی جائے۔

وہ نورالعین کی حالت بالکل سمجھ نہیں پارہا تھا۔ وہ دکھی تھی، پریشان تھی لیکن اس کے علاوہ ایسا کیا تھا جس نے اسے یہ حرکت کرنے پہ مجبور کردیا۔ وہ اگر اس کو پہچانتا نہیں تو باقی لوگوں کی طرح وہاں سے گزر جاتا اور تب اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوتا.....؟ یہ بات وہ سوچ بھی نہیں پارہا تھا۔ ضیغم کی یقین دہانی پہ وہ جیپ کے کھلے دروازے سے سیٹ پہ بیٹھ گئی۔ اس نے گاڑی حویلی سے مخالف سمت کی جانب موڑلی تھی۔ نورالعین کی ضد پہ اس نے جو فیصلہ کیا وہ نہیں جانتا تھا اس کا انجام کیا ہوگا۔

۞......۞......۞

وہ سیکڑوں فٹ بلند پہاڑی پہ اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے ہونٹوں پہ جمائے چیخوں کا گلا گھونٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ چند لمحوں کا کھیل تھا اور اس کے سمجھنے سے پہلے ہی وہ اس کی آنکھوں کے سامنے وہاں گر پڑا تھا۔ ایک بلند چیخ مارنے کے علاوہ اس کے جسم میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھ پاتی۔ وہ پہاڑ کے نیچے بنی چھوٹی سی غار نما جگہ تھی جب کہ وہ اس غار سے تھوڑا آگے بڑھ گیا اور اسی لمحے اوپر سے آتے پتھروں کا نشانہ بن گیا تھا۔ اس کے اردگرد پتھر تسلسل سے گر رہے تھے اور وہ وہیں ساکت کھڑی اس کو اب کوئی پتھر نہ لگنے کی دعا کررہی تھی۔

''اذلان......تم ٹھیک ہو؟'' وہ آنسوؤں کی روانی میں ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولی تو اندازہ ہوا اتنے شور میں آواز اس تک پہنچ ہی نہیں سکی ہوگی۔

''اذلان......'' اب کی بار وہ چیخ کر بولی لیکن دوسری طرف کوئی ہلچل نہیں ہوئی تھی۔

''یااللہ!......یااللہ مدد کر......میرے اللہ رحم کیجیے، اذلان کو کچھ نہ ہو......اللہ تعالیٰ جی مدد کیجیے۔'' وہ اب زاروقطار رونے لگی تھی۔ روتے ہوئے بلند آواز میں دعائیں مانگنے لگی۔

اسی لمحے اذلان کے وجود میں حرکت ہوئی۔ لامیہ اپنی دعا کی باریابی دیکھتے ہوئے بار بار وہ ہی الفاظ دہرانے لگی اور اس لمحے اس کی نظر اذلان کی بائیں سمت پہ پڑی۔ وہ ہوش میں آرہا تھا لیکن اردگرد سے بے خبر تھا، اس کے بالکل ساتھ ڈھلان اور نیچے سیڑھیاں تھیں اور اس طرف گرنے کی صورت میں کیا ہوسکتا تھا یہ سوچ کر اس کی روح کانپ گئی۔ اس نے اپنی ساری ہمت جمع کی اور ہر طرح کے خطرے کو نظرانداز کرتی غار سے نکل آئی۔ وہ اسے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھی، اپنی آنکھوں کے سامنے اس کے ساتھ کچھ غلط ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

اذلان......آنکھیں کھولو۔'' اس کے سر کے پاس خون تھا اور اس کی جان فنا کرنے کو یہ منظر ہی کافی تھا۔

لامیہ نے اپنا زور لگاتے ہوئے اس کو ڈھلان کی طرف سے پیچھے کھینچا۔ اس نے اذلان کو اٹھانے اور غار کی جانب لے آنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہی۔ اس کے بازو اور گھٹنے زخمی تھے اور اس سے زیادہ زور لگانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ شام گہری ہورہی تھی اور سردی کی شدت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہاں کھلی ہوا میں وہ خود کو جمتا ہوا محسوس کررہی تھی۔ رات کا اندھیرا زیادہ خطرناک ہوسکتا تھا۔ بارش، پتھر اور طوفان کوئی بھی نئی آفت لاسکتے تھے۔ اس نے خود کو اور اذلان کو بچانے کی مزید ایک کوشش کی اور اب کی بار اسے ٹانگوں کی جانب سے کھینچنا شروع کیا جس میں وہ کسی حد تک کامیاب رہی تھی۔ وہ مسلسل محنت کرنے کے بعد بالآخر اسے غار میں لے آئی تھی رات کے اندھیرے نے اس کے دل میں امید کے سارے روشن دیے بجھادیے۔ اس اندھیرے اور طوفان میں کوئی ان کی مدد کو نہیں پہنچ پائے گا۔

''پانی......'' اذلان کی نقاہت سے بھرپور آواز نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑا۔ اس نے فوراً اسے ادھر ادھر ہاتھ مارے کہ پانی کی بوتل ڈھونڈ سکے اور اسی پل اس کے ہاتھ میں موبائل آگیا تھا۔ موبائل دیکھ کر اسے خود پہ شدید غصہ آیا، اس کے ذہن میں کیوں نہیں آیا کہ وہ کسی کو مدد کے لیے کال کرے۔ سب سے پہلے موبائل کی ٹارچ جلاتے ہوئے اس نے بوتل ڈھونڈی اور

اذلان کو پانی پلایا۔ وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا تھا، سر سے بہتا خون بھی رک گیا تھا۔ اس نے سب سے پہلے پاپا کا نمبر ملایا اور وہ حیران تھی کہ اب تک کسی نے انہیں کال کیوں نہیں کی؟ وہ لوگ اس حد تک بے خبر تو نہیں ہو سکتے۔ اس کے سوالوں کا جواب اسے اگلے ہی لمحے مل گیا جب نیٹ ورک نہ آنے کا جواب ملا۔ اس نے مایوس نگاہوں سے موبائل کی جانب دیکھا۔

''ہم پھنس گئے ہیں، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' آنسو ایک بار پھر آنکھوں سے ٹپکنے لگے تھے۔

❁......❁......❁

راہداری میں اکا دکا لوگ موجود تھے۔ پریزنٹیشن بہت اچھی ہوئی تھی سو سب اپنے اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے تھے۔ کنزی نے اس سے کیفے میں جانے کی بہت ضد کی لیکن اس نے جانا تھا اور نہ وہ گئی۔ کنزی اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کینٹین آ گئی تھی۔ یہاں بیٹھے وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن تھی، کچھ دنوں سے امی پریشان دکھائی دے رہی تھیں اور اس کے بار بار پوچھنے پر بھی پریشانی کی وجہ بتانے کے لیے آمادہ نہیں تھیں۔ وہ خود کو جتنا بھی گھریلو معاملات سے بے نیاز رکھتی لیکن امی کے چہرے پہ غم کی ایک جھلک اسے بے چین کر دینے کو کافی ہوتی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' کوئی بہت آہستگی سے اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے چونک کر آنے والے کو دیکھا اور نہ جانے کیوں اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آپ یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں؟''

''میری دوست کینٹین کی طرف گئی ہے، میرا دل نہیں تھا سو یہاں بیٹھ گئی۔'' عزت کی جانب سے نرم لہجے میں ملنے والے جواب نے مقابل پہ حیرت کی بجلی گرائی۔

''کیا ہوا...... آپ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں؟'' وہ لمحے میں اس کے تاثرات جان گئی۔

''آپ کی جانب سے اتنے اچھے لہجے میں جواب وصول کرنے کی سعادت پہلی بار حاصل ہوئی ہے ناں......'' اس کے جواب پہ وہ بے ساختہ مسکرائی۔

''ارے واہ...... آپ تو ہنستی بھی ہیں۔'' مجتبیٰ کو اس کی ذات کے نئے رنگوں سے آشنائی ہوئی۔

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں، میں ایک عام انسان ہی ہوں بس آپ سے جب بھی ٹکراؤ ہوا عجیب حالات میں ہوا، اس لیے آپ کی پہلی رائے پختہ ہوتی گئی۔'' اس کا لہجہ تہذیب کے دائرے میں تھا اور مجتبیٰ اس کی باتوں سے قائل ہونے لگا۔

''ویسے مجھے مجتبیٰ زبیر احمد کہتے ہیں۔'' اسے اچانک یاد آیا کہ تعارف ادھورا ہے۔

''جانتی ہوں۔'' بے نیازی سے جواب آیا۔

''وہ کیسے؟'' وہ ایک دم چونکا۔

''ہم ایک کلاس میں ہیں اتنی آگاہی تو ہو سکتی ہے۔'' عزت نے اس کے حیران ہونے پہ وضاحت دی۔

''ویسے میرا نام عزت فاطمہ ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' اس کے جواب پہ وہ بالکل نہیں چونکی۔

''پوچھیں گی نہیں کہ کیسے جانتا ہوں؟'' عزت نے اس کے شرارتی انداز کو حیرت سے دیکھا۔ اس کے لہجے میں کچھ ایسا نہیں تھا کہ اسے محتاط ہونے کی کوشش کرنی پڑتی لیکن کچھ تو ایسا تھا جو اسے متوجہ کر رہا تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''کیسے جانتے ہیں؟'' وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا تجسس پوچھنے پہ مجبور کر گیا۔

''میں آپ کا نام تب سے جانتا ہوں جب آپ کے ساتھ پہلا ٹکراؤ ہوا تھا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ عزت کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر لہرا گیا اور مقابل کی مسکراہٹ اسے شدید ترین طنزیہ محسوس ہوئی۔

''آپ مجھ پہ طنز کر رہے ہیں؟'' اس کا مزاج ایک دم بگڑا۔

''نہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں بلکہ میں اس دن کے لیے واقعی بہت شرمندہ ہوں لیکن بس میں آپ کے ساتھ ٹکراؤ میں میری کوئی غلطی نہیں تھی۔'' اس کے بگڑتے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس نے عجلت میں وضاحت دی کہ مبادا یہاں کوئی نیا فساد

شروع نہ ہو جائے۔
اس کی وضاحت نے عزت کو شرمندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ یہ سب ہی تو کرتی آرہی تھی اور اب اگر وہ تمیز کے دائرے میں رہتا ہوا اس سے بات کر رہا تھا تب بھی وہ اسے غلط سمجھ رہی تھی۔ اس نے کتنے آرام سے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور اسے یاد تھا وہ تب بھی ان سے معذرت کرتا رہا لیکن اس نے بیچ چوراہے میں اسے بے نقط سنائیں اور اب بھی اس کی وضاحت کو طنز سمجھ رہی تھی۔ اسے اپنے رویے پہ اس وقت شدید شرمندگی ہوئی تھی۔
''میری طبیعت میں بہت جلد بازی ہے، میں اکثر اپنی اسی عادت کی وجہ سے بہت عجیب وغریب حرکات کر جاتی ہوں اور اس کے گواہ تو آپ خود ہی ہیں۔'' اس نے نادانستہ وضاحت دی جس کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔
''ہم بھی کیا پرانی باتیں لے کر بیٹھ گئے، دراصل مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا کہ اس دن آپ نے میرے دوستوں کی مدد کی، ویسے بھی جتنا اچھا آپ نے انہیں سمجھایا میں کبھی ویسا نہیں کر سکتا تھا بلکہ کچھ پوائنٹس میرے بھی کلیئر ہوگئے۔'' اسے اچانک یاد آیا کہ وہ یہاں کس لیے آیا تھا۔
''وہ اتنا شور کر رہے تھے کہ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو انہیں سمجھانا اور چپ کرانا اپنی پہلی ترجیح سمجھتا۔'' وہ اپنے جواب پہ خود ہی مسکرائی۔
''لیکن آپ ایک دم وہاں سے چلی کیوں گئیں؟'' اسے اس کا ایک دم چلے جانا یاد آیا تو پوچھ بیٹھا۔
''ابھی تو آپ کو بتایا کہ میں بہت جلد باز ہوں۔'' اس کی وضاحت نے وہاں موجود اجنبیت کو ایک دم ختم کر دیا تھا۔ کچھ نئے زاویے بننے لگے جو دو کناروں کو جوڑنے کی کوشش کرنے والے تھے۔ کوئی خوشنما بیل تناور شکل اختیار کر رہی تھی جو دو دیواروں میں پل کا کام کرنے والی تھی۔
''چلیں...... مجھے چلنا چاہیے۔ آپ کی دوست بھی آنے والی ہوگی۔'' وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔
''آپ چاہیں تو بیٹھ سکتے ہیں، اسے آپ کی موجودگی سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' وہ شاید اپنے گزشتہ رویے کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔
''جی مجھے اندازہ ہے، وہ کافی سمجھدار ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور وہ پل میں اس کے پس منظر میں پہنچی لیکن اس بار اسے برا نہیں لگا بلکہ وہ چاہتے ہوئے بھی برا لگنے کا دکھاوا نہیں کر سکی تھی۔
وہ جا چکا تھا اور اس وقت بھول گئی تھی کہ کچھ لمحے پہلے وہ کن سوچوں کے سبب پریشان ہو رہی تھی۔ اسی لمحے اسے کنزی اپنی طرف آتے نظر آئی۔ اس نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا کیونکہ لیکچر شروع ہونے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔
''کون تھا یہ؟'' وہ آتے ہی، کمر پہ ہاتھ ٹکائے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
''کون...... کس کی بات کر رہی ہو؟'' وہ اس کے انداز پہ حیران ہوئی۔
''میں دور تھی لیکن مجھے کوئی تمہارے پاس سے اٹھتا ہوا نظر آیا تھا۔'' وہ اب بھی اسی حالت میں کھڑی تھی۔
''زیادہ بی جمالو بننے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں آرام سے بیٹھ کر بھی پوچھ سکتی ہو۔'' اس نے کنزی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے نیچے کی جانب کھینچ لیا۔
''ہاں...... اب آرام سے پوچھ رہی ہوں کون تھا؟'' عزت ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہی تھی، اس کے علاوہ کوئی دوست اس کا نہیں تھا اور اب یوں اس کی غیر موجودگی میں کسی دوسرے کی موجودگی اسے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔
''وہ مجتبیٰ تھا۔'' اس نے ساری تفصیل اسے بتا دی۔
کنزی حیرانی سے اس کا اطمینان دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی عادات سے اچھی طرح واقف تھی، نئے لوگوں کے ساتھ وہ اتنی آسانی سے گھلنا ملنا پسند نہیں کرتی تھی کجا کہ کسی کے ساتھ اتنی دیر باتیں کرنا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اتنا عجیب نہیں لگتا مگر دوسری طرف وہ انسان تھا جس کے ساتھ عزت دو بار لڑ چکی تھی اور وہ اس کے ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں تھا۔ وہ عزت کے اس بدلتے رویے کی وجہ بالکل سمجھ نہیں پائی لیکن اس وقت مزید سوالات کرنا اسے مناسب نہیں لگا تھا۔

❁.....❁.....❁

رات نے بے دردی سے شام کا جوبن چھین لیا اور اب اپنی گہری اداؤں سمیت زمین سے بوس وکنار کررہی تھی۔ گاڑی ایک سیاہ دروازے کے سامنے آن رکی اور دروازے کے اوپر لوہے کی راڈ کے سہارے لگا بلب سنہری روشنی سے چند گز حصے کو روشن کررہا تھا۔ گاڑی رکنے کے چند لمحے بعد سیاہ دروازہ کھل چکا تھا اور دروازہ کھولنے والا سامنے کا منظر دیکھ کر حواس باختہ نظر آرہا تھا۔ جیپ پتھروں سے بنی روش پہ چلتی ہوئی احاطے کے سامنے رک گئی۔ جہاں جیپ کھڑی تھی اس کے دو اطراف میں وسیع زمین تھی جہاں زمین کا سینہ چاک کرکے فصلیں اگائی گئی تھیں۔ ایک حصہ جانوروں کے لیے جب کہ دوسرا حصہ رہائش کے لیے تھا۔

''آپ اندر چلی جائیں، سامنے ایک راہداری ہے اس کے اختتام پہ جو کمرہ ہے آپ وہ استعمال کرسکتی ہیں۔ گھر کے دیگر ضروری حصے بھی اسی طرف ہیں۔'' وہ جیپ کا دروازہ کھولے کھڑا مدہم آواز میں اسے تفصیل بتارہا تھا۔

''یہ تم مجھے کہاں لائے ہو؟'' وہ گاڑی سے نہیں اتری تھی۔

''اس گھر میں کوئی عورت نہیں ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ یہاں محفوظ ہیں۔'' وہ اس کے لہجے میں چھپا خوف لمحے میں جان گیا تب ہی اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن یہ کون سی جگہ ہے؟'' اسے راستوں کا اندازہ نہیں تھا ورنہ یہ سوال پوچھنے کی نوبت نہیں آتی۔ گہری ہوتی شام میں وہ بس یہ سمجھ پائی تھی کہ نہر کنارے انہوں نے تقریباً دس منٹ سفر کیا تھا اور اس کا مطلب تھا ابھی وہ چٹھہ خاندان کی حدود میں ہیں۔

''کیا مسئلہ ہے ضیغم؟ یہ بچی کون ہے؟'' ان دونوں کی بات جاری تھی کہ دور کھڑا ادھیڑ عمر مرد وہاں چلے آیا۔

''ابو فکر کرنے والی کوئی بات نہیں، یہ مہمان ہیں۔'' اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں انہیں دلاسا دیا۔ وہ اگر اپنے بیٹے کے متعلق پراعتماد نہ ہوتے تو یقیناً کئی سوالات کرتے لیکن اس وقت سر ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔

ان دونوں کی گفتگو نے اسے تقریباً پرسکون کردیا تھا۔ وہ وہاں اکیلا نہیں تھا اور نہ ہی اسے کسی غلط جگہ لے کر آیا تھا بلکہ اپنے گھر میں لایا جہاں اس کا باپ بھی موجود تھا۔ وہ پہلے بس حویلی سے دور جانا چاہتی تھی، کسی ایسی جگہ جہاں اسے اپنے ماں باپ کا نام بھی سنائی نہ دے لیکن جوں جوں گاڑی کے پہیے گھومنے لگے اس کی ساکت حسیات نے سنگینی کا احساس کرانا شروع کردیا تھا، اس کے ذہن میں امڈنے والے خیالات کے باعث ہی وہ اندر جانے سے کترا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ جلد بازی میں اس نے کہیں غلط فیصلہ نہ کرلیا ہو، اپنے پاگل پن میں کسی غلط آدمی پہ یقین نہ کرلیا ہو لیکن اب وہ تقریباً پرسکون تھی تب ہی ان کی بات ختم ہونے کے بعد جیپ کے کھلے دروازے سے نیچے اتر آئی۔ اس نے جس سمت اشارہ کرتے ہوئے جانے کا کہا تھا، آرام سے اس راستے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ سفید چپس کے فرش پہ چلتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھی۔ گھر اس کی حویلی جیسا بڑا اور سہولیات سے آراستہ نہیں تھا لیکن پرسکون تھا۔ سفید دیواروں پہ محبت کے نقش اس کی متلاشی نگاہوں کو نہایت واضح دکھائی دیے۔ چھوٹی سی راہداری انہی سوچوں میں کٹ گئی اور اب سامنے وہ کمرہ تھا جہاں اسے رکنے کے لیے کہا گیا تھا، دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے محتاط نگاہیں اردگرد دوڑائی لیکن سب کچھ معمولی تھا...... کچھ بھی ایسا نظر نہیں آیا جو اس کے خدشات سے بھرے دل کو نئے واہموں کے سپرد کر دیتا، سو اس نے آرام سے دروازہ کھولا اور اندھیرے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ مارتے ہوئے کمرے میں روشنی کرنے کی کوشش کی اور دروازے سے کچھ دور بٹن پہ ہاتھ لگنے سے کمرہ روشن ہوگیا۔ کمرہ بھی توقع کے مطابق راہداری کی طرح سادہ تھا۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے اس کے کانوں میں باہر کی آوازیں پڑیں لیکن نافہم آوازوں پہ کان دھرنے سے بہتر اسے دروازہ بند کرکے پرسکون ہونا لگا۔

''ضیغم...... کچھ بتائے گا بھی یا میں ٹیوے (اندازے) لگاتا رہوں گا، میرا دل ہول رہا ہے اور توں چپ کی بکل مارے کھڑا ہے۔'' وہ جولڑکی اترتے دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے تھے اس کے جانے کے بعد دوبارہ بیٹے کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔

پریشانی ان کے چہرے سے واضح ہورہی تھی۔
''ابو...... یہ سعد علی چٹھہ کی بیٹی ہے۔'' اس نے گلا تر کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور مقابل کو یوں لگا جیسے کچھ غلط سن لیا ہو۔ وہ کتنی ہی دیر آنکھیں کھولیں اسے دیکھتے رہے جیسے اپنی سماعت پہ کوئی شبہ ہو۔
''سعد علی چٹھہ......! وہ سفید حویلی والے، تمہارے دوست عبدالودود کا چچا؟'' انہیں یقین کرنے میں اس قدر مشکل ہورہی تھی کہ وہ سارے حوالے دے کر دوبارہ پوچھ رہے تھے۔
''جی ابو......'' اس کے جواب نے ان کے وجود کو لڑکھڑا دیا۔
''یہ تو نے کیا کردیا؟ اکو ایک سہارا ہے تو میرا، اس بوڑھے وجود میں طاقت کی رمق تیری جوانی سے ہے اور تو نے اس شتر بے مہار جوانی کے نشے میں اپنے بوڑھے باپ کا بھی نہیں سوچا؟ تو نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ تیرے باپ میں بڑھے ویلے چٹے سر میں خاک ڈلوانے کی ہمت نہیں، او مجھ میں چٹھوں کے متھے لگنے کا حوصلہ کوئی نہیں ضیغم عباس...... کوئی نہیں حوصلہ۔'' اس کا جواب ان کے لیے اتنا ناقابل یقین تھا کہ وہ وہیں نیچے پڑی اینٹ پہ اپنا تہبند سمیٹتے ہوئے بیٹھ گئے۔
''ابو کیا ہوگیا ہے؟ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔'' ان کا ردعمل اس کی امیدوں کے خلاف تھا۔ وہ اچھا خاصا پریشان ہوگیا تھا۔
''کیا ایسا نہیں ہے، ابھی جو تو نے بتایا وہ سب سچ ہے نا؟ اتنا ہی سوچ لیا ہوتا وہ تیرے یار کی بہن ہے، میں نے تو تجھے ہمیشہ یہ ہی سکھایا کہ بہنیں بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں، پھر تو نے یہ کیسے کرلیا؟'' وہ اس کی سنے بنا بس اپنی کہی جارہے تھے۔
''ابو...... ادھر دیکھیں میری طرف۔'' اس نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''وہ مجھے گاؤں جانے والی پگڈنڈی پہ نظر آئی تھی، شام گہری ہورہی تھی اور میرے بار بار حویلی چھوڑ آنے کا کہنے کے باوجود واپسی کے لیے نہیں مانی۔ آپ بتائیے اسے ایسے ہی راستے میں چھوڑ دیتا؟ اس اکیلی کے ساتھ کیا ہوسکتا تھا اس سوچ کے آتے ہی میں اس سے بے خبر نہیں رہ سکتا تھا سو اسے یہاں لانے کے سوا کوئی چارا نہیں تھا۔'' وہ ان کی پریشانی ختم کرنے کے لیے انہیں تفصیل سے آگاہ کررہا تھا۔
''جو بھی تھا تجھے اسے گھر نہیں لانا چاہیے تھا، حویلی والے بڑے ظالم ہیں، وہ تیری ہمدردی نہیں دیکھیں گے بلکہ اپنی عزت بچانے کو سارا الزام تیرے سر ڈال دیں گے۔ تو اپنے دوست کو بتادیتا کہ تمہارے گھر کی لڑکی باہر ہے اور خود اپنی راہ آجاتا پر نہیں باپ کی جان کو سولی پہ لٹکانے کا مزہ بھی تو لینا تھا۔'' وہ ابو کی تشویش سے بےزار ہونے لگا۔
''آپ پریشانی میں بڑی غلط باتیں کررہے ہیں۔'' ان کی دی گئی تربیت پہ عمل کیا اور اب وہ ہی اسے بھگو بھگو کر مار رہے تھے۔
''میری بات دھیان سے سن، اپنا ضروری سامان سمیٹ اور ابھی یہاں سے نکل جا۔ حویلی والوں اور اس لڑکی کا معاملہ عباس علی دیکھ لے گا۔ تو بس اسی وقت کہیں دور چلا جا۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک نئے خیال کے تحت اسے اندر کی جانب کھینچنے لگے جیسے ان کا بس چلتا تو پل میں اسے یہاں سے غائب کردیتے۔
اسے ابو کا شدید رویہ کسی طور سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اسے وہ وقت بھی یاد تھا جب بچپن کی گرم دوپہر میں نہر میں نہاتے ہوئے اس کی دوستی عبدالودود سے ہوگئی تھی۔ وہ سب سے لڑنے جھگڑنے والا نہ جانے کیسے ضیغم سے دوستی کر بیٹھا اور جب ابو کو پتا چلا تو اس وقت بھی اس دوستی کو ختم کرنے کے لیے اسے خالہ کے پاس بھیج دیا گیا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوئیں، عبدالودود واپس شہر پڑھنے چلا گیا تو اسے گاؤں آنے کی اجازت ملی لیکن یہ دوستی ابو کی ہزار کوششوں کے باوجود نہ ٹوٹ سکی۔ اسے ابو کے سفید حویلی والوں کے متعلق خدشات کبھی سمجھ نہیں آئے تھے، ان میں امارت کا نشہ تھا اور یہ نشہ وہ وقت ضرورت سارے علاقے پہ انڈیلتے رہتے تھے، ان کے جانبدار اور بے رحم فیصلوں کا وہ خود شاہد تھا لیکن اس کے اور عبدالودود کے درمیان ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں تھی۔
''اب کن سوچوں میں گم ہوگیا ہے؟'' ان کے چہرے پہ پھیلے فکرمندی کے سائے ضیغم کو شرمندہ کررہے تھے۔

وہ انہیں جواب دینے لگا کہ باہر گاڑی رکنے کی آواز نے اسے خاموش کردیا۔ اس نے ابو کے ہاتھ کی گرفت اپنے ہاتھ پہ مضبوط ہوتے محسوس کی اور ان کی آنکھوں میں امڈتے خوف اور اپنے لیے بے تحاشا اسے خوشی سے ہمکنار کیا تھا۔ وہ نہایت آرام سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے سیاہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا اور وہ ڈوبتے ہوئے اپنے آشیانے کے واحد تنکے کو دور جاتا دیکھتے رہے۔

۞......۞......۞

رات کی خوفناکی اس سے پہلے اس پہ عیاں نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سڈنی کی شاہراؤں پہ رات کا حسن دیکھا، اوپیرا کنارے کھڑے ہوکر دریا میں چمکتے چاند کا عکس دیکھا، اوپیرا کو سجانے والی رنگ برنگی روشنیاں رقص کرتے دیکھیں اور سب سے بڑھ کر ہاربر برج کو سجانے والے قمقموں کی چمک رات میں ہی تو اس نے آسمان تک جاتی دیکھی تھی۔ یہ اس کی زندگی کی پہلی رات تھی جس میں اس نے جانوروں کی آوازوں کو ساعتوں کے قریب محسوس کیا، زمین پہ رینگتے حشرات کا تختہ مشق اپنا وجود بنتے دیکھا، اندھیرے کا قہر اپنی آنکھوں میں اترتے دیکھا اور اسی پل یہ حقیقت بڑی شدت سے اس پہ عیاں ہوئی کہ وقت، موسم اور حالات اپنے آپ میں ایک تجربہ ہیں اور یہ کب کس کو اپنی طاقت دکھانے لگیں اس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔

اذلان کی حالت قدرے بہتر لیکن نڈھال سی تھی۔ وہ بے دم سا پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ خون بہت زیادہ بہنے کی وجہ سے اس کے حواس معتدل نہیں رہے تھے، سردی کی شدت نے کمزوری کا احساس دوبالا کردیا تھا۔ اس نے خود آج سے پہلے ایسی رات کب گزاری تھی، نرم و گرم بستر میں ٹھنڈک کا احساس چھوکر بھی نہیں گزرتا تھا اور اگر کبھی کھلے آسمان تلے رات گزارنے کا موقع ملا بھی تو آگ کا الاؤ اپنے جوبن پہ رہتا تھا۔

''سردی بہت شدید ہوگئی ہے اور رات اب بھی باقی ہے۔'' اذلان کی نقاہت زدہ آواز نے اس کو خیالوں کی روانی میں بہنے سے روکا۔

''مجھے بار بار ماما پاپا کا خیال آرہا ہے۔ وہ لوگ کتنے پریشان ہوں گے اور آج کی رات بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔'' اس نے اپنے کانپتے جسم کو دونوں بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے ٹھنڈک کم کرنے کی کوشش کی۔

''لامیہ...... ہمیں آگ جلالینی چاہیے، اب ٹھنڈک برداشت کرنا ممکن نہیں ہورہا۔'' اس کی طبیعت سنبھل رہی تھی یا بکھرے حواس پہ قابو پاچکا تھا لیکن اب اسے صورت حال بہتر کرنے کے طریقے سوجھنے لگے تھے۔

''میں کیسے آگ جلاؤں؟ مجھے آگ جلانا بالکل نہیں آتا اور ویسے بھی اس اندھیرے میں ایک قدم بھی نہیں اٹھاؤں گی۔'' وہ اس کی بات سن کر سرے سے ہی انکاری ہوئی۔ اسے اذلان پہ شدید ترین غصہ آنے لگا کہ جہاں ایک قدم کی چوک نیچے کھائیوں میں پھینک سکتی تھی وہاں وہ اسے عجیب و غریب کام کہہ رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوتا یار ہمت کرو، یہاں سکڑ کے مرنے سے بہتر ہے جینے کے لیے ایک کوشش کی جائے۔'' اس نے لامیہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''تو خود اٹھ کر ہمت کرلوناں میری جان کے دشمن کیوں بن رہے ہو؟'' اس کا غصہ دوبارہ تازہ ہوا۔ ''ویسے بھی بڑا آئے تھے ناں میرے باڈی گارڈ بن کر، اب اٹھو اور ساری کوششیں خود ہی کرو۔'' وہ غصے میں کھولتے ہوئے بولی۔

''بیگ مجھے پکڑاؤ۔'' اس نے جواباً بس اپنا بیگ مانگا اور اسے اس بات پہ بھی حیرت ہوئی۔

لامیہ نے خاموشی سے اسے بیگ پکڑادیا تھا۔ اس نے کچھ دیر بیگ کھنگالا اور تھوڑی دیر بعد ہی کلک کی آواز سے وہاں روشنی ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی اور لامیہ کا جی چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ وہ کب سے موبائل کی ٹارچ استعمال کررہی تھی اور اسی سبب اس کا اور اذلان کا موبائل بند ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہاتھ میں ایک لائٹر تھا جو ایک دو بار چلا کر چیک کیا، آگ کی اتنی سی جھلک سے لامیہ کے اندر نئی امید بندھنے لگی تھی کہ وہ یہاں کم از کم ٹھنڈ کے ہاتھوں مرنے والے نہیں تھے۔ طوفان اور بارش تھم گئے تھے، پتھروں کا گرنا بھی کافی دیر پہلے بند ہوگیا تھا۔ اذلان اب مکمل خاموش تھا اور اس کی یہ خاموشی بھی لامیہ کو قطعاً پسند نہیں آرہی تھی۔

’’جب اتنا سامان تمہارے پاس تھا تو تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟‘‘ اس نے بات کرنے کی کوشش کی۔
’’لامیہ...... ذرا سوچ کر بتانا کہ تم نے آج سارے دن میں میری کتنی باتیں سنیں؟ تم تو بس سنائے جارہی ہو، وہ بھی بلاوجہ اور بے حساب۔‘‘ اس کے لہجے میں دکھ کی آمیزش واضح ہوئی۔ ’’یہاں عموماً اس طرح کے حالات نہیں ہوتے لیکن احتیاطاً میں نے سب ضروری سامان ساتھ رکھا جو ایمرجنسی میں کام آسکتا تھا۔ میں نے تمہیں گرم کپڑے لینے کو کہا تم نے نہیں لیے، میں نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کو کہا جو کہ نسبتاً آسان اور سیدھا ہے، وہ میں نے اس لیے نہیں کہا کہ تمہیں کمزور سمجھ رہا تھا بلکہ عقل مند لوگ وہ راستہ ہی اختیار کرتے ہیں۔ آپ آسان راستے سے جاؤ، بنا تھکے اوپر پہنچو، مزے کرو اور واپسی پہ اس راستے سے نیچے اترو اور نظاروں کا مزا لیتے جاؤ لیکن تم نے میری ایک بھی بات نہ ماننے کی قسم کھا رکھی ہے۔‘‘ بات ختم کرنے تک اس کی آواز کانپنے لگی تھی۔
وہ بات ختم کرنے کے بعد ٹارچ کی روشنی اپنے اردگرد مارنے لگا جبکہ وہ خاموشی سے اس کی حرکات دیکھ رہی تھی۔ اس نے تھوڑا آگے کھسکتے ہوئے لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے چند ٹکڑے اکٹھے کیے اور ٹشو رکھتے ہوئے آگ جلانی چاہی جو کچھ لمحوں کی کوشش کے بعد ممکن ہوئی۔ آگ نے وہاں موجود ٹھنڈک کو لمحوں میں کم کیا اور ٹھنڈک کم ہوتے ہی جذبات کی سرد مہری میں بھی کمی واقع ہوگئی تھی۔
’’یہ چھوٹی لکڑیاں ہیں جلد ختم ہوجائیں گی، ایک بار اچھی سی گرمائش لے لوتا کہ ہم صبح تک کا وقت گزار سکیں۔ ویسے یہ پتھر تھوڑے گرم ہوجائیں گے تو ٹھنڈک میں کمی ہوجائے گی۔‘‘ اس نے ٹارچ بند کردی تھی۔
’’تم ٹارچ جلاؤ میں مزید لکڑیاں لے آتی ہوں۔‘‘ سنہری شعلوں نے اس کو جو سکون پہنچایا تھا اس کے تحت وہ اپنا کچھ لمحوں پہلے والا انکار بھول گئی تھی۔
’’باہر لکڑیاں گیلی ہیں، وہ نہیں جل سکتیں۔‘‘ اس کے لہجے میں اب پہلے جیسی نقاہت نہیں تھی لیکن اس کے الفاظ نے لامیہ کو شدید ترین شرمندہ کیا۔ وہ بس اسے اردگرد سے لکڑیاں اکٹھا کرنے کا کہہ رہا تھا اور اس نے سب الزام اس سے منسوب کردیے تھے۔
’’پھوپو کو پتا ہے کہ تم یہاں ہو؟‘‘ وہ بات شروع کرنے کی کوشش میں ایک بار پھر بے تکا سوال کرگئی۔
’’ہاں...... میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ میں اس وقت نڈھال حالت میں یہاں پڑا ہوں۔‘‘ وہ جتنا بد مزہ ہوا ویسا ہی جواب دیا۔
’’میرے سوال کا یہ مطلب نہیں تھا......‘‘ وہ جو جواب سننا چاہتی تھی وہ اسے نہیں ملا تھا۔
’’لامیہ...... میں تمہیں پہلے بھی کئی بار یہ سمجھا چکا ہوں کہ ماما کے رویے مجھ سے منسوب مت کیا کرو۔ میں نہیں جانتا وہ تم سے ایسا برتاؤ کیوں کرتی ہیں لیکن ان کا رویہ تمہیں میری دوستی کی شدتوں سے منکر کردیتا ہے اور یہیں مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ تمہارے لیے میرے جذبات شاید پراثر نہیں ہیں تب ہی تو ماما کے ساتھ ہر عداوت میں تم مجھے میری مرضی کے بنا گھسیٹ لیتی ہو۔ ان کی ایک تلخ نگاہ پہ تم مجھ سے دوستی کے سب دعوؤں سے انکار کردیتی ہو، کیا میرا اور تمہارا رشتہ ان کی مسکراہٹ خفگی کا محتاج ہے؟‘‘ وہ آج پھر سے اس کے سامنے سراپا سوال بنا بیٹھا تھا۔
’’تم یہ سب بہت آسانی سے کہہ سکتے ہو اذلان کیوں کہ تم نے کبھی ایسے رویوں کو جھیلا نہیں، کبھی ماما پاپا نے تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہیں کیا ورنہ میں بھی دیکھتی تم مجھ سے اتنی بڑی بڑی باتیں کیسے کرتے ہو؟ تم میرے پیرنٹس کی باتوں سے ہرٹ ہوکر مجھ سے نارو ٹھنے کا بھرم کیسے قائم کرتے ہو بلکہ میری طرف تو الٹا حساب ہے، تمہیں سرآنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہے، پاپا کو تمہاری موجودگی خوش کرتی ہے۔‘‘ وہ جواب دیتے ہوئے روہانسی ہوئی۔ یہ حقیقت تھی کہ وہ طیبہ حیدر شاہ کے رویے کو بہت سنجیدہ لیتی تھی۔ ان کی آنکھ کی جنبش بھی لامیہ کو محتاط کرنے کے لیے کافی ہوتی تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اذلان کے ساتھ تعلقات کی نوعیت بدلنے پہ مجبور ہوجاتی تھی۔
’’لامیہ دوستی کا تعلق دوسروں کی سوچ پہ نہیں پرکھا جاتا، یہ ہمیں خود طے کرنا ہوتا ہے کہ کس کے ساتھ ہمیں ہر دیوار عبور کرنے

کے بعد بھی کھڑا ہونا ہے اور کس کو اپنے سے چند قدم دور ہی شٹ اپ کال دینی ہے لیکن تم اس انداز سے کبھی نہیں سوچتیں۔'' وہ اسے سمجھا سمجھا کر تنگ آنے لگا تھا۔

''تم یہاں کیسے آئے؟'' اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی، شاید وہ ابھی اس پہ مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''انکل نے بلایا تھا، انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ تم میرے ساتھ زیادہ اچھے سے انجوائے کرسکو گی سو پہلی فرصت میں مجھے یہاں پہنچنے کا کہا تھا۔'' اس نے آخری سانس لیتی آگ کو تاسف زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی بات سن کر لامیہ کی گزشتہ دن جیسی حالت نہیں ہوئی تھی۔ پاپا کا اس کو بلانا اس وقت اسے قطعی برا نہیں لگا تھا۔

''ویسے ماموں کی بجائے تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا اور جب مجھے سبین سے پتا چلا کہ تم کہیں جا رہی ہو تو یقین کرو مجھے شدید ترین دکھ ہوا تھا۔'' وہ اب ایک چھوٹے بچے کی طرح روٹھا روٹھا لگ رہا تھا۔ ان دونوں کی دوستی کی یہ ہی خاصیت تھی کہ ایک دوسرے کی جذباتی کیفیت سے بہت جلد آگاہ ہو جاتے تھے۔

''سبین...... سبین نے تمہیں بتایا، میرے لیے بہت حیران کر دینے والی خبر ہے کہ تم دونوں میں میرے لیے بات بھی ہوئی۔'' وہ کافی حیران ہوئی۔ وہ سبین کے متعلق اذلان کی ناپسندیدگی سے آگاہ تھی سو اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔

''ہاں...... اوپیرا شو پہ ملی تھی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اسے سارا واقعہ بتانے لگا، لامیہ حیران ہونے کے ساتھ ہنس ہنس کر پاگل ہو رہی تھی۔

ان دونوں کی باتوں میں کتنے ہی پل خاموشی سے سرک گئے۔ موسم کی شدت، اندھیرے کا خوف اور آنے والے لمحات کا ڈر کہیں دور جا چھپے تھے۔ اس چھوٹے سے غار میں اس وقت دوستی کا علم بلند ہو چکا تھا۔

❁......❁......❁

سفید حویلی کے جس کمرے میں بخور (لوبان) کی مہک پھیلی ہوتی تھی اس وقت وہاں خوف کا پہرا تھا۔ نور بی بی مصلی بچھائے مسلسل دعاؤں میں مصروف تھیں، آنسوؤں نے ان کے شفاف چہرے کو بھگو رکھا تھا۔ ان کی ٹانگیں طویل قیام کے باعث سن ہونے لگی تھیں لیکن وہ دعا کی قبولیت سے پہلے وہاں سے نہ ہلنے کا ارادہ کر چکی تھیں۔ گل کئی بار کمرے میں آ کر ان کو دیکھ چکی تھی اور ان کو مسلسل ایک ہی حالت میں دیکھ کر تشویش کا شکار ہو رہی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے کسی کو کچھ بھی بتانے سے منع کر رکھا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ اس نے کیوں نور العین کو بی جان والی باتیں بتائیں، وہ اپنی طرف سے اسے خوشی کا پیغام سنائے شاداں شاداں حویلی میں چلی آئی اور جب چند لمحوں بعد باہر آئی تو وہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے سمجھا کہیں ادھر ادھر چلی گئی ہوں گی لیکن اس کا یہ خیال چند منٹوں بعد خاک نشین ہوا۔ اس نے یوسف کو بھاگے بھاگے اس طرف آتے دیکھا تو کسی انہونی کا خیال ہوا اور ساتھ ہی خود بخود ہاتھ سینے پہ چلا گیا۔ اللہ خیر کرے کہتے ہوئے اس کی جانب بڑھی اور اس سے ملنے والی خبر نے اس کے وجود میں بے چینیوں کا پارہ بھر دیا۔ وہ ان ہی قدموں حویلی کے گیٹ کی جانب بھاگی اور اسی حالت میں دروازہ پار کرتے ہوئے سڑک پہ آئی لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی تھی۔

''آئے ہائے یوسف...... کیا قیامت آ گئی، تو نے روکا کیوں نہیں، مجھے بلا لیا ہوتا خود ہی دروازے کے آگے خندق کی طرح گڑ جاتا...... یہ کیا ہو گیا یوسف؟'' وہ زور زور سے اپنا سینہ پیٹنے لگی تھی۔

''اس طرح تماشہ کر کے سب میں ڈھنڈیا مت مچاؤ، اندر جاؤ اور کسی کو صورت حال سے آگاہ کرو۔'' یوسف نے اس کے ہاتھ روکتے ہوئے سمجھداری سے کام لیا کیوں کہ وہ جانتا تھا کسی ایک ملازم کی نگاہ میں یہ بات آ جاتی تو زبان جیسا تیز دھار آلہ حویلی کی دیواروں کو مسخ کر دیتا۔

وہ خود پہ ضبط کرتی حویلی کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ آئی۔ بی جان کی جہاندیدہ نگاہوں نے پہلی فرصت میں اس کی آنکھوں میں درج غم پڑھ لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ پوچھتیں وہ خود ہی ان کے قدموں میں آن بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا گل...... یہ جاہلوں کی طرح منہ پھاڑ کے کیوں رو رہی ہو؟'' انہیں اس کے رونے سے خوف آیا بلکہ کوئی منظر

آنکھوں میں کانچ کی طرح چبھا۔ کئی سال پہلے بھی تو وہ ایسی ہی روئی تھی، جس طرح آسمان اور ان کی آنکھیں کھل کر برسی تھیں۔

''بی جان...... مجھے معاف کردیں۔ بڑی غلطی ہوگئی جی مجھے معاف کردیں۔'' وہ گڑگڑا رہی تھی۔

''گل سیدھی طرح بات بتا۔'' انہیں وحشت ہونے لگی۔

جو بات انہیں اس سے سننے کو ملی تھی اس نے ان کے اعصاب شل کردیے تھے۔ وہ کئی لمحے ساکت سی وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں۔ وہ اس بات پہ یقین کر ہی نہیں پائی کہ وہ لڑکی جو اپنے حصے کا آسمان چار دیواری کے اندر بھی ڈرتے ڈرتے دیکھتی ہو وہ اتنی بڑی جسارت کیسے کرے گی۔ جو ان کا پلو پکڑے حویلی کی راہ داریوں میں چلتی تھی وہ دنیا کی بھیڑ میں تن تنہا کیسے نکل گئی؟ کوئی ایک نقطہ بھی ایسا نہیں تھا جس کے بل بوتے پہ وہ یقین کرسکیں۔

''کیا کوئی اور لڑکا ہے اس کی زندگی میں؟'' اسی سوچ نے ان کے وجود کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ وہ چند قدم چلیں اور رب کے سامنے سجدہ ریز ہوگئیں۔ وہ ایک بار پھر نصیب کے ہاتھوں اتنی بڑی شکست کھانے کی ہمت نہیں رکھتی تھیں سو اس قدرت والے کے سامنے دامن پھیلائے بیٹھ گئی تھیں۔ یہ خبر زیادہ دیر دونوں بہوؤں سے چھپی نہیں رہی تھی۔ شیماء بیگم کی آنکھوں میں آنسو تھے، اس لیے نہیں کہ انہیں حویلی کی عزت کی پروا تھی بلکہ اس لیے کہ یہ جسارت کرنے والی انہیں اپنی بیٹی جیسی لگتی تھی، ان کے بیٹوں کو بہن کا پیار اس سے ملتا تھا، ان کی بیٹی کی تشنہ خواہش اس کے دم سے پوری ہوتی تھی۔ وہ بی جان کی سرخ نگاہوں کو دیکھ نہیں پائیں اسی لیے اپنے کمرے میں سجدہ ریز تھیں کہ کسی مرد کے آنے سے پہلے یہ قیامت ٹل جائے۔ ان کے برعکس حورالعین کسی چیل کی طرح بی جان کے کمرے پہ جھپٹی تھی۔ وہ سب کچھ تہس نہس کردینا چاہتی تھی۔

''کہاں ہے میری بیٹی؟ آپ نے مجھ سے اس کو چھینا تھا ناں، میری بلکتی ماما کو اپنے اس سفید آنچل کے پار کھڑا رکھا تھا ناں، اب بتایئے کہاں ہے میری بیٹی؟ مجھ سے اپنے بدلے کی بھینٹ چڑھانے کے لیے آپ کو میری بیٹی ہی ملی تھی؟'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔

''حور...... جاؤ اور جا کر دعا کرو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ اس کی بدتہذیبی کو کڑوے گھونٹ کی مانند پی گئیں کہ اس وقت انہیں کسی چیز سے سروکار نہیں تھا۔

''اتنی پرسکون ہونے کا ڈرامہ آپ کرسکتی ہیں میں نہیں...... آپ، آپ کی حویلی اور اس حویلی کے قانون مجھے، میری زندگی اور میری اولاد کو کھا گئے۔ اس بار میں اپنی بیٹی آپ کے اصولوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی...... کچھ غلط نہیں کرنے دوں گی۔'' وہ مسلسل چیخ رہی تھی۔ انہوں نے گل کو اسے لے جانے کا اشارہ کیا اور زبردستی کرکے وہ اسے وہاں سے لے گئی تھی۔

وہ دوبارہ سجدہ ریز ہوئیں۔ آج وہ پھر اپنی دعاؤں کا اثر دیکھنا چاہتی تھیں شاید اپنی بندگی کا صلہ مانگنے والی تھیں۔

❁......❁......❁

وہ صحن میں لیٹی کھلے آسمان تلے تارے گننے میں مصروف تھی۔ اس کی خاموشی بتا رہی تھی کہ اس کے ذہن میں سوچوں کا انبار ادھم مچائے ہوئے تھا۔ اس سے دو ہاتھ کے فاصلے پہ رشیدہ بیگم کا بستر لگا ہوا تھا لیکن وہ بستر کی بجائے صحن کے ایک کونے میں جائے نماز بچھائے عبادت میں مصروف تھیں۔ وہ مسلسل اپنی ٹانگوں کو ہلا رہی تھی جس کے باعث صحن میں ہلکا سا شور پیدا ہو رہا تھا جو ان کی عبادت میں خلل پیدا کر رہا تھا۔ وہ اس معمولی شور کو نظر انداز کردیتیں لیکن اس کے گنگنانے کی آواز ان کے ارتکاز کو ختم کیے جارہی تھی۔

''مجھے ایسے گھورنے سے کچھ نہیں ہونے والا، آپ کو پتا ہے ناں جب تک آپ نہیں لیٹیں گی مجھے نیند نہیں آئے گی پھر بھی آپ نے آدھی رات گزار دی۔ ویسے بھی کچھ مسئلے حل کرنے کے لیے صرف دعائیں نہیں مانگنی پڑتیں بلکہ دماغ اور ہاتھوں کا استعمال بھی ضروری ہوتا ہے۔'' وہ چت لیٹے ہوئے بھی جانتی تھی کہ امی اسے گھور رہی ہیں تب ہی اس نے جواب دیا۔ ویسے بھی اکثر وہ اس کے بلانے پہ ہی اپنی عبادات کا سلسلہ ختم کرتی تھیں۔

''تم نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ماں کو سکون نہیں لینے دینا۔'' وہ جانتی تھیں کہ عزت کسی طرح باز آنے والی نہیں اسی لیے جائے نماز تہہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''اور یہ تم کیا کہہ رہی تھی کہ کچھ مسئلے دعاؤں سے حل نہیں ہوتے؟'' وہ بستر پہ بیٹھتے

ہوئے اس سے مخاطب ہوئیں۔
''ہاں یہ ہی کہا۔'' اس نے لیٹے لیٹے ہی کندھے اچکائے۔
''تم ابھی زندگی کے اس دورا ہے پہ نہیں آئی عزت ورنہ جان لوگی، کچھ مقام ایسے آتے ہیں کہ ہاتھ اٹھانے، سر جھکانے اور نگاہیں فلک پہ ٹکانے کے سوا کوئی چارا نہیں رہتا۔ بڑے ذہین وفطین دماغ اکثر شکست کھا جاتے ہیں، طاقت کے نشے میں چور لوگوں کو چاروں شانے چت ہوتے دیکھا ہے۔'' وہ نہایت دھیمی آواز میں بولیں جیسے خودکلامی کررہی ہوں۔
''امی...... آپ جن مسئلوں میں الجھی ہیں ان کا حل بہت آسان ہے۔ آپ حازم بھائی کو دکانوں کا کرایہ لینے کیوں نہیں بھیجتیں، ان کے سامنے وہ لوگ کچھ کر بھی نہیں سکیں گے اور اگر کچھ کیا بھی تو حازم بھائی سبق سکھا کے آئیں گے۔'' انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کہی لیکن وہ ان کی پریشانیوں سے آگاہ تھی۔
''عزت...... تمہیں خرچے میں کوئی تنگی ہورہی ہے جو بار بار ایک ہی موضوع کھول کر بیٹھ جاتی ہو۔'' وہ اس کی تکرار سے عاجز آنے لگیں۔
''امی...... یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں؟ مجھے صاف نظر آرہا ہے کہ آپ پریشان ہیں تو کیا مجھے آپ کو پریشان دیکھ کر خوش ہونا چاہیے؟ آپ کے چہرے پہ نظر آتے فکرمندی کے سائے مجھے مطمئن نہیں رہنے دیتے۔ مجھے سب نظر آرہا ہے آپ روزانہ میمونہ خالہ سے پیسے لے رہی ہیں، گھر کے راشن میں کئی چیزیں ختم ہوگئی ہیں اور آپ کہتی ہیں میں پریشان نہ ہوں۔'' وہ اب اٹھ کے بیٹھ گئی اور ان کی جانب دیکھ کر سوال کرنے لگی۔
''کیا میمونہ نے تم سے کچھ کہا ہے؟'' وہ اس کی بات سن کر پریشان ہوئیں۔
''نہیں امی۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا لیکن آپ یہ کیوں سمجھتی ہیں کہ میں دودھ پیتی بچی ہوں اور یہ عام سی باتیں مجھ سے چھپی رہ جائیں گی۔'' اس نے سراپنے ہاتھوں پہ ٹکالیا، وہ انہیں کسی طریقے سے کچھ بھی سمجھا نہیں پارہی تھی۔
''اچھا ٹھیک ہے، اب زیادہ باتیں نہ کرو، میں دیکھتی ہوں یہ مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔'' وہ اب مزید اس کے سوالوں کا سامنا نہیں کرنا چاہ رہی تھیں سو بات ختم کرنا مناسب لگا۔
''امی...... مجھے پتا ہے آپ یہ مسئلہ حل کرلیں گی اور بچپن سے آج تک آپ کو ہی سب کرتے دیکھا ہے۔ مجھے صرف یہ ڈر ہے کہ دکان دار ہمیں دو بے آسرا عورتیں سمجھ کر کوئی ہیر پھیر نہ کردے اور ویسے بھی مجھے آپ کا خالہ سے پیسے مانگنا اچھا نہیں لگتا۔'' اس کا جوش تقریباً ٹھنڈا پڑ گیا تب ہی وہ دھیمے لہجے میں بات کررہی تھی۔
''اچھا اب سوجاؤ پھر صبح کہتی رہوگی کہ میری وجہ سے یونیورسٹی سے لیٹ ہوگئی۔'' انہوں نے بات ہی ختم کی اور چادر سیدھی کرتے ہوئے لیٹنے کی تیاری کرنے لگیں۔
وہ چند لمحے بے بس نظروں سے انہیں دیکھتی رہی کہ مجال ہے کسی معاملے میں اس کی بات سن لی جائے لیکن دوسری طرف کوئی اثر نہیں تھا سو وہ بھی منہ ہی منہ میں بولتی دوبارہ لیٹ گئی تھی۔

❁......❁......❁

رقص وسرور کی محفل اپنی انتہاؤں کو پہنچی ہوئی تھی۔ گلی میں موجود ہر چوبارے سے بے ہنگم اور ہیجان آمیز گانوں کی آوازیں کان پھاڑے دے رہی تھیں۔ رات کا پردہ رکھنے والی فطرت سے آگاہی کے سبب سب وہاں رات کا فائدہ اٹھانے میں مگن تھے۔ چوبارے کے ہر کونے میں بل کھاتی، اٹھلاتی لڑکیاں اپنی ناگن سی ادائیں دکھانے میں مصروف اور ہر گزرنے والے کو اپنے اشاروں سے متوجہ کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھیں۔ سب کی بھرپور کوشش کے بعد بھی جو رش نین تارا کے چوبارے پہ تھا وہ اس گلی کیا پورے لاہور میں بھی کسی کے نصیب میں نہیں تھا۔ ایک خلقت جو شام ڈھلے نین تارا کے چوبارے پہ حاضری دینے کی غرض سے آئی تھی لیکن رات گہری ہونے کے باوجود انتظار کی لوسلگ رہی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں بے چینی انگڑائی لے رہی تھی لیکن دید کا شوق بے چینی کا گلا گھونٹنے میں کامیاب ہورہا تھا۔ نین تارا اپنے مکمل سہولتوں سے آراستہ کمرے میں مسلسل ٹہل رہی تھی۔ کبھی چلتے چلتے کمرے کی دیوار میں نصب کھڑکی سے پردہ اٹھاتے ہوئے گلی میں موجود لوگوں کا ہجوم دیکھتی

اور کبھی دیوار گیر گھڑی پہ وقت کی تیز رفتار پہ ٹھنڈی آہ بھرتی لیکن اپنی پریشانی کا حل اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ ہر اس لڑکی کو نازنین کے پاس بھیج چکی تھی جس کی ذرہ بھر بات سنے جانے کی اسے امید تھی لیکن سب خالی سوال لیے واپس آئی تھیں۔ وہ ایک چالاک اور اپنے دھندے کی ماہر عورت تھی، چند فٹ کے فاصلے سے بھی باہر کھڑی عوام کے چہرے پہ انتظار کی حد ختم ہوتے دیکھ رہی تھی اور اس سے پہلے کہ معاملہ اس کے ہاتھ سے نکلتا اسے راشی کا خیال آیا۔ وہ اسے بلانے کی بجائے خود اس کے پاس جانے کے لیے کمرے سے باہر نکل آئی کیونکہ اسے بلانے کا مطلب تھا مزید کئی گھنٹے ضائع کر دینا۔

نین تارا نے ہال کے دوسری طرف بنے کمرے کا دروازہ کھولا تو دھویں کا غبار اس کی سانسوں میں داخل ہوتے ہوئے سانس لینے میں مشکل پیدا کرنے لگا، کوئی اور وقت ہوتا تو وہاں آنا گوارا نہ کرتی اور اگر آتی تو اس پل اسے بے نقط سنانے سے باز نہ آتی لیکن مجبوری کے تحت وہ یہ دونوں کام نظر انداز کر گئی تھی۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے کمرے کی کھڑکی کھولی کہ دھویں سے جان چھوٹ سکے لیکن اسے وہاں سانس لینے میں آسانی محسوس کرنے میں چند لمحے مزید سرک گئے تھے۔

''تم میرے کمرے میں آج کیسے چلی آئیں؟'' اس نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے دھواں اس کی جانب چھوڑتے ہوئے سوال کیا۔

''ظاہر ہے ضرورت کے تحت ہی آئی ہوں۔'' اس نے ناگواری سے دھواں ہاتھ سے ہٹانے کی کوشش کی، کوئی اور وقت ہوتا تو اس حرکت کو معاف کرنے والی نہیں تھی لیکن آج اسے ضبط کرنا تھا اور وہ بھی اس کے ضبط کا مکمل امتحان لینے پہ آمادہ تھا۔

''ضرور نازنین تمہارے ہاتھ نہیں آ رہی ورنہ تمہاری کوئی ضرورت تمہیں مجھ تک نہیں لاتی۔'' اس کے ہونٹوں پہ ایک چالاک مسکراہٹ ابھری جیسے اسے اپنی بات پہ مکمل یقین ہو۔

''دیکھو راشی، باہر ایک خلقت کھڑی ہے اور اگر یہ لوگ ایسے ہی بنا مطلب پورا کیے چلے گئے تو نقصان ہم سب کے حصے میں آئے گا۔ اس لیے عقل کا تقاضا یہ ہی ہے کہ نازنین کو راضی کرو کہ وہ آج محفل سجا لے، زیادہ نہیں تو ایک آدھ رقص کر دے باقی میں لڑکیوں سے کروالوں گی۔'' اس کے لہجے سے خوش آمدی کی مہک امڈ رہی تھی۔

''لالی کا جسم لہولہان کرنے سے پہلے یہ سوچتی ناں...... وہ اسے کسی ناکسی طرح راضی کر لیتا۔'' اس کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نین تارا کی بات ماننے والا نہیں۔

''اب ہو گیا نا جو ہونا تھا، میں تمہیں اس سے بات کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں۔'' اب نین تارا نے لہجے میں موجود تلخی بالکل ہی ختم کر دی تھی۔

''بات یہ ہے نین تارا کہ مجھے تجھ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، چند ہزار میرے ہاتھ پہ پھینک کر یہ سمجھتی ہے میری قیمت پوری ہو گئی جب کہ سچ یہ ہے میری داڑھ بھی تیرے پیسوں سے گیلی نہیں ہوتی اور نازنین میرے ہاتھ پھلانے سے پہلے میرے تکیے تلے نوٹوں کی گڈیوں کے ساتھ اپنی محبت باندھ کر رکھ جاتی ہے اس لیے اب تو ہی فیصلہ کر لے تیرے چند ہزار پلڑے میں بھاری ہے کہ اس کی نوٹوں کی گڈیاں مع اس کی محبت......؟'' وہ اپنے بستر سے اٹھا اور تلخ مسکراہٹ لیے اس کے بالکل پاس آن کھڑا ہوا۔

''میں اپنے راستے کی ساری رکاوٹیں ہٹانا جانتی ہے۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ ''یہ عوام ابھی اسے سر آنکھوں پہ بٹھاتی ہے جب یہ ہی منہ پھیر لے گی تو کہاں سے آئیں گی نوٹوں کی گڈیاں؟'' اس نے ایک اور ناکام کوشش کی۔

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ لوگ نازنین سے منہ پھیر لیں گے۔ بازارِ حسن میں اس کا سکہ چلتا ہے، ابھی اس کا زمانہ ہے اور زمانے کہاں جلدی گزرتے ہیں؟'' وہ اس کی کسی بھی بات سے متفق نہیں ہو رہا تھا۔ ''تمہارا بھی تو زمانہ تھا نین تارا اور دیکھو میں اب بھی اسی زمانے کا قیدی ہوں تب ہی تو تمہارے در پہ پڑا ہوں۔'' اس نے قہقہہ لگایا تو وہ غصے سے چند پل اسے دیکھتی رہی اور پاؤں پٹختی واپس مڑ گئی۔ آج کا دن خراب تھا اور اب اسے یقین آ گیا تھا۔

''ایک شرط پہ کوشش ہو سکتی ہے۔'' اس کا دروازہ کھولتا ہاتھ چند لمحے ساکت ہوا اور وہ بخوشی واپس مڑی۔

''تم جتنے پیسے کہو گے تمہیں مل جائیں گے۔'' وہ فوراً واپس اس تک آئی۔

''پیسوں کی بات کس کمبخت نے کی؟'' اس کے چہرے پہ کمینی سی خوشی پھیل گئی تھی۔
''پھر......'' وہ جی بھر کے حیران ہوئی۔
''ایک عرصہ ہوگیا تمہارے وجود کی خوشبو محسوس کیے ہوئے، تمہارے نینوں کی شراب پیے ہوئے، ایک خالی جام بن گیا ہوں اور تم جیسا ساقی ملنے کی خواہش جسم میں انگڑائی لے رہی ہے۔ کچھ لمحے ہمارے نصیب میں بھی لکھ دو......'' وہ قدم قدم چلتا اس کے بالکل پاس آیا، نین تارا کو اس سے عجیب سی کراہت محسوس ہوئی۔ وہ اس لمحے کو کوسنے لگی جب اس نے یہاں آنے کا سوچا تھا۔ وہ سالوں پہلے ایسی ہی بھول کا شکار ہوئی تھی جس کے بعد یہ منحوس کسی آسیب کی طرح آج تک اس کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔
''اپنی حد میں رہا کرو۔'' اس نے ایک زور کا دھکا سامنے کھڑے انسان کو دیا کہ وہ لڑکھڑاتا ہوا واپس اپنے بستر پہ گرا۔ ''تم اگر نازنین کے باپ نہ ہوتے تو ٹھڈے مار کر یہاں سے نکلوا دیتی۔'' وہ آناً فاناً وہاں سے نکل گئی اور اس کے پیچھے چھت پھاڑ قہقہہ کی گونج رہ گئی تھی۔

❋......❋......❋

وہ خوف زدہ نگاہوں سے سیاہ دروازے کی جانب دیکھ رہے تھے جہاں ان کا اکلوتا بیٹا بڑے اعتماد کے ساتھ جا رہا تھا۔ ان کے دل میں ہزار وسوسے پیدا ہو رہے تھے اور وہ ہر خوف کو رد کرتا ہوا اپنی سوچ پہ عمل پیرا تھا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے دروازہ کھلا اور بڑی سی گاڑی لمحے میں ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ گاڑی سے نکلنے والا مسکراتا ہوا ضیغم سے ہاتھ ملا رہا تھا لیکن اس کے چہرے پہ پریشانی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ یوں ہی دھیما سا مسکراتا ہوا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کا دراز قد، آنکھوں کی چمک اور جوانی کے جوبن کا مظہر چہرہ دل میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔
''السلام علیکم!'' شائستگی سے کیے جانے والے سلام نے ان کے خدشات تقریباً کم کر دیے تھے۔
''ابو...... یہ تاشفین علی چٹھہ، سعید احمد صاحب کے بیٹے ہیں۔'' وہ اس سے ہاتھ ملا رہے تھے کہ ضیغم نے آنے والے کا تعاف کروایا۔
''مہمان کو اندر لے آ پتر میں ان کی تواضع کے لیے کچھ لاتا ہوں۔'' وہ ان دونوں کو اکیلا چھوڑنے کی غرض سے وہاں سے ہٹ جانا چاہتے تھے۔
''نہیں، کسی تواضع کی ضرورت نہیں، رات بہت ہوگئی ہے آپ آرام کیجیے۔'' وہ انہیں جتنا پراعتماد لگا تھا اس لمحہ اس کے انداز سے وہ اعتماد جھلک نہیں رہا تھا اور شاید اس کی وجہ سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ رات کے اس وقت وہ کسی غیر کے گھر سے اپنے گھر کی لڑکی لینے آیا تھا اس لیے اس کی جھجک وہ سمجھ رہے تھے۔
''آپ جیسے اونچے لوگ تو کبھی کبھی آتے ہیں، ہم غریبوں کو اپنی خدمت کرنے دیں، ویسے بھی بٹیا رانی بھی بھوکی ہے اسی بہانے وہ بھی کچھ کھا لے گی۔'' ان کے لہجے میں اتنا مان تھا کہ وہ کچھ بول نہیں پایا۔
ان کی نگاہیں زمین پہ گڑی تھیں اور دماغ میں سوچوں کا طوفان ادھم مچائے ہوئے تھا۔ وہ گاؤں کے لیے نکل رہے تھے جب ضیغم کی کال آئی تھی، انہوں نے معمول کے مطابق اس کی کال اٹھائی لیکن اس کی بات نے ان کی نگاہوں کے سامنے سارا منظر دھندلا کر دیا تھا۔ انہیں چند لمحے سمجھ نہیں آیا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دیں سوائے نور العین کا خیال رکھنے کا کہتے ہوئے اندھا دھند گاڑی چلائی تھی۔ وہ ہمیشہ قانون پہ عمل کرنے والے انسان تھے لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے کتنے اشارے توڑے اور ٹریفک قوانین کی کتنی خلاف ورزی کی کیونکہ ان کا بس نہیں چل رہا تھا لمحے سے پہلے وہ ضیغم کے گھر پہنچ جائیں۔ وہ ضیغم کی طبیعت سے واقف تھے، انہیں اندازہ تھا کہ وہ ایک سلجھا ہوا لڑکا ہے اور سب سے بڑھ کر اس نے سب سے پہلے انہیں فون ملایا لیکن اس کے باوجود وہ خود کو پرسکون نہیں کر پا رہے تھے۔ نوری ہمیشہ سے انہیں اپنی بہنوں جیسی عزیز رہی تھی لیکن اس وقت ان کے ہاتھ کوئی سرا نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایسی حرکت کیوں کی۔ وہ زندگی کی تیز ترین رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے یہاں پہنچے تھے، ابھی تک نوری کو نہیں دیکھا تھا لیکن یہاں ضیغم کے والد کو پا کر وہ قدرے پرسکون ہو گئے تھے۔ کئی خدشات اس

لمحے دم توڑ گئے تھے۔
''بھائی..... آیئے اندر چلتے ہیں۔''ضیغم کی آواز نے اس کی سوچوں کا تسلسل توڑا۔
''ہم..... چلو۔'' وقت کی گزرتی رفتار انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارا بھی نہیں تھا۔
وہ حویلی کی صورت حال سے یکسر انجان تھے۔ وہ اس بات پہ بھی حیرت زدہ تھے کہ ابھی تک حویلی سے انہیں کوئی اطلاع نہیں آئی تھی، کیا کسی کو نوری کے چلے جانے کا علم نہیں تھا یا اس کے چلے جانے کو چھپایا گیا تھا۔ کئی سوال تھے جن کے جواب تلاش کیے بغیر انہیں سکون ملنے والا نہیں تھا۔ وہ ضیغم کی معیت میں ڈرائنگ روم نما کمرے میں داخل ہوئے، نوری کو وہاں بھی نہ پا کر انہیں تشویش ہوئی۔
''وہ دوسرے کمرے میں ہیں۔'' ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ضیغم کی جانب سے جواب آیا اور وہ اس کے جواب پہ سر ہلا رہے تھے کہ کوئی دروازے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ انہوں نے حیران نگاہوں سے آنے والے کو دیکھا۔
''تاشفین بھائی.....!'' اس نے ڈرے سہمے لہجے میں مدہم آواز سے انہیں پکارا، وہ جو باہر سے آنے والی آوازوں پہ باہر آئی تھی اسے امید نہیں تھی آنے والا سفید حویلی سے کوئی ہوگا۔ اس لمحے اس کے وجود میں سنسنی سی دوڑی تھی یعنی کہ اسے ڈھونڈ لیا گیا تھا لیکن اتنی جلدی یہ ممکن کیسے ہوا تھا؟
''ضیغم..... ہمیں اب چلنا چاہیے۔'' وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے، وہ سارا راستہ ایک ایک سانس کے ساتھ یہ دعا کرتے آئے تھے کہ یہ خبر جھوٹی ہو، ضیغم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو لیکن اب اسے سامنے دیکھ کر ان کے وجود میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ وہ حویلی کی نئی نسل میں سے تھے، سوچ میں جدت آ گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ حویلی کی عورتوں کے کسی ایسے اقدام کی امید نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دھچکا اس لیے بھی شدید تھا کہ نور العین سے اس حماقت کی توقع انہیں ایک فیصد بھی نہیں تھی۔
''ضیغم..... امید ہے تم آگے بھی عبدالودود یا کسی اور کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔'' نور العین کو گاڑی میں بٹھانے کے بعد وہ اس تک آئے اور ایک بار پھر اسے یقین دہانی کرانا نہیں بھولے۔
''آپ بے فکر رہیں، مجھے عبدالودود کی جذباتیت کا اندازہ تھا اسی لیے میں نے اس کے بجائے آپ کو کال کی۔'' وہ ان کے سامنے آنکھیں اٹھائے کھڑا تھا اور انہیں اس کی آنکھوں سے چھلکتے اعتماد نے یقین کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔
انہوں نے عباس علی سے الوداعی کلمات کہے اور سیاہ دروازے سے گاڑی نکال لے گئے۔ سفید حویلی کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اور وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آگے صورت حال کیا ہوگی۔ انہیں رات کے اندھیرے کا فائدہ ملے گا یا یہ اندھیرا ہی کسی کالک کی طرح ان کے وجود کو ڈھانپ لے گا۔ وہ حویلی جانے سے پہلے نور العین سے سب جان لینا چاہتے تھے۔ وہ اس سے سوال کرنے ہی والے تھے کہ موبائل کی گونج نے متوجہ کر لیا۔ اسکرین پہ چمکتا نام نظر انداز کرنے والا نہیں تھا، انہوں نے فون اٹھایا اور ساتھ بیٹھی نور العین کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ ہو گیا ہے۔ انہوں نے کال بند کی، چند لمحے آنکھیں بند کر کے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی جیسے غم کو چھپانا چاہتے ہوں اور ایک دم گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ وہ جس رفتار سے گاڑی چلا رہے تھے نور العین کے لیے آرام سے بیٹھنا محال تھا۔ وہ پوچھ بھی نہیں پا رہی تھی کہ ایسا کیا ہوا ہے جس نے ان کی ایسی حالت کر دی ہے، اسے جواب مل گیا تھا لیکن وقت کے جاں گسل عذاب کو سہنے کے بعد گاڑی رک گئی اور اس کے ساتھ ہی نور العین کی نگاہیں ساکت رہ گئی تھیں۔ بڑا سا داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کھلے دروازے سے اسے سامنے بچھے سفید کپڑے بخوبی نظر آ رہے تھے۔ اس نے ساتھ بیٹھے شخص کو دیکھا کہ شاید کوئی جواب مل جائے لیکن وہاں مکمل خاموشی تھی۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ شمارے میں)

"پڑھو، س سے سورج۔" فرح نے ساڑھے تین سالہ مریم کو دائیں کان سے پکڑ کر قاعدے پر انگلی رکھوائی۔

"شین سے سورج۔" وہ معصومیت سے آنکھیں بھینچتی بولی۔

"میں کہتی ہوں سین بولو۔ جب سورج کو شورج نہیں بولتی تو س کو ش کیوں کہہ رہی ہو۔" وہ مزید غصے سے گویا ہوئی۔

"شہ...... شین......" وہ کوشش کر رہی تھی لیکن زبان پر 'س' چڑھ نہیں رہا تھا۔

"اف...... اب ایک الٹے ہاتھ کا تھپڑ لگا دوں گی۔ خبردار جواب شین کہا تو۔" وہ مزید دس منٹ اس سے س بلواتے ہوئے آدھی ہو چکی تھی۔ جب مریم نے 'س' سے سورج کہا تو اس نے ش سے شلجم پر انگلی رکھوائی۔

"پڑھو ش سے شلجم۔"

"ش سے سلجم۔" مریم نے روتے ہوئے کہا۔ اس نے دانت پیسے اور پھر بیچ میں اسے تھپڑ مارنے ہی والی تھی کہ اماں غسل خانے سے نہا کر برآمد ہوئیں۔

"اری کمبخت، نالائق، بارہویں فیل، تجھے شرم نہیں آتی اتنی سی بچی پر ہاتھ اٹھاتے۔ اس کی عمر میں تو، تو بس چوں چوں کرتی تھی چوزوں کی طرح۔ چلی ہے شین سین پر پٹائی کرنے۔ اٹھ یہاں سے۔ میرب...... اری میرب، کہاں ہے تو؟ یہ تو جان لے لے گی بچوں کی۔ کیسی ناہنجار استانی کے ہاتھ چھوڑ گئی ان بیچاروں کو۔" ستارہ بیگم نے کلس کر چھت پر کپڑے پھیلاتی میرب کو آواز دی۔

"بس اماں تھوڑے سے رہ گئے۔" اس نے منڈیر سے جھانک کر جواب دیا۔

"اماں......" فرح ہکا بکا سی منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔

آنسو ٹپ ٹپ بہہ رہے تھے۔
"اماں...... ان کلموہے ننگ دھڑنگوں کے سامنے اتنی بے عزتی۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" وہ مریم کو خود سے دور کرتی منہ پر ڈوپٹہ رکھے کمرے کی طرف بھاگی اور کنڈی لگالی۔
"میں تو سوتیلی ہوں جو بات بے بات اتنی بے عزتی۔ اٹھنے بیٹھنے پر ٹوکتی ہیں کہ لڑکیوں کی طرح اٹھو، لڑکیوں کی طرح بیٹھو۔ کھانے پر ٹوکتی ہیں کہ ایسے نہیں کھاتے۔ چلنے پر ٹوکتی ہیں کہ اکڑ کر نہ چلو عورتوں کی طرح چلا کرو۔ نہیں مطلب کسی بات پر تو بخش دیں۔ اب مجھے بچپن میں ڈھنگ سے پڑھایا جاتا تو اب تک باجی کی طرح بی اے پاس کرلیا ہوتا۔ بنیاد ہی صحیح نہیں بنائی۔ اب اگر بچوں کو ڈھنگ سے پڑھاتی ہوں تو سو سو سناتی ہیں، بے عزت کرتی ہیں۔" وہ رندھی آواز میں بول رہی تھی۔
"اللہ کرے جلد میری شادی ہو جائے اور یہاں سے جان چھوٹے۔ دوبارہ قدم نہیں دھروں گی اس گھر میں۔ میاں سے کہوں گی دبئی لے جائے مجھے۔ اماں میری شکل دیکھنے کو ترسیں گی آمین۔" اس نے منہ پر دونوں ہاتھ پھیر کر مستقبل کا نقشہ کھینچا۔ باہر سے اماں کے بڑبڑانے کی آوازیں ہنوز کانوں میں پڑ رہی تھیں۔
"بے شرم کہیں کی۔ دو لفظ کیا کہہ دو اس کو کمرے میں جاکر کنڈی ہی لگا لے گی۔ بھئی ہمارے زمانے میں تو یہ رنگ ڈھنگ نہ تھے لڑکیوں کے۔ اماں باوا کچھ کہہ دیتے تھے تو ہم ڈانٹ ڈپٹ کو بھی سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ کبھی برا نہ منایا کہ ہمارا ہی بھلا سوچتے ہیں۔ آج کل کی اولاد...... توبہ توبہ۔" ستارہ بیگم نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور چھالیاں کترنے لگیں، اتنے میں رفیق میاں بیرونی دروازے سے داخل ہوئے۔ سائیکل کی گھنٹی کی آواز شاید فرح تک نہ پہنچی تھی۔ وہ بلند آواز سے چلائی اور اب بے سروپا باتیں کر رہی تھی۔
"بہت بری ہوں ناں میں تو ایسا کریں مجھے مار ڈالیں، گلا دبا دیں یا میں خود ہی پھانسی لے لیتی ہوں۔ جان چھوٹے گی آپ کی اور ابا میاں کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ باہر تو ایسے جانے نہیں دیتے ابا جیسے رشید چھلیوں والے یا فقیر احمد کریانے والے کے ساتھ بھاگ جائیں گی میں یا باجی۔ اس محلے میں ایسا ہے ہی کون جو مجھے بھائے گا۔" وہ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔
رفیق میاں کی آنکھیں پل بھر میں انگارہ ہوئیں۔ وہ مزید گل افشانیاں کرتی کہ میرب لکڑی کی سیڑھی سے اترتی نیچے آئی۔
"ابا آگئے آپ۔ میرا جوتا تو لائے ہیں ناں؟ آج پھر اس چپل سے پھسلتے پھسلتے بچی ہوں۔ یوں نہ ہوتا کہ گرنے سے میری کوئی ہڈی پسلی ہی تڑخ جاتی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ رفیق میاں نے سائیکل کی طرف اشارہ کیا جہاں ہینڈل سے جوتوں کے ڈبے والا شاپر لٹک رہا تھا۔
"بچو...... تم لوگ اب چھٹی کرو۔ کل وقت سے آجانا۔" میرب نے کہا۔
"ابا......" فرح نے دانتوں تلے زبان دبائی پھر بھاگ کر کنڈی کھولی اور رفیق میاں کے پیروں سے لپٹ گئی۔
"ابا معاف کردیں۔ معاف کردیں آپ کو پتا ہے ناں غصے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ آئندہ کچھ فضول نہیں بولوں گی۔ آپ سب ہمارے بھلے کے لیے ہی کہتے ہیں۔ ویسے بھی یہ محلہ اچھا نہیں ہے۔ اسی لیے آپ زیادہ باہر آنے جانے سے منع کرتے ہیں۔" وہ بھاں بھاں کرتی اب گرگٹ کی طرح بدل رہی تھی۔ میرب نے بمشکل ہنسی روکی۔ انہوں نے بے چارگی سے ستارہ بیگم کی طرف دیکھا۔
"آہ ستارہ بیگم...... اس ٹوپی ڈرامے کو ہمارے گھر ہی پیدا ہونا تھا؟" انہوں نے ہمیشہ کی طرح یہی جملہ دہرایا۔ ستارہ بیگم نے ہنسی دبائی۔
"ابا معاف کردیا تو پیروں سے اٹھ جاؤں؟ نیا جوڑا ہے میرا خراب ہو رہا ہے۔" وہ معصومیت سے بولی۔
"ہاں ہاں اٹھ جاؤ اور ایسے پیروں میں نہ بیٹھا کرو۔" انہوں نے اسے گھور کر متنبہ کیا۔ وہ فوراً ہی اٹھی اور سائیکل سے لٹکتے ڈبے کی طرف نظر پڑتے ہی لپکی۔

”اے فرح رک وہ میرے لیے ہے۔“ میرب بھی اسی جانب لپکی۔ تب تک وہ ڈبہ کھول چکی تھی۔ سرمئی رنگ کا عام سا جوتا تھا۔

”اونہہ…… بچ گئی باجی۔ مجھ پر یہ رنگ جچتا تو یہ جوتا میرا ہوتا۔“ وہ منہ بسور کر ستارہ جہاں کے ساتھ آ لگی۔

”ابا…… میرے لیے جو بھی چیز لائیں سرمئی ہی لائیں۔“ میرب ہنس کر بولی۔ وہ اب ستارہ بیگم سے لاڈ کرنے میں مصروف تھی۔

”اماں…… اب نہیں ماروں گی بچوں کو۔ آپ کا کہا بھی مانوں گی اور گھر کا کام بھی کروں گی۔“

”یہ منہ اور مسور کی دال۔“ انہوں نے ناک چڑھا کر کہا۔

”ارے اماں مان بھی جائیں۔ بے چاری بچی ہلکان ہو رہی ہے۔“ میرب نے سفارش کی تو اماں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

روزانہ کا یہی معمول تھا۔ دن میں کئی بار فرح رفیق ایسی غیر معمولی کاروائیاں کر کے معمول کو خراب ہونے نہیں دیتی تھی۔ دو کمروں اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل گھر میں غربت کے سوا کوئی دکھ نہ تھا۔

اگلے دن وہ میرب کے ساتھ خالہ پروین کے ہاں میلاد پر گئی۔ واپسی پر رستے میں آپا مل گئیں تو ساتھ ہو لیں۔

”بھئی اچھا ہوا تم دونوں رستے میں مل گئیں۔ اکیلے ادھر ادھر جاتے جی ہولتا ہے۔ بلڈ پریشر ہے ناں ہمیں اور موئے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ ہمیں ذرا سا ”یوڈک ایسڈ“ (یورک ایسڈ) بھی ہے۔ اب ہم اکیلی جان کہیں رستے میں پھڑک کر گر پڑیں تو؟ بس ہمیں کام ہی ایسا ضروری آن پڑا کہ تم لوگوں کے ہاں جانا ہی پڑا۔ بھئی ہمیں تو محلے کی ہر بہن بیٹی کی فکر ستائے ہے۔ کیا پتا ہمارے ذریعے سے کس کا کام سنور جائے۔ ہمیں بھی کچھ نیکیاں کمانے کا موقع ملے۔“

آپا ”ہمیں“ کی نیکیاں کمانے والی بات پر میرب کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ جبکہ فرح ”ہمیں ہمیں“ کی تکرار سن کر ہمیشہ کی طرح دانت پیس رہی تھی۔

آپا ”ہمیں“ کے نام کا قصہ بس اتنا تھا کہ ان کی اماں ذرا لکھنوی اردو کی دلدادہ تھیں۔ آپا ہمیں کے بچپن میں ہی وفات پا گئی تھیں اور آپا ہمیں ان سے صرف ایک لفظ ”ہمیں“ ہی سیکھ پائی تھیں۔ بکثرت استعمال ”ہمیں“ محلے کیا گاؤں بھر میں اور سب جاننے والوں میں ان کا نام ”آپا ہمیں“ مشہور تھا۔ آپا ہمیں کی ”ہمیں ہمیں“ سنتے وہ دونوں گھر پہنچیں۔ میرب کے بچے پڑھنے والے آئے ہوئے تھے سو وہ ان کو پڑھانے بیٹھ گئی جبکہ فرح نے اماں کی تاکید پر آپا ’ہمیں‘ کے لیے چائے چڑھا دی تھی۔

وہ بڑی دلجمعی سے چائے بنانے میں مصروف تھی۔ ایک یہی کام تو اسے آتا تھا۔ اچانک آپا ’ہمیں‘ کی باتوں پر اس کے کان کھڑے ہوئے۔

”بھئی ستارہ تمہاری بیٹیاں ہماری بیٹیوں کی طرح ہیں۔ برا تو نہ چاہیں گے ہم۔ ایک رشتہ ہے اچھا سا۔ کہو تو بات چلائیں؟“

”آے ہے آپا ’ہمیں‘ ایسے کیسے؟ تفصیلات تو بتاؤ کچھ پہلے۔“ آپا ’ہمیں‘ بچوں سمیت بڑوں کی بھی آپا ہمیں تھیں۔

”بھئی دو ہی لڑکے ہیں اور دونوں کا رشتہ کرنا ہے انہوں نے۔ پولیس میں افسر لگے ہیں۔ لمبا چوڑا خاندان بھی نہیں۔ ایک بہن ہے بس۔ ماں باپ انتقال کر گئے کافی عرصہ پہلے۔ خالہ آگے ہو کر رشتہ کروا رہی ہے۔ بھئی ہمیں تو بہت بھلا لگا رشتہ۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں ماشاءاللہ اور پھر ان کو جہیز کے نام پر بھی کچھ نہیں چاہیے۔ لڑکوں کی خالہ ہماری نند شمائلہ کی جو نند ہے اس کی دیورانی ہے۔ بھئی یہ تو شمائلہ نے بات کی ہم سے۔ ہمیں تو فوراً تمہاری بچیوں کا خیال آیا۔“ آپا ’ہمیں‘ بنا رکے بولتی گئیں۔

کپوں میں چائے ڈالتی فرح نے دانت نکوسے تھے۔

”آئے ہائے پولیس والا…… اوپر سے افسر پھر کھاتے پیتے لوگ۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید خوش ہوتی اماں کی آواز آئی۔

”رشتہ تو اچھا ہے لیکن ان کی بھی کوئی ڈیمانڈ تو ہو گی

ناں۔ ایسے ہی تو افسر لڑکوں کو ہمارے ہاں نہ بیاہ دیں گے پھر جہیز نہ لینے والی بات مجھے کھٹک رہی ہے۔"

"چھری تلے دم لو، تو پوری بات بتائیں۔ ہمیں جیسا شمائلہ نے بتایا تم کو بھی بتائے دیتے ہیں۔ پچھلے سال دونوں بھائیوں نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی تھی۔" آپا ہمیں نے کچھ وقفہ لیا۔ فرح نے غصے سے دانت پیسے۔

"طلاق شدہ پولیس والے؟ در فٹے منہ اس عورت کا۔ اپنی بیٹی بیاہ لیتی۔ کیڑے پڑیں اس کو۔"

"ناں بھلا وہ کیوں؟" ستارہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"پہلے ایک ہی گھر سے دو بہویں لے آئے پھر بہن بھی ان کے ہاں بیاہ دی۔ بس یہیں سے معاملات خراب ہوئے۔ وٹہ سٹہ تو پھر اسی طرح تباہی لاتا ہے۔ اب ان کی بہن جو ہے اس بیچاری کا شوہر غیر عورت کے پیچھے لگا رہا اور طلاق دے گیا۔ دو جڑواں بچوں کو لے کر جب بھائیوں کے پاس آئی تو بڑے نے غصے میں طلاق دے دی بیوی کو۔ چھوٹا تو بیوی رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی بیوی نے خود ہی خلع لے لیا کہ بہن نہیں بسی تو میں کاہے کو بسوں۔ عدالت کے ذریعے ان کی بیویاں بھی اپنے اپنے بچے لے گئیں۔ بہن تو کچھ ماہ پہلے چچا کے بیٹے سے بیاہ دی۔ اب میاں کے ساتھ امریکہ جا رہی ہے تو پہلے بھائیوں کا گھر بستا دیکھنا چاہتی ہے۔ سمجھو اب تو کنوارے ہی ہیں۔ شکل وصورت کے بھی بہت اچھے ہیں۔" پھر تھوڑا رک کر وہ بولیں۔

"کئی جگہ انہوں نے بات چلائی لیکن بات بنی نہیں۔ یہ کوئی کم بدنامی تو نہیں تھی پھر معاشرے کو تو باتیں بنانے کے لیے بس کچھ چاہیے۔ لڑکے کی بہن نے کہا کہ کسی غریب گھر سے لڑکیاں لے آتے ہیں بس لوگ عزت دار ہوں۔ بھئی ہمیں تو یہ مناسب رشتہ لگا پھر تمہاری بڑی بیٹی مانا خوبصورت ہے لیکن چھوٹی کی تو واجبی سی شکل وصورت ہے۔ کون سا شہزادہ آئے گا بیاہنے؟" آپا ہمیں نے بنا لگی لپٹی کہا۔

وہ چائے کے کپ لیے غم وغصے کی ملی جلی کیفیت میں کھڑی تھی پھر آپا ہمیں کو گھورتے ہوئے اس نے تپائی پر ٹرے پٹخی۔ ستارہ بیگم نے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ پیر پٹختی کمرے میں گھس گئی۔ میرب خاموشی سے بچوں میں مصروف تھی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"واجبی شکل؟" اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔

"واجبی شکل ہوگی اس کیڑے پڑتی آپا ہمیں کی، نوکیلے دانتوں والی بیٹی کی۔ کیسے گلہری کی طرح دو دانت باہر نکلے ہیں۔ اس کو تو ڈاکٹر سے بیاہ دیا۔ وہ بھی نہ طلاق شدہ نہ بیوہ۔ عین کنوارہ ڈاکٹر اور میں واجبی شکل کی، کیا کمی ہے مجھ میں؟ ایک رنگ ہی تو ذرا سا سانولا ہے۔" اس نے منہ بسورا۔

"اچھا...... رفیق میاں آتے ہیں تو ان سے بات کرتی ہوں۔ اگر گھر بار اچھا ہے، کھاتے پیتے شریف لوگ ہیں تو دیکھ لیں گے لیکن آپا ہمیں، بات ہضم ہونے والی نہیں۔ تینوں، بہن بھائی طلاق یافتہ۔ تم ایسا کرو کوئی اور رشتہ بھی نظر میں رکھو۔" ستارہ بیگم نے متانت سے کہا۔

"دیکھ لیں گے، دیکھ لیں گے۔ فی الحال ان لوگوں کو تو لڑکیاں دکھاؤ۔ کس دن بھیجوں ان لوگوں کو؟" آپا نے ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہوئے کہا۔

"بھئی کہا ناں رفیق میاں سے مشورہ کروں گی۔" ستارہ بیگم نے اطمینان دلایا۔

❁ ❁ ❁

وہ ابھی تک آئینے میں الجھی واجبی شکل ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کو تو اپنا آپ واجبی نہ لگا۔ چمکتی سنہری رنگت، سیاہ چمکدار آنکھیں، روشن سی پیشانی، سیاہ لمبی زلفیں جن کو وہ چٹیا میں مقید کیے آگے ڈال کر رکھا کرتی تھی۔ دراز قد اور متناسب سراپا اسے دلکش بناتا تھا پھر چہرے کے معصوم سے نقوش۔ کچھ بھی واجبی تو نہ تھا۔ میرب کا رنگ کچھ زیادہ گورا تھا جس کی وجہ سے اسے سانولی کہہ دیا جاتا ورنہ نقوش دونوں نے ستارہ بیگم کے ہی پکڑے تھے اور قد رفیق میاں کا۔

"ہونہہ...... رشتہ لائی بھی تو طلاق شدہ سیکنڈ ہینڈ

پولیس والے کا۔ میاں تو مر ہی چکا ہی اس عورت کو جھیل کر، خود ہی بیاہ کرلے اس سے اور اس کے بچے کو اماں بن کر پال لے ہونہہ۔'' اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اپنا غصہ کس پر نکالے سو کمرے میں ادھر ادھر ٹہل کر وہ آپا ہمیں کو کوسنے دینے لگی۔

''اللہ کرے تیری نوکیلے دانتوں والی بیٹی کا ڈاکٹر میاں آٹھ بچوں کا باپ نکلے۔'' اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور چائے کے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں لا پٹخے۔ آپا ہمیں جا چکی تھی۔

''اماں...... ابا سے بات مت کرنا اس بارے میں۔ مجھے کسی طلاق شدہ سیکنڈ ہینڈ پولیس والے سے بیاہ نہیں کرنا نہ اس کے ایکس وائے زیڈ بچے پالنے ہیں۔'' وہ پسلیوں پر ہاتھ دھرے نخوت سے بولی تو ستارہ بیگم نے اسے گھورا۔

''آ لینے دے تیرے ابا کو بتاتی ہوں تیری زبان کتنی چلنے لگی ہے۔''

''فرح...... شادی ''شدہ'' ہوتا ہے اور طلاق ''یافتہ۔'' یہ طلاق شدہ تم نے نئی اصطلاح متعارف کروائی۔'' کپڑے سلائی کرتی میرب نے رک کر اس کی تصحیح کی۔

''جو بھی ہے ہوتا تو ہے ناں۔'' فرح نے نخوت سے کہا۔

''اور اماں...... چوبیس کی تو باجی ہوئی ہے اور اکیس کی میں۔ اتنی جلدی کا ہے کی ہے آپ لوگوں کو؟ اور ایک ہی گھر میں کیوں بیاہنا چاہتے ہو؟ اگر ان دونوں نے ہم دونوں کو طلاق دے دی تو پھر؟'' وہ پٹر پٹر بولتی رہی۔

''اے...... چپ کر۔ اب تیری بکواس بند نہ ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہیں۔ رفیق میاں آئیں گے تو مشورہ کروں گی۔ آج ہی بیاہ کی تاریخ نہیں رکھ رہی اور کیوں دیں گے طلاق؟ ڈھنگ کا منہ نہ ہو تو بندہ بات ڈھنگ کی کرلے۔''

ہمیشہ کی طرح اماں نے اسے اچھی طرح جھاڑ پلائی۔ شام میں رفیق میاں کام سے لوٹے تو ستارہ بیگم نے سارا قصہ گوش گزار کیا۔

''اب آپ ہی بتائیں۔ بلوا لوں کیا ان لوگوں کو؟ بس تھوڑی سی پریشان ہوں کہ بعد میں کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو۔ ورنہ سرکاری ملازموں کے رشتے روز روز کہاں آتے ہیں۔'' وہ کچھ پریشان سی تھیں۔ رفیق میاں کچھ دیر سوچتے رہے پھر گویا ہوئے۔

''ستارہ بیگم...... میں چھان پھٹک کروالوں تو پہلے ہم ہی دیکھ آتے ہیں۔ لڑکے اچھے ہوں تو زیادہ مسئلہ نہیں۔ ایسے واقعات ہو جایا کرتے ہیں۔ ویسے بھی آج کل کون کسی غریب کو پوچھتا ہے۔ وحید بھائی نے چاروں بیٹے خاندان سے باہر بیاہ دیئے۔ کسی ایک کی دفعہ بھی رشتے کو نہ پوچھا۔'' ان کے لہجے میں بڑے بھائی کے لیے شکایت سی تھی۔

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ غریب کی بیٹی کو داج دہیج (جہیز) کے بنا پوچھ کون رہا ہے۔ چوبیس کی ہوگئی میری میرب اور چار سالوں سے چودہ جماعتیں پاس کرکے بیٹھی ہے۔ ابھی تک کسی رشتہ دار نے نہیں پوچھا۔ بہتر یہی ہے کہ ہم فالتو لوازمات کو زیر نظر رکھے بنا کسی اچھی جگہ بچیوں کو بیاہ دیں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''کس دن کا کہہ دوں پھر؟''

''جمعہ کو ہم جاتے ہیں۔ اگر اچھے لگے لڑکے تو اتوار کو وہ آجائیں یا پھر جیسے ان کو مناسب لگے۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھے اور قریب ہی چارپائی پر بیٹھی بچوں کو پڑھاتی میرب کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''تم سمجھدار ہو میری بچی، بہن کو بھی سمجھانا۔'' رفیق میاں کہہ کر چلے گئے۔ میرب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے ان کے جانے کے بعد اثبات میں سر ہلایا اور واپس اپنے کام میں مشغول ہوگئی جبکہ ستارہ بیگم بچے کو آپا ہمیں کے گھر بھیجنے لگیں۔

❀......❀......❀

''اماں ابا تو تعریفیں کرتے نہیں تھک رہے تھے۔ ایسا بھی کیا دیکھ لیا ان طلاقیوں میں۔ اوپر سے بچے بھی۔ اس سے اچھا کسی بیوہ آدمی کا رشتہ ڈھونڈ لیتے میرے لیے۔'' وہ منہ بسور کر کہتی کمبل لپیٹ گئی جبکہ میرب کا دماغ ابھی تک بیوہ آدمی میں اٹکا ہوا تھا۔

''زیادہ فرق تو نہیں ہے۔'' اس نے سامنے بنی مٹی کی شیلف پر رکھے اسٹیل کے گلاس گنتے ہوئے کہا۔
''اس کی بیوی واپس آ گئی تو؟ اور نہیں تو بچہ واپس پھینک دیا پھر؟'' فرح نے دوبارہ کمبل سے منہ نکالا۔
''طلاق دے دی ہے۔ بی بی بچہ واپس کاہے کو بھیجے گی؟ ان کی بہن بھی تو بچے لے آئی ہے۔'' وہ جھنجلائی۔ اسے تو کوئی نقص نظر ہی نہ آتا تھا۔ فرح کے مطابق ''میرب باجی کو تو عادت ہے ہر چاند کو داغ سمیت قبولنے کی۔''
''باجی...... تمہارا کہنے کا مطلب ہے اگر انہوں نے بچے واپس پھینکے تو ہماری نند اللہ معاف کرے نہ ہونے والی نند بھی بچے واپس پھینک دے گی؟'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔
''ارے ہاں بھئی اور یہ کیا لگا رکھی ہے۔ بچہ پھینکنا بچہ پھینکنا؟ تمہاری بارہ جماعتیں تو لگتا ہے گھاس ہی کھانے چلی گئی ہیں۔'' اس نے غصے سے کہا۔
''اونہہ...... تو سنو میں کہنا چاہتی ہوں کہ اگر میری ''سوتن'' اللہ معاف کرے نہ ہونے والی سوتن اور تمہاری نہ ہونے والی سوتن ہماری ہونے والی اونہہ بلکہ ہو چکی سوتنیں بن جاتی ہیں اور بچے واپس پھینک......'' وہ بدک کر رکی پھر دوبارہ بولی۔
''بچے واپس کر جاتی ہیں تو ہم انہیں کیسے سنبھالیں گی؟ ہم کیوں کسی کی اولاد کا بیڑہ اٹھائیں۔'' اب کے وہ کمبل کو پورے کا پورا کھسکا کر صحیح سے بیٹھ گئی تھی۔
''اگر اب بھی تمہاری بکواس بند نہ ہوئی تو ہونے یا نہ ہونے والی سوتنیں بچے بعد میں پھینکیں گی، پہلے میں تمہیں یہاں اس پلنگ سے ڈائریکٹ مردہ نہلانے والے پھٹے پر پھینکوں گی۔'' میرب کے غصے کو وہ ہوا دے چکی تھی اب بہتر تھا کہ دوبارہ کمبل منہ سر پر لپیٹتی اور اماں ابا کی عقل کو کوسنے دیتی پھر اس نے یہی کیا تھا۔
دو دن بعد اس کے لاکھ رونے پیٹنے کے باوجود اماں نے لڑکے والوں کو بلا لیا تھا۔ صرف لڑکوں کی خالہ اور بہن ہی آئی تھیں۔ میرب چائے لے گئی تو ان لوگوں نے اسے وہیں پاس بٹھا لیا۔
''کہاں تک پڑھی ہو بیٹی اور اب کیا مصروفیات ہیں؟'' فرزانہ نے مشفق لہجے میں پوچھا۔
''بی اے کیا ہے آنٹی۔ باقی گھر کے کام وغیرہ اور پھر شام میں وقت گزاری کے لیے بچوں کو پڑھا لیتی ہوں۔'' وہ نرم لہجے میں دھیرے دھیرے بولتی سید ھا دل میں اتر رہی تھی۔ جب ہی فرح کمرے میں داخل ہوئی اور سلام کیا جس کا جواب صباء (نند) نے اتنی ہی بلند آواز میں دیا پھر وہ سامنے آ کر میرب کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سرمہ بھر بھر کر آنکھوں میں لگائے، بالوں میں اچھی طرح تیل لگائے، سرخ پراندہ پہنے اور درمیان سے گہری مانگ نکالے، گہرے سبز رنگ کا جوڑا پہنے وہ اتنی عجیب لگ رہی تھی جتنی میرب اور ستارہ بیگم کو کبھی نہ لگی تھی۔
''مجھ سے نہیں پوچھیں گے کہ کتنا پڑھی ہوں؟'' اس نے شرارت سے آنکھیں گھما کر کہا۔
''ہاں ہاں کتنا پڑھی ہو بچے اور کیا مصروفیات ہیں؟'' انہوں نے وہی سوال دہرایا۔
''بارہویں فیل ہوں ماشاء اللہ سے اور یقین کریں امتیازی نمبروں سے اڑی ہوں۔ میٹرک بھی دو دفعہ میں کیا تھا، تھوڑی سی کند ذہن ہوں۔'' اس نے دانت نکوس کر کہا۔ صباء کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
''بھئی ہم کو کون سا نوکری کروانی ہے آپ سے...... خیر ہے چلتا ہے...... میں خود بہ مشکل مڈل پاس ہوں۔'' وہ شرارتاً انداز میں بولی۔
''مصروفیات تو میں نے بتائی نہیں۔ دراصل مجھے کام وام تو کوئی آتا نہیں۔ بس اماں لنڈے سے جرسیاں سویٹر منگوا لیتی ہیں۔ دن بھر بیٹھ کر ان کو ادھیڑتی ہوں اور اماں اس لنڈے کے دھاگے سے بان بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ چائے بنا لیتی ہوں لیکن ہر دفعہ غلطی سے دو دفعہ چینی ڈال دیتی ہوں۔ عادات و اطوار بھی نہیں پوچھے آپ نے......'' اس نے اب منہ بسورا فی الحال اماں اور میرب کی جانب دیکھنے سے وہ گریز کر رہی تھی جو نظروں ہی نظروں سے

اسے کچا چبا جانا چاہتی تھیں۔
"بھئی وہ بھی بتا دو۔" اب کے فرزانہ دلچسپی سے گویا ہوئی تھیں۔ یہ معصوم سی آفت صباء کو بھا رہی تھی۔
"اماں کہتی ہیں بچپن سے ہی نکمی و ناکارہ ہوں۔ پانچ سال کی عمر تک تو حاجت خانے میں بیٹھنا بھی نہیں آتا تھا۔" اس نے اماں کا پسندیدہ طنز خود پر اس نازک وقت میں مارا تھا۔
"پھر؟" صباء نے دلچسپی سے پوچھا۔
"ارے چھوڑیں آپ لوگ اسے۔ اس کی عادت ہے مذاق کرنے کی بس وہ......" ستارہ بیگم نے اسے چپ کروانا چاہا۔
"ارے اماں سنانے دیں ناں۔ کسی کو اندھیرے میں نہیں رکھتے۔ ہاں تو میں کہاں تھی۔ میں تو اتنی منحوس ہوں کہ جس کام میں، میں ہاتھ ڈال دوں وہ خراب ہو کر ہی رہتا ہے۔" اس نے ناک سکیڑ کر کہا۔
"پچھلے ماہ میں یہ نکڑ والے پرائیویٹ اسکول پڑھانے گئی تو......" رفیق میاں کے گلا کنکھارنے کی آواز آئی تو اس کی زبان کو بریک لگے۔ "ابا آ گئے۔" اس نے زبان دانتوں تلے دبائی۔
میرب نے اسے اٹھ جانے کا اشارہ کیا تو وہ اٹھ کر میرب کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آئی۔ میرب بنا کچھ کہے باورچی خانے کے برتن سمیٹنے لگی۔
"کیسا دیا باجی؟ اب تو جان چھوٹ جائے گی ناں تمہاری اور میری ان سینکڈ ہینڈ طلاق شدہ...... معذرت "طلاق یافتہ" پولیس والوں سے۔" اس نے پرجوش ہو کر کہا۔ میرب خاموشی سے کام میں مصروف رہی۔ جواب نہ پا کر فرح سخت بدمزا ہوئی اور کمرے میں جا کر چارپائی پر دراز ہو گئی۔
"بس اماں اور باجی ابا میاں کو کچھ نہ بتا دیں۔ باقی تو سب سیٹ کر آئی ہوں۔" اپنے تئیں وہ اس مسئلے کو حل کر آئی تھی۔
"بڑی بٹی تو ہمیں آپ کی بے حد پسند آئی ہے ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔ ہم گھر جا کر آپ کو آگاہ کرتے ہیں۔" فرزانہ بیگم نے چہرے پر رسمی سی مسکان سجا کر کہا۔
"جی بہن...... ایسے معاملات کون سا پلک جھپکتے طے ہو جاتے ہیں۔ جیسا آپ کو مناسب لگے۔" ستارہ بیگم نے جواباً کہا۔
ان لوگوں کے جانے کو کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ رفیق میاں بھی کام پر واپس چلے گئے۔ اب فرح تھی، اماں تھیں اور اماں کے جوتے۔ اس آدھے گھنٹے کی چھترول تک میرب خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہی۔ اس کو لگا یہ ضروری تھا۔
"اماں بس...... آئندہ نہیں ہوگا۔ ایک بار معافی دے دو۔ بس آخری بار...... بازو چھل گیا میرا۔" میرب نے باہر چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی آواز لگائی جو اندر کمرے میں مار کھاتی فرح اور مارتی اماں تک پہنچی۔
"اماں...... پلیز اچھے سے علاج کیجیے گا۔" کہہ کر اس نے مسکراہٹ دبائی۔ فرح کی چیخنے چلانے کی آوازیں صحن تک ہی محدود تھیں۔ کچھ دیر بعد اماں ہانپتی ہوئی باہر آئیں اور جوتا پیر میں اڑسا۔ میرب نے اندر دیکھا تو وہ گھٹنوں میں سر دیے بھاں بھاں کرنے میں مصروف تھی۔
"ابا کو بتاؤں گی۔" اس نے رندھی آواز میں کہا۔
"ہاں ہاں بتانا ابا کو اور پھر ان سے بھی چھترول کروانا جو تم نے آج حرکت کی ہے۔" میرب نے آواز لگائی۔
"پانی دے میرب۔" اماں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میرب نے پانی کا گلاس لا کر انہیں تھمایا۔

❁......❁......❁

"صباء...... کیا خیال ہے پھر؟ مجھے تو چھوٹی لڑکی بہت بیوقوف سی لگی۔ ہاں بڑی تو ہیرا ہے ہیرا۔ کیا کہتی ہو؟" فرزانہ نے دریافت کیا۔
"بے وقوف نہیں خالہ...... معصوم تھی بہت۔ طلال کے ساتھ چل جائے گی۔ میرب اور بلال بھائی تو ایک دم پرفیکٹ لگیں گے۔ مجھے تو بہت اچھی لگیں۔ کم از کم ندرت اور سدرہ کی طرح چالاک لڑکیاں نہیں ہیں۔" صباء کے لہجے

سے میرب اور فرح کے لیے پسندیدگی جھلک رہی تھی۔
''دیکھ لو۔ بعد میں نہ کہنا۔ شاید وہ اس رشتے سے خوش نہیں تھی۔ اسی لیے ایسا کیا۔'' فرزانہ نے کسی خدشے کے زیر اثر کہا۔
''ایسا نہیں ہے۔ آپا نے پوری تسلی دی ہے دونوں لڑکیوں کی کہ بہت ہی شریف ہیں۔ میں تو مطمئن ہوں۔''
''چلو پھر ان کو آگاہ کر دیتے ہیں صبح۔'' فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

❁......❁......❁

''کتنا سمجھایا تھا تمہیں فرح لیکن تم نے کیا کیا؟ رشتہ ہونا نہ ہونا بعد کی بات ہے لیکن تمہارے لیے کیسا تاثر گیا ان کے ذہن میں؟ کل کلاں وہ کسی سے بات کریں گے تو کیا کہیں گے؟ ہمارے ماں باپ کے پاس عزت کے سوا ہے ہی کیا؟ مجھے دیکھو چوبیس کی ہوگئی۔ ابھی تک ایک بھی رشتہ آیا، وجہ کیا ہے؟ ہمارا باپ ایک معمولی سا مزدور ہے جو دیہاڑی لگا کر کمائے گئے چند روپوں سے اس گھر کو چلاتا ہے۔ شہزادوں کے خواب دیکھنا چھوڑ دو ناں۔ دیکھو میں نے سنا ہے لڑکے بہت اچھے ہیں دونوں۔ پولیس میں لگے ہیں اور گھر بھی ہماری اس کٹیا سے بہت بہتر ہے۔ اس سے زیادہ کیا چاہیے؟ چلو یہ رشتہ نہیں ہوتا تو اور کیسے رشتے آئیں گے؟ یا ابا جیسے کسی مزدور کا رشتہ یا زیادہ ہوا تو کسی دکان دار کا۔ غریبوں کی بیٹیاں یا تو اپنے جیسوں میں بیاہی جاتی ہیں جن کے ہاں زندگی بھر کھانے کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوتا یا پھر ساری زندگی ماں باپ کے گھر بیٹھی رہتی ہیں۔ آگے اللہ کو پتا ہے کہ نصیب میں لکھا کیا ہے۔ یہ رشتہ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ میری چندا گلاب کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں یا تو خوشبودار گلابوں کو کانٹوں سمیت قبول کر دیا کسی بے رنگ و بو پھول کو خود کے لیے چن لو۔'' وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے زمین پر بیٹھی اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔ جبکہ وہ سوں سوں کرتی بس رو رہی تھی۔
''کھانا کھاؤ گی؟ ویسے تو جوتے کھا لیے کافی ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔
''باجی......'' وہ کلس کر بولی۔
''ہاں؟'' وہ مسکرائی۔
''آپا ہمیں کا داماد ڈاکٹر ہے ناں تو اس کا رشتہ کیسے آ گیا اس گلہری جیسے دانتوں والی ارسہ کے لیے؟'' اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔
''فرح......'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔
''ہاں۔''
''وہ آپا ہمیں کا داماد ناں......'' وہ رکی اور پھر تسلسل قائم کرتے بولی۔
''وہ ناں ڈنگر ڈاکٹر ہے اور ناں......'' وہ پھر رکی۔
''اور ناں...... جب میں آپا ہمیں کے ہاں اماں کے ساتھ کام سے گئی تو ان کا داماد آیا ہوا تھا۔''
''پھر؟'' اس نے تجسس سے اسے تکتے ہوئے پوچھا۔
''فرح...... اس کے بھی دو دانت باہر کو نکلے ہوئے ہیں۔'' اس نے کہا۔ لمحے بھر خاموشی چھائی اور پھر کچھ دیر بعد دونوں کے قہقہے کمرے میں گونج رہے تھے۔ باہر دونوں ہاتھوں میں سر دیے بیٹھی ہوئی ستارہ بیگم نے اچنبھے سے انہیں تک کر سر جھٹکا۔
''باولیاں......''
صبح دوسری جانب سے اقرار کا سندیسہ پا کر دونوں تتلیوں نے گلابوں کو ہر خار سمیت قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ فرح کو آج چھوٹی سی کیاری میں لگے گلاب کچھ نکھرے سے لگ رہے تھے۔ اس نے ایک گلاب توڑا تو ننھا سا کانٹا اس کی انگلی میں چبھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر پھول ناک کے قریب لے جا کر خوشبو اپنے اندر اتاری۔ ذرا سی چبھن کا احساس گلاب کی خوشبو کے زیر اثر دب چکا تھا۔

چاند منزل کی کومل

عائشہ ناز علی

"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔" کومل نے نہایت ہی سنجیدگی سے فرائز کو مایو گارلک میں لت پت کیا اور پورے کا پورا منہ میں رکھ لیا۔ صنم اور پونم نے بیک وقت کومل کی طرف دیکھا جو بے حد انہماک اور رغبت سے فرائز پر ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

"کیا؟" دونوں کورس میں بولیں۔

"انسان کھانے کے لیے جیتا ہے یا جینے کے لیے کھاتا ہے؟" کومل نے اب چیز کباب برگر کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"سوال قابل غور ہے مگر یہ سوال پوچھنا تو بیکار تھا پھر پوچھا کیوں؟" امام نے اچانک وارد ہوتے ہوئے چیل کی

طرح برگر پر جھپٹا مارا۔

"اے...... یہ میرا برگر ہے۔ رکھو اسے۔" کومل دھاڑی مگر وہ امام ہی کیا جس پر کومل کی دھمکی کا اثر ہو جائے۔

"تمہارے سوال کا جواب میرے پاس ہے۔ لوگ تو جینے کے لیے کھاتے ہیں مگر تم کھانے کے لیے جیتی ہو۔" اس نے کومل کے ادھ کھائے برگر پر اپنے شارک جیسے دانتوں کی آری چلائی۔

"میرا برگر مت کھانا ورنہ پیٹ میں درد ہوگا۔" کومل نے بد دعا دی۔

"پھٹ جاؤ گی کھا کھا کر کسی دن۔" امام نے اس کے پھیلے ہوئے وجود کی طرف اشارہ کیا۔

"اور یہی تو میں نہیں چاہتا، میری اتنی پیاری سی بہن کھانے کو پیاری ہو جائے، میں ایسا ظلم تمہیں خود پر کرنے نہیں دوں گا سمجھیں۔" امام نے چند قدم پیچھے جا کر کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر باقی کا برگر معدے میں اتارا۔

"دشمن ہو تم میرے۔" کومل کو اپنے برگر کے خاتمے کا

ازحد دکھ ہوا۔ بڑی بڑی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

''بے وقوف لڑکی، دشمن ہوتا تو اتنا مہنگا برگر کیا تمہیں کھانے دیتا۔ دیکھوناں، اس برگر میں بن کے درمیان پنیر کی مختلف ورائٹیز تھیں۔ مثلاً چیڈر چیز، کاٹیج چیز، دو موٹے موٹے قیمے کے کباب تھے، بمعہ سلاد اور چٹنی۔ اتنی ساری کیلوریز اگر تم بمعہ کولڈ ڈرنک معدے میں اتارتیں تو نتیجہ کیا نکلتا؟'' وہ انگلیاں چاٹنے کے بعد مزے سے پیپسی کی بوتل منہ سے لگا رہا تھا۔

''ہیں...... میری پیپسی بھی اڑالی۔'' کومل نے ہڑبڑا کر اپنے آگے رکھی بوتل ڈھونڈی جو غائب ہو کر امام کے ہاتھ میں تھی۔

''یہ کس وقت اڑائی تم نے؟'' کومل نے پوچھا۔ امام نے جواب دینے کے بجائے دو چار گھونٹ میں بوتل خالی کر کے ڈھکنا بند کر کے ایک لمبی ڈکار لی۔

''بدتمیز۔'' پونم چلائی۔

''سوری، اتنا مزے دار کھانا کھانے کے بعد یہ ہاضمے کی علامت ظاہر کرتا تھا۔ تم اپنی نازک مزاجی پر توجہ دو۔ تمہارا ہونے والا اگر ڈاکٹر نکلا یا پھر قصائی تو کیا کرو گی؟ یا پھر اگر اس کا چمڑے کا کاروبار ہوا تو......؟ تم تو اسے گھر نہیں آنے دو گی۔'' امام نے اپنی بدرنگی جینز سے ہاتھ رگڑ کر صاف کرتے ہوئے کہا۔

''آخ...... گندے امام۔'' پونم کا جی متلایا۔

''ہیں...... تم نے نام کب بدلا؟ گندے امام؟'' کمرے میں داخل ہوتے ہوئے فواز نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ''یا پھر یہ کوئی تخلص ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تو کہاں مرا ہوا تھا؟ آج میچ تھا۔'' امام نے بھنوئیں اچکائیں۔

''تھا نہیں ہے، ابھی پورے بیس منٹ ہیں۔'' فواز نے کومل کے آگے رکھی پلیٹ میں سے دو چار فرائز اٹھا کر منہ میں رکھے ہی تھے کہ اس نے بھیں بھیں کر کے رونا شروع کر دیا۔ فواز گڑبڑا گیا۔

''کک...... کیا...... میں نے کیا کیا؟''

''بڑی دکھی داستان ہے۔ چل تجھے راستے میں سناتا ہوں۔'' امام نے جلدی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ گھسیٹا۔

''افوہ بس کرو نھی...... دوسرا برگر بنالو۔'' صنم نے اس کے ریاض پر دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے مگر وہ کومل ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے اپنا والیم مزید بڑھا دیا۔

''بیڑہ غرق کر دیا سارے ڈرامے کا۔'' صنم جو ٹی وی پر اپنا پسندیدہ ڈراما انہماک سے دیکھنے میں مگن تھی، جھلائی اور ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔

''کیا بات ہے...... یہ شور کیسا ہے؟'' بھاری آواز سن کر صنم اور پونم اچھل پڑیں۔ چونکی تو کومل بھی مگر مجال ہے جو کوئی اثر لیا ہو۔

''کیا بات ہے، کومل کیوں رو رہی ہے؟'' حسن نے سنجیدگی اور حیرانی سے پونم کو دیکھا۔

''امام نے اس کا برگر کھا لیا تھا اس لیے رو رہی ہے۔'' پونم نے جواب دیا۔

''تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟'' حسن مزید حیران ہوا۔ صنم اور پونم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کھی کھی کر کے ہنس دیں۔

''حسن بھائی...... ایک دو روز اور گزار لیں آپ یہاں، خود ہی پتا چل جائے گا۔'' صنم نے جواب دیا۔

''خاموش ہو جاؤ تم۔'' حسن اس کی بھیں بھیں سے بیزار ہو رہا تھا۔ اس کے ڈپٹنے پر وہ چپ تو ہو گئی مگر اتنی بری شکل بنائی کہ پونم کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''ایسی صورت بنانے سے اچھا ہے کہ تم رو لو۔'' اور کوئی بعید نہ تھی کہ وہ بہن کے مشورے پر عمل بھی کر لیتی مگر حسن کی شکل دیکھ کر وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

''اتنی بڑی ہو گئی ہو تم اور کیا بچوں کی طرح حرکتیں کرتی رہتی ہو۔ وزن دیکھا ہے تم نے اپنا...... اگر یہی حال رہا تو پھٹ جاؤ گی کسی دن۔ کتنا ویٹ ہے تمہارا؟'' حسن کی توپوں کا رخ اس کی طرف ہوا۔

''پچھلے ہفتے جب میں ویٹنگ مشین گھر لایا تھا اور یہ محترمہ کھڑی ہوئی تھیں تو مشین کی سوئی ہی ٹوٹ گئی تھی۔ سوچ رہا ہوں 'کانٹے' پر وزن کروایا جائے۔ ننھی باجی کا۔'' امام جو اپنی بائیک کی چابی لینے آیا تھا حسن کے سوال پر جواب دینے کا فریضہ ادا کر کے جا چکا تھا۔

''مائی گڈنیس......! کیا یہ سچ ہے؟'' حسن نے کومل کی طرف بے یقینی سے دیکھا تو اس نے بجائے شرمندہ ہونے کے زور زور سے سر ہلایا۔

''میری وجہ سے نہیں ٹوٹی مشین......خراب اٹھالایا تھا۔'' اس نے اپنا دفاع کرنا چاہا۔

''کومل......میرے کمرے میں آؤ۔'' حسن نے آرڈر دیا اور خود پہلے باہر نکل گیا۔ پیچھے پیچھے بادل نخواستہ وہ بھی نکل گئی۔

''صنم......اس لڑکی کا کچھ علاج کرنا چاہیے۔'' پونم نے فکر مندی سے بہن سے کہا۔

''امی بھی کتنی پریشان رہتی ہیں بے چاری۔ کسی کی نہیں مانتی۔ کھا کھا کر اپنا بیڑہ غرق کر رکھا ہے اس نے۔'' صنم کو بھی بہن کی فکر تھی۔

''کچھ حل سوچتے ہیں، کوئی چکر چلاتے ہیں۔'' پونم نے کہا اور پھر دونوں ہی سوچنے لگی تھیں۔

❁......❁......❁

حسن کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ وہ بے چاری اتنی ساری سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہلکان ہوگئی تھی۔ حد سے بڑھا ہوا وزن اس کی ساری جسمانی پھرتی کو کھا گیا تھا۔ نومبر کے آخری دن تھے۔ موسم قدرے خوب صورت اور ٹھنڈا تھا مگر اس کے باوجود کومل پسینے میں نہا گئی تھی۔ جس وقت وہ حسن کے کمرے میں آئی تو حسن فائل کھول کر بیٹھا تھا۔ اسے کمرے کے کھلے دروازے پر کھڑے دیکھ کر اس نے رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔

''تم پندرہ منٹ بعد آئی ہو۔'' اس نے گویا کچھ جتایا مگر کومل کوئی جواب دینے کے بجائے دروازے کے قریب رکھے سنگل صوفے پر ڈھے گئی۔ صوفہ بے چارہ احتجاجاً چلایا۔

''آرام سے۔ صوفہ تڑوانے کے لیے نہیں بلایا۔'' حسن بے اختیار بولا۔ ''دو منزلیں صرف دو منزلیں چڑھ کر آئی ہو۔'' اس نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''بیس سیڑھیاں ہیں پوری۔'' اس نے اپنی سانسوں کی ترتیب درست کرتے ہوئے ''بیس'' پر زور دیا۔

''تو اچھا ہے ناں، تمہاری ایکسرسائز ہوگئی ہے۔'' حسن نے فائل بند کر کے اطمینان سے جواب دیا۔

ایکسرسائز۔'' کومل کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

''اگر راستے میں ہی مر جاتی تو میرا خون آپ کے سر ہوتا۔'' وہ نیچی آواز کے ساتھ احتجاج کر گئی۔ حسن نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور سینے پر ہاتھ باندھ کر بغور اسے دیکھا۔ اسے موٹا کہنا یعنی صرف موٹا کہنا موٹاپے کی توہین تھی۔ حسن کی نظروں کے سامنے گوشت کا پہاڑ بے ڈھب لباس میں پھنسا ہوا سانسیں لے رہا تھا۔

''تمہاری روٹین کیا ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''روٹین......'' اس کی تصوراتی آنکھوں میں اس کی ''روٹین'' گزری۔ صبح گیارہ بجے اس کے دن کا آغاز ہوتا تھا۔ وہ بھی امی کی جوتی سے تواضع کرانے کے بعد۔ بقول امام دنیا بیڈ ٹی لیتی ہے ہماری ننھی امی کی چپل لیتی ہے صبح اٹھتے ہی نہار منہ۔ چاکلیٹ یا پھر گلاب جامنوں کی بھری ہوئی پلیٹ معدے میں اتاری جاتی اور اگر یہ دونوں چیزیں (جو کہ وہ اپنی کپڑوں والی الماری میں نہایت سنبھال اور چھپا کر رکھتی تھی) میسر نہ ہوتیں تب وہ فریج کھول کر جو بھی میٹھی چیز نظر آتی اسے نگل جاتی۔ اس کے بعد بے چارے ناشتہ کی شامت آتی۔ بے چاری ماما کو ڈرا دھمکا کر شکر والے دو پراٹھے، آلو کے تین پراٹھے اور ایک آملیٹ جس میں تین انڈے اور پنیر کے ٹکڑے ہوتے بمعہ ایک فل گلاس چاکلیٹ ملک ود فل کریم کے نوش فرماتی۔ اس کے بعد وہ امی کے ایک ہزار ایک وولٹ کے جھٹکے دینے یعنی ان سے بے عزتی کروانے کے بعد منہ لٹکائے صرف اپنا کمرہ صاف کر کے ان پر احسان کرتی، الٹی سیدھی صفائی کے بعد وہ اپنا فیورٹ چینل ایف ایم ریڈیو پر لگاتی اور گانے سنتے ہوئے رسالے پڑھتی

رہتی۔ ایک گھنٹے بعد اسے پھر کچھ کھانے کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے بستر کے نیچے چھپا کر رکھے ہوئے شاپر میں سے چپس کے پیکٹس اور جوس کے ڈبے نکالتی، کبھی کولڈ ڈرنکس اور بسکٹوں پر گزارا کر لیتی۔ یہ چیزیں وہ امی سے چھپ کر مانی سے منگواتی تھی۔ مانی اسکول سے واپسی پر کبھی ٹیوشن سے واپسی پر یہ ساری چیزیں اپنے بیگ میں چھپا کر لاتا تھا۔ اسے اس کام کا خصوصی معاوضہ ملتا تھا۔ یعنی پچاس روپے، دوپہر کے کھانے تک یہی روٹین چلتی تھی۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد وہ سو جاتی اور پھر شام کو صنم یا پونم کے جھنجوڑنے پر بہ مشکل اٹھتی ورنہ امی کے دھمو کے اسپیشل سے اس کی سستی نکلتی پھر شام سے رات تک اس کی صبح والی روٹین مسلسل رہتی۔

''گڈ نیس...... یعنی تم پورا دن سوتی یا کھاتی رہتی ہو۔'' حسن نے اپنا سر پیٹ لیا۔

''نہیں تو...... اپنا کمرہ بھی صاف کرتی ہوں۔ کبھی کبھی ماما کے ساتھ مٹر یا پھول گوبھی بھی صاف کر دیتی ہوں۔'' بڑی معصومیت سے جواب دیا اور اس میں بھی حقیقت یہ تھی کہ مٹر چھیلتے ہوئے آدھے کچے مٹر اس کے منہ میں ہوتے اور کچی پھول گوبھی کا بھی یہی انجام ہوتا۔ پھول گوبھی اس کی پسندیدہ تھی۔ اکثر گاجروں کا بھی یہی انجام ہوتا تھا۔

''تم نے پڑھائی کیوں چھوڑ دی؟'' حسن نے بہت تحمل سے پوچھا۔

''بس...... لڑکیاں مجھے چھیڑتی تھیں، موٹی اور نجانے کن کن ناموں سے بلاتی تھیں۔'' اس نے منہ بنایا۔ ''اب میں اتنی موٹی بھی نہیں کہ وہ مجھے ڈائنو سار اور بھینس کہہ کر بلائیں۔'' اب کی بار بھی بہت بھولپن سے جواب دیا۔ حسن نے گہرا سانس لیا۔

''مگر تم پرائیویٹ پڑھ سکتی ہو۔'' اس نے مشورہ دیا۔
''میٹرک کیے تمہیں دو سال ہو گئے ہیں۔''

''ہاں مگر اب مجھ سے نہیں پڑھا جاتا۔'' وہ فوراً بولی۔
''کیوں؟ اس طرح تو تم سب سے پیچھے رہ جاؤ گی۔ باقی لڑکیاں اور تمہاری اپنی سگی بہنیں پڑھ رہی ہیں۔ تم ان کے درمیان صرف میٹرک پاس، وہ بھی سی گریڈ، عجیب سا محسوس نہیں کرتیں؟'' حسن نے نفسیاتی طور پر داؤ پیچ آزمائے۔

وہ حال ہی میں امریکہ سے لوٹا تھا۔ پاکستان سے اولیولز کرنے کے بعد وہ امریکہ مزید پڑھنے چلا گیا تھا اور پھر وہیں ایک مشہور ٹیکسٹائل کمپنی میں ملازمت کر لی اور کچھ عرصہ بعد اپنی مرضی سے ملازمت چھوڑ کر وطن واپس آ گیا تھا۔ اس نے ملک چھوڑا تھا، تب کومل ننھی سی بچی تھی۔ تب وہ اتنی ہی نارمل صحت مند تھی جتنی کہ اس عمر کی بچیاں ہوتی ہیں مگر اب جب اتنے سالوں بعد اس نے کومل کو دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ وہ بے حد موٹی ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی اس کی حرکتیں بھی اسے عجیب لگی تھیں مگر اسے کسی کے معاملات میں بلاضرورت مداخلت کرنے کی عادت نہ تھی۔ کومل کے معاملے میں بھی وہ کبھی مداخلت نہ کرتا اگر آج وہ اسے اس طرح چھوٹے بچوں کی طرح روتے ہوئے نہ دیکھتا اور وہ بھی ایک فضول سی بات کے لیے۔ وہ اس کی چچازاد تھی اور اس رشتے کو لے کر اسے اپنی کزن کی مدد کرنی تھی کیونکہ اسے لگا کہ کومل کو مدد کی ضرورت ہے۔ اس نے کومل کو سدھارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

کومل نے پہلی بار نظر اٹھا کر غور سے حسن کو دیکھا۔ وائٹ شرٹ کے اوپر ہلکی نیلی جیکٹ جس کی آستین اوپر تک فولڈ تھیں، بلیک جینز پہنے سلیقے سے بال سنوارے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ چہرے پر متانت اور ٹھہراؤ تھا اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ وہ ایک صحت مند اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اس پر اس کا انداز و بیاں، کومل کے پہاڑ جیسے وجود میں دھڑکتا دل لمحہ بھر کو رکا۔

''مجھ سے نہیں پڑھا جاتا۔ مجھے یاد نہیں ہوتا سبق۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنا مسئلہ بیان کیا۔ آج سے پہلے اس سے جو بھی بات کرتا تھا اس کے موٹاپے کے قصیدے بیان کرتا تھا۔ اس کی خامیاں گنواتا تھا۔ ہر ایک کا انداز جھلایا ہوا یا پھر طنزیہ ہوتا تھا۔ حسن کا انداز اور لہجہ اس کے دل پر اثر کر رہا تھا۔

''کیا تمہیں شروع سے یہ مسئلہ ہے؟ مگر شاید نہیں، جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم تو بہت ذہین تھیں۔ ہمیشہ

فرسٹ آتی تھیں۔'' حسن نے سوچتے ہوئے کہا۔
''ہاں...... میں سیکنڈ کلاس تک فرسٹ آئی تھی، پھر......''
اس کو جیسے کچھ یاد آیا۔
اسکول کے بعد دس دنوں کی چھٹیاں ملی تھیں تو وہ نانی کے گھر چلی گئی تھی، نانی کا گھر گاؤں میں تھا۔ وہ جب تک وہاں رہی نانی اسے مزے مزے کے پکوان پکا کر کھلاتی رہیں، مختلف قسم کے پراٹھے، مختلف اقسام کے چاول، طرح طرح کے چکن اور گوشت کے بنے پکوان، سب چیزوں میں گھی کی مقدار وافر ہوتی، اسے ان چھٹیوں میں ان ذائقوں کی عادت پڑگئی، گھر آ کر اس نے ماں سے ضد کر کے اسی قسم کے پکوان پکوانے کی فرمائش شروع کردی۔ امی نے کچھ دن تو اس کے نخرے اٹھائے مگر بھرے پرے سسرال میں ایک بچی کی الگ سے فرمائش پوری کرنے کا وقت کہاں تھا ان کے پاس۔
کومل نے اس کا متبادل ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ اب ماما سے اپنی پسندیدہ چیزیں پکواتی تھی۔ اگر ماما منع کرتیں تو وہ دھمکی دیتی کہ امی سے شکایت کردوں گی کہ ماما مجھ سے پان منگواتی ہے۔ امی کو پان چھالیہ سے سخت الرجی تھی۔ اس گھر میں وہی ملازمین کام کرتے تھے جو ہر قسم کے نشہ سے پرہیز کرتے تھے۔ بیچاری ماما بھی ڈر جاتی اور ملازمت چھوٹ جانے کے ڈر سے چپکی بیٹھی رہتی اور کومل کو چھپ چھپا کر اس کی پسندیدہ چیزیں پکا دیتی مگر ایک روز امی کو خبر ہوئی اور انہوں نے ماما کو منع کردیا کہ کومل کی فرمائش پوری نہ کی جائے کیونکہ ان مرغن غذاؤں اور میٹھی چیزوں سے اس کا وزن تیزی سے بڑھنا شروع ہوگیا تھا۔ ماما کی تو جان چھوٹی مگر کومل نے نیا شوق پال لیا۔ وہ اب کینٹین سے جنک فوڈ لینے لگی تھی۔ برگرز، کولڈ ڈرنکس، فرائز، چپس، چاکلیٹس جانے کیا الم غلم، ان چیزوں نے کومل کی صحت تو خراب کی ہی تھی مگر اس کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے دماغ پر بھی چربی چڑھنے لگی تھی اور وہ اسکول کا سبق یاد نہ کر پاتی۔ بے تحاشا خوراک لینے سے اس کا جسم سست ہوگیا تھا اور یہ سستی رفتہ رفتہ اس کے اچھے خاصے ذہن کو بھی زنگ لگاتی چلی گئی تھی۔ اب اس کے مزاج میں ہر وقت تھکاوٹ اور بیزاری سی رہنے لگی اور اسے خمار کی سی کیفیت رہنے لگی، نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ بہت زیادہ سونے لگی تھی۔ پہلے وہ بہت ہی وقت کی پابند اور چست بچی تھی مگر رفتہ رفتہ اس کی ساری خوبیوں پر زنگ کی تہیں چڑھتی گئیں۔ اس کی ذہانت خوراک کے ڈھیر تلے کہیں دب کر رہ گئی تھیں۔ حسن نے گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔
''تمہیں کھانے میں سب سے زیادہ اچھا کیا لگتا ہے؟'' حسن نے پوچھا۔
''آئس کریم...... چاہے کوئی بھی فلیور ہو۔'' اس کے منہ میں پانی آ گیا۔ ''اور چاکلیٹس۔'' وہ شوق سے بولی۔
''اچھا...... بھئی چاکلیٹس تو مجھے بھی بہت پسند ہیں۔ میں امریکہ سے وہاں کی سب سے مشہور چاکلیٹس لایا ہوں۔'' حسن نے بتایا۔ ''ویسے تو میں نے سب کو ہی چاکلیٹس دیں تھیں مگر میرے پاس اب بھی دو باکسز رکھے ہیں۔'' حسن نے بتایا۔
''اچھا'' اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔
''ہاں...... اور میں تمہیں وہ باکسز دے سکتا ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔'' حسن نے کہا۔
''وہ کیا؟'' وہ حسن کے دام میں آ گئی۔
''پہلے میں تمہیں چاکلیٹس دکھاتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر اپنی الماری کے پاس گیا اور الماری کے پٹ وا کر کے اندر سے دو بہت بڑے بڑے اور بے حد خوب صورت پیکنگ والے ڈبے نکال کر اس کے سامنے لہرائے۔
''تم نے آج تک جتنی بھی چاکلیٹس کھائی ہیں، سب کو بھول جاؤ گی۔'' حسن نے اس کی اشتہا و چاہ کو ہوا دی۔
''شرط کیا ہے حسن بھائی؟'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔
''تم آگے پڑھنا شروع کردو۔'' حسن نے کہا۔
''کیا......؟'' اللہ اللہ کر کے تو میٹرک کر کے جان چھوٹی تھی۔ حسن کی شرط پر اس کا منہ اتر گیا۔
''مگر...... مجھے کون پڑھائے گا؟'' اسے یہی بہانہ سوجھا۔
''تمہیں میں خود پڑھاؤں گا، میں آفس سے آٹھ

ساڑھے آٹھ تک واپس آ جاتا ہوں۔ تم میرے پاس بیٹھ کر پڑھوگی۔ میں آج تمہاری کتابیں لے آؤں گا۔ فی الحال تو تم فرسٹ ایئر پرائیویٹ کی تیاری کرو۔'' اس نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے مگر کل سے پڑھیں گے۔'' اس نے کچھ سوچ کر ہامی بھری۔ اس کا خیال تھا کہ جب فیس لے کر پروفیشنل پڑھانے والے بھاگ گئے تھے تو حسن کہاں ٹکے گا۔ کچھ دنوں میں اس کا بھوت بھی اتر جائے گا اور چاکلیٹس بھی اس کے پاس ہوں گی۔ یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، وہ مطمئن ہوکر راضی ہوگئی۔ حسن جیسے اس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ وہ زیرلب مسکرایا۔

''آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا یہ تمہارا پہلا سبق ہے۔'' اس کا منہ لٹک گیا۔

''دوسری شرط...... بھی ہے۔'' حسن نے ڈبے واپس الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''پڑھائی کے دوران تم کچھ کھاؤ گی نہیں۔ صرف پڑھو گی۔'' حسن نے اپنا والٹ میز سے اٹھا کر جینز کی جیب میں اڑسا۔

''تم جاؤ اور میں ٹھیک نو بجے تمہیں دادو کی لائبریری میں ملوں گا۔ اب جاؤ شاباش۔'' اس نے بچوں کی طرح کومل کو چمکارا۔

❁......❁......❁

چاند منزل شیخ رحمان اللہ کی انتھک محنت کے نتیجے میں کھڑی کی گئی وہ عمارت تھی جس کے اینٹ پتھر حق حلال کی کمائی کے تھے۔ شیخ رحمان اللہ اپنے وقت کے بہت ہی کامیاب اور مشہور جج تھے۔ وہ کوئی جدی پشتی رئیس نہ تھے۔ ان کے والد کی کچھ جائیداد تھی جو اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کے حصے میں آئی تھی۔ چند دکانوں (جو کرائے پر تھیں) اور چند مربع زمین ان کی وراثت تھی۔ زمین بیچ کر انہوں نے چاند منزل بنوائی۔ چاند اللہ ان کے والد کا نام تھا، انہوں نے یہ تین منزلہ عمارت اپنے والد کے نام سے منسوب کردی تھی۔

مبارک بیگم ان کی خالہ زاد تھیں اور زندگی کے ہر دور کی ساتھی بھی۔ مبارک بیگم اپنے زمانے کی میٹرک پاس تھیں۔ شوہر کی طرح انہیں بھی کتابوں سے لگاؤ تھا، ان کے تین بیٹے تھے، سب سے بڑے رحیم اللہ، نازیہ ان کی شریک سفر تھیں۔ ان کی چار اولادیں تھیں۔ حسن جو سب بہن بھائیوں میں بڑا تھا پھر نعمان، جو کہ حسن سے چھوٹا تھا اور دادا کی طرح وکالت کو بحیثیت پیشہ اپنا نا تھا پھر صنوبر تھا جو انجینئرنگ کررہا تھا۔ صوفیہ جو سب سے چھوٹی تھی اور وہ بھی انجینئرنگ کررہی تھی۔ راحت اللہ، رحیم سے چھوٹے تھے، فواز اور عنایہ انہی کے بچے تھے۔

فواز پولیٹیکل سائنس میں ماسٹرز کررہا تھا جبکہ عنایہ نے بی اے کرنے کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ آج کل وہ ڈریس ڈیزائننگ کا کورس کررہی تھی۔ تیسرے نمبر پر شبنم پھوپو تھیں، شبنم پھوپو اپنے ریٹائرڈ جنرل شوہر اسفہان کے ساتھ آج کل مانسہرہ میں تھیں اور اسفہان پھوپا کے جدی پشتی گاؤں کی حویلی میں زندگی کو قدرت کے حسن سمیت مزے سے گزار رہی تھیں۔ ان کا اکلوتا بیٹا اسفندیار بھی فوج میں میجر تھا۔ وہ آج کل کاکول میں تعینات تھا۔ پھر راحیل اللہ کا نمبر تھا۔ ان کی بھی چار ہی اولادیں تھیں۔ صنم اور پونم جڑواں تھیں، ان سے دو سال چھوٹی کومل تھی۔ امام ان تینوں سے عمر میں بڑا تھا۔ وہ بھی انجینئرنگ ہی کررہا تھا مگر حرکتیں اس کی کسی بچے سے کم نہیں تھیں۔ فواز اور امام کی بہت بنتی تھی۔ جہاں دونوں اکٹھا ہوتے اودھم مچانے لگتے۔ صنم اور پونم کے مزاج میں کسی حد تک سنجیدگی اور شوخی کا ملاپ تھا۔ کومل خاندان بھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی تھی، لہٰذا اس کا مزاج بھی بچکانہ ہی تھا۔ رہی سہی کسر دادی نے پوری کردی تھی۔

''میرا بچہ، میرا لال، میری ننھی۔'' کہہ کہہ کر واقعی اسے ننھی ہی بنادیا تھا۔

''تم اتنی دیر اوپر کیا کررہی تھیں؟'' جب وہ نیچے آئی تو صنم نے پوچھا۔

''حسن بھائی نے بلایا تھا کہہ رہے تھے کہ مجھے پڑھائیں گے۔'' اس نے اپنی سانسوں کو درست کرتے ہوئے بتایا اور

چاکلیٹس کا ذکر گول کرگئی۔

''اچھا...... انہیں شاید تمہاری کارکردگی کی خبر نہیں۔'' عنایہ نے طنزیہ انداز میں کہا اور ایک فیشن میگزین کھول کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت سب چاند منزل کے بڑے کمرے میں جمع تھیں۔

''میری کارکردگی کو کیا ہوا؟'' اس نے تیکھے انداز میں عنایہ کو دیکھا۔

''کچھ نہیں، ویسے ہی کہہ رہی تھی۔'' اس نے ایک ادا سے شانے جھٹکے اور ڈائجسٹ لے کر باہر نکل گئی۔

''بنتی ہے۔'' پونم بڑبڑائی۔

''اچھی بات ہے، منھی اگر حسن بھائی تمہیں پڑھانا چاہتے ہیں تو پڑھ لو۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی۔'' آخری جملہ پونم نے صنم کو دیکھ کر کہا اور اس کا مطلب بھی صرف وہی سمجھ سکی تھی۔ کومل کے تو سر پر سے اس کی بات گزر گئی تھی۔

''پونم، پانی پلا دو۔ میرا سانس پھول رہا ہے۔'' کومل نے بہن سے کہا۔

''تم ایکسائز کیا کرو، تمہارا ویٹ کم ہو جائے گا۔'' پونم نے بادل نخواستہ اٹھتے ہوئے کہا۔ پانی دینے کی بات نہ ہوتی تو وہ کومل کی فرمائش ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی مگر اسے نصیحت کرنا نہ بھولی تھی۔

⁂ ...... ⁂ ...... ⁂

حسن نے اسے تین گھنٹے صبح اور تین گھنٹے رات کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

''یہ پڑھائی ہے یا سزا؟'' آخر کار وہ روہانسی ہوئی۔

''جو سمجھ لو۔'' حسن سے پڑھنا واقعی کسی سزا سے کم نہ تھا۔ حسن نہ اسے کچھ کھانے دیتا نہ ہی پانی پینے دیتا تھا۔ وہ زیادہ شور کرتی تو خود اسے ایک گلاس پانی تھما دیتا۔ وہ بے چاری اپنے دہائی دیتے تنور (پیٹ) میں وہی منا سا گلاس انڈیلتی اور صبر سے باقی کا وقت گزارتی۔

''معدہ غبارے کی طرح ہوتا ہے، اس میں جتنی غذا ڈالو گی وہ اتنی جگہ لے گا۔ تم آج سے اپنی ڈائٹ پر دھیان دو۔'' حسن نے اس سے کہا۔

''دیتی تو ہوں۔'' بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

''تم دھیان نہیں دیتیں، معدے کو کنواں سمجھ کر انڈیلتی رہتی ہو۔ یہ تمہارا ڈائٹ پلان ہے، تم نے اب صرف اسے فالو کرنا ہے۔'' حسن نے ایک پلندہ اس کے آگے رکھ دیا۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' اسے چکر آنے لگے۔

''ابلی ہوئی سبزیاں، سوکھی چپاتیاں، سادہ نیم گرم پانی۔ آخ...... میں نے نہیں کھانا یہ سب۔'' اسے متلی محسوس ہوئی۔

''چاکلیٹس چاہیے کہ نہیں؟'' حسن نے اسے یاد دلایا تو وہ خوب صورت پیکنگ والے ڈبے اس کے تصور میں دائیں سے بائیں گھومنے لگے۔ اس نے بیچارگی سے حسن کو دیکھا۔

''حسن بھائی...... میں یہ سب کیسے فالو کروں گی؟'' اس نے رونی صورت بنائی۔

''کومل تم دنیا کی پہلی ایسی خوب صورت لڑکی ہو جو اپنے آپ کو بدصورت بنانے پر تلی ہوئی ہو۔'' حسن نے جھلا کر کہا۔

''ہیں خوب صورت......!'' وہ بری طرح چونکی۔

''تم میرا یقین کرو۔ تم بہت حسین ہو مگر تم نے اپنی خوب صورتی کو اس موٹاپے کی بھینٹ چڑھا رکھا ہے۔ تم اس ڈائٹ پلان کو فالو کرنا شروع کرو اور کل میرے ساتھ جم چلو۔ اپنی فٹنس کا خیال رکھو۔ زیادہ نہیں صرف ایک مہینہ عمل کر کے دیکھ لو۔'' حسن نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

''یہ بہت مشکل ہے۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔'' وہ مسکرایا۔ کچھ دن پہلے ہی تو عنایہ نے اس سے کہا تھا۔

''کومل پر محنت کرنا بیکار ہے۔ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، اس بھدی، بھونڈی عورت نما لڑکی کا وہی عالم ہے کہ جیسے کسی پتھر کی عمارت سے سر ٹکرانا۔''

''ایسا نہیں ہے، اگر سچے دل اور خلوص بھری لگن کے ساتھ کوئی کام کیا جائے تو نتیجہ حسب منشا نکل ہی آتا ہے۔ کومل ہماری اپنی ہے، اسے مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے نوٹس کیا ہے کہ ہر کوئی اس کے موٹاپے کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے۔ اس کی ہر اچھائی جیسے اسی ایک خامی کے انبار کے نیچے

دب کر رہ گئی ہے۔ ہر وقت اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہر کوئی اسے بیکار سمجھتا ہے اور نظر انداز کرتا ہے۔ اگر کسی کو اس سے ہمدردی ہے تو اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس نفسانفسی کی دوڑ میں، ہم نے ایک نازک سے احساسات والی کومل سی لڑکی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ ہر کوئی اسے ڈائٹ اور موٹاپے کے طعنے دیتا ہے۔ یہ مشورہ دیتا ہے کہ کم کھاؤ مگر حل کوئی نہیں نکالتا۔ کوئی اس کی انگلی تھام کر اسے راہ نہیں دکھاتا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے تم سب کی بے حسی پر۔'' حسن نے اسے اچھی خاصی سنادی تھیں۔

''حسن بھائی...... کس دنیا میں رہتے ہیں آپ؟ باہر کی ہوا کھا کر بھی پوچھتے ہیں کہ کسی کے پاس وقت ہے؟ ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے، ان بیکار باتوں کے لیے وقت ہی کہاں ملتا ہے؟ پھر وہ کوئی بچی تو ہے نہیں۔ انیس سال کی سمجھدار لڑکی ہے۔ اسے پتا نہیں کہ یہ موٹاپا اس کے لیے کتنا نقصان دہ ہے، اور اس کا علاج کیسے کرنا ہے۔'' عنایہ نے چڑ کر بدلحاظی سے کہا تھا۔

''اگر کوئی اپنا برا بھلا نہ سمجھ سکے تو اسے اس کا احساس دلانا چاہیے۔ تم سب نے طنز کر کے اسے نفسیاتی اور جذباتی طور پر بری طرح ہرٹ کیا ہے۔ وہ چڑ گئی ہے، اس حد تک کہ اپنے اچھے اور برے کی تمیز بھلا بیٹھی ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ چچی اور چچا جان نے بھی اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔'' حسن کو واقعی اس کی فکر تھی۔ اس کی نظر اس کے پورے مستقبل پر تھی، ایسی لڑکی کا رشتہ کیسے ہوتا، اسے کون اپناتا، کیا یہ پوری زندگی ایسی ہی نظر آتی رہے گی؟ حسن ایک حساس دل رکھنے والا ذمہ دار لڑکا تھا، اپنی زندگی کا ایک خاص حصہ اس نے انگریزوں کے درمیان گزارا تھا اور بہت کچھ ان سے سکھا تھا۔ اسی بہت کچھ میں ایک چیز تھی مسلسل کوشش۔ کومل اس کے لیے صرف پروجیکٹ نہیں تھا۔ وہ اس کی کزن تھی۔ رشتے کی کشش نے حسن کو کومل کے معاملے میں مداخلت کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس نے شیخ رحمان اللہ کو اپنا ہمراز اور ہم خیال بنالیا تھا۔ یوں بھی حسن بچپن سے ہی دادو کو ہر بات، ہر راز بتانے کا عادی تھا۔ ان سے اسے بہت سے معاملات کو سلجھانے میں مدد ملتی تھی۔ کبھی کبھی تو دادو کو پوتے سے ایسی ایسی تجاویز سننے کو ملتیں کہ وہ اس کی ذہانت پر عش عش کر اٹھتے تھے۔ کومل کا معاملہ انہوں نے حسن کے حوالے کر دیا تھا۔

''اگر تم نتھی کو ٹھیک کر سکتے ہو تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔'' انہوں نے کہا تھا۔

❁......❁......❁

جس کلب میں حسن کی ممبر شپ تھی، وہیں اس نے کومل کی ممبر شپ کروالی تھی۔ اسے روزانہ جم وہ اپنے ساتھ لاتا اور لے جاتا تھا۔ حسن خود اپنی صحت کا بھی خیال رکھتا تھا۔ اپنی غذا، فٹنس، اس کی صحت قابل رشک تھی۔ وہ بڑی باقاعدگی سے جم جاتا تھا اور اب کومل کو بھی لے کر آتا۔ اس کی ایک دوست ڈاکٹر تھی۔ اس نے کومل کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔

''مجھے کومل کو ایک اسمارٹ لڑکی کے روپ میں دیکھنا ہے۔'' اس نے ندا سے کہا تھا۔

''مشکل کام ہے اور محنت طلب بھی مگر دلجمعی سے علاج کروانے سے کام ہو جائے گا۔ ویسے کیا تمہیں اپنی کزن سے عشق ہو گیا ہے جو فرہاد بن کر نہر کھودنے نکلے ہو پتھروں میں سے۔'' ڈاکٹر ندا ہنسی تو وہ بھی ہنس دیا۔

''بہت چھوٹی ہے مجھ سے، بچی ہے وہ۔ بچوں سے کوئی عشق نہیں کرتا، صرف ان کا خیال کرتا ہے۔ مجھے کومل کو واقعی کومل بنانا ہے اور بس۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا، کومل واقعی اس کے لیے بچی ہی تھی۔

❁......❁......❁

حسن نے اپنی چچی، صنم، پونم اور ماما سے سختی سے کہہ رکھا تھا کہ کومل پر کڑی نظر رکھیں اور ڈائٹ پلان پر سختی سے عمل کروائیں۔ کومل کا چمچہ مانی بھی غداری کیس میں پکڑا گیا تھا۔ اس پر نظر رکھنے کی ذمہ داری امام کی تھی۔ بیگ اور کپڑوں کی تلاشی لینے پر اگر کوئی چپس، چاکلیٹ یا کوئی چیز نکلتی تو سزا کے طور پر اسے دادو کے پاس دو کے بجائے پانچ گھنٹے بیٹھ کر پڑھنا پڑتا تھا۔ مجبوراً اپنی گردن چھڑانے کے لیے اسے کومل سے غداری کرنی پڑی۔ سمیعہ نے احتیاطی تدابیر کے طور پر کومل کی جیب خرچ بھی بند کر دیا تھا۔ راحیل سے تو ویسے بھی

اس معاملے میں مدد کی توقع رکھنا بیکار تھا۔ چاند منزل کے مکین جیسے اس معاملے میں حسن کے ساتھ ہوگئے تھے۔ اب تو ماما بھی اس کی دھمکی پر صرف مسکراتی تھیں، پکا کر کچھ نہیں دیتی تھیں۔

''اس طرح تو میں مرجاؤں گی۔'' اسے اپنی حالت پر رونا آتا۔ دوائیں، علاج، جم، پرہیز، ہر چیز مل کر اس کو ادھر اور ادھر سے قابو کرنے میں لگی تھی۔ اس روز وہ حسن سے پڑھ کر نیچے آئی تو لڑکیوں نے صوفیہ کے نکاح کی البم پر دھاوا بولا ہوا تھا۔ (دادو کے حکم پر حسن کومل کو اپنے کمرے میں پڑھا رہا تھا کیونکہ لائبریری میں دادو کا کوئی نہ کوئی ملنے والا یا دوست آجاتا تھا) اس نے کتابیں صوفے پر پھینکیں اور خود کو فلور کشن پر گرایا۔

''کس کی تصویریں ہیں؟'' اس نے سانسیں بحال کرتے ہوئے پوچھا۔

''صوفی کے نکاح کی ہیں۔ بہت اچھی آئی ہیں۔ آؤ دیکھ لو۔'' پونم نے اشتیاق سے البم دیکھتے ہوئے تعریف کی۔

''اچھا۔'' وہ شوق سے آگے بڑھی اور جو البم پونم کے پاس تھی وہی دیکھنے لگی۔

''شروع سے دکھاؤ۔'' پونم نے البم تقریباً دیکھ ہی لی تھی۔ اس نے بہن کی طرف بڑھادی۔

''واؤ...... زبردست تصویریں آئی ہیں۔'' وہ ہر تصویر پر تبصرہ اور تعریف کرتی رہی۔

''یہ اسفند بھائی تو کمال لگ رہے ہیں۔ دیکھو ذرا...... فوجیوں کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔'' صنم نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس تصویر میں دلہا اور دلہن کے دائیں اور بائیں اسفند یار اور حسن بیٹھے ہوئے تھے۔

''ہاں مگر حسن بھائی کی تو بات ہی اور ہے۔'' کومل نے اپنی فطری معصومیت سے رائے دی۔

''تمہیں حسن بھائی اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ وہ تمہیں پڑھاتے ہیں؟'' عنایہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ کر کہا۔

''نہیں صرف یہ وجہ نہیں ہے اور بہت سی وجوہات ہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''یہ دونوں ہمارے بھائی ہیں۔ ہمیں تو دونوں ہی پسند ہیں مگر ظاہر ہے ایک بات پرسنیلٹی کی ہوتی ہے۔ اسفند یار بھائی اور حسن بھائی دونوں ہی کی پرسنلٹی زبردست ہے۔'' پونم نے بات کو سمجھداری سے سنبھال کر موضوع بدلا۔

''صوفی آپی کے غرارے کا کلر اسکیم زبردست ہے۔ کس نے سلیکٹ کیا تھا؟'' اور باتوں کا رخ بدل گیا تھا۔

❁......❁......❁

''نھی...... کیا کررہی ہو؟'' پونم نے اس سے پوچھا۔ کومل اپنے بالوں میں برش کررہی تھی۔

''حلوہ بنارہی ہوں، ظاہر ہے بال برش کررہی ہوں۔'' وہ ہنسی، اس وقت دونوں کمرے میں اکیلی تھیں۔ صنم باورچی خانے میں تھی۔ اس کی عادت تھی کہ ماما کے ساتھ رات کو کچن سمیٹتی تھی۔ اسے کچن کا کام کرنا پسند تھا۔

''لاؤ میں چوٹی بنادیتی ہوں۔'' پونم نے اس کے ریشم کے گچھے جیسے بالوں کو سنبھالا۔

''نھی...... حسن بھائی کیسا پڑھا رہے ہیں؟'' اس نے بات کا آغاز کیا۔

''بہت اچھا، دوسرے ٹیچرز کی طرح ڈانٹتے نہیں ہیں۔ نہ ہی فضول کی باتیں سناتے ہیں۔ بہت اچھا سمجھاتے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''اچھا...... تم مطمئن ہو، مزہ آرہا ہے پڑھنے میں؟'' پونم نے پوچھا۔

''پہلے نہیں آتا تھا، اب آنے لگا ہے۔ حسن بھائی کہہ رہے تھے کہ انٹر اگر پرائیویٹ کرنے کے بجائے ریگولر کرلو تو زیادہ آسان اور اچھا ہوگا مگر میں نے منع کردیا۔''

''اچھا...... اور جم کیسا چل رہا ہے؟''

''انسٹرکٹر بہت اچھی ہے۔'' وہ کچھ دیر کومل سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

''اچھا نھی دیکھو...... تم حسن بھائی کا ذکر کسی کے سامنے مت کیا کرو۔ نہ تعریف نہ تنقید۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے اسے سمجھایا۔

''کیوں...... اس میں کیا مضائقہ ہے؟'' وہ چونکی۔

''بس.....تم سے جو کہہ رہی ہوں سن کر مان لو۔ تفصیل مت پوچھو۔'' پونم نے ڈپٹا۔
''مگر.....'' کومل نے کہنا چاہا۔
''کوئی اگر مگر نہیں اور تم کالج میں ایڈمیشن لے لو۔ حسن بھائی ٹھیک کہتے ہیں۔'' پونم نے اس کی چوٹی بنادی اور کنگھی لے کر اپنے بال سنوارنے لگی۔
''میں کالج نہیں جاؤں گی۔ سب لڑکیاں اسکول کی طرح مجھ پر ہنسیں گی۔'' اس نے فوراً منع کیا۔
''تو بھئی تم اب ڈائٹنگ کر تو رہی ہو، کم ہوجائے گا ویٹ۔ تم کالج جوائن کرلو۔'' مگر اس نے پونم کی اس بات پر ہامی نہ بھری آخر تھک کر اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

❁.....❁.....❁

اس گھر کا ایک اور اہم کردار تھا مانی، عمران عرف مانی دنیا میں تنہا تھا۔ دادو کے اردلی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اردلی کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا تھا تو دادو نے اس کی بیوہ اور بچے کے اخراجات اٹھانے چاہیے مگر بیوہ بہت غیور تھی۔ اس نے اس وقت مدد لینے کے بجائے دادو کے گھر میں ملازمت کرلی۔ دادو اسے اور عمران کو گھر لے آئے۔ ماما وہی بیوہ خاتون تھی اور مانی اس کا بیٹا جسے دادو اچھی تعلیم دلوا رہے تھے۔ دادو کی سخت ہدایات تھیں کہ ان دونوں سے اچھا سلوک رکھا جائے کیونکہ وہ ملازم نہیں ضرورت مند ہیں۔ ماما اور عمران نے نمک حلالی کا ثبوت دیا تھا۔ چاند منزل کے پچھواڑے ایک کمرہ ان دونوں کے لیے مخصوص تھا۔ گھر میں ایک ملازمہ جز وقتی آتی تھی، علاوہ ازیں ایک مستقل نوکر تھا جسے سب لوگ چاچا کرمو کہتے تھے۔ یہ ادھیڑ عمر اور شریف آدمی تھا۔ چاچا کرمو بھی چاند منزل کے پچھلی طرف بنے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ صرف مہینے دو مہینے بعد ہفتہ دس دن کی چھٹی لے کر گاؤں جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ چھٹی نہیں کرتا تھا۔

❁.....❁.....❁

کومل بیچاری کی جان پر بن آئی تھی۔ ماربل کی سیڑھیاں اور کار پورچ دھو کر پونچا لگانا کتنا جان جوکھو کا کام تھا اس کا دل جانتا تھا۔ اوپر سے ابلی ہوئی سبزیاں اور مچھلی کھا کھا کر وہ پک گئی تھی۔ ابلی ہوئی دال کو سوپ کے نام پر حلق سے اتارنا کس قدر مشکل لگتا تھا، بغیر چھنے آٹے کی صرف ایک چپاتی۔ سوکھی ہوئی گلے سے اتارنے کے لیے اسے پانی کے گھونٹ بھرنے پڑتے۔
''یہ لوکی کھا کھا کر میں بھی لوکی بن جاؤں گی۔'' وہ ایک روز چیخ پڑی۔
''چاکلیٹس چاہیے۔'' حسن کہیں سے اس کے سامنے آ گیا تھا۔
''نہیں چاہیے آپ کے چاکلیٹس۔'' وہ روہانسی ہوئی۔
''اب تو خواب بھی لوکی، ٹنڈے کے آتے ہیں۔'' وہ رونے لگی۔
''کس سے باتیں کررہی ہو؟'' نعمان کی نظر اس پر پڑی تو حیرت سے پوچھنے لگا۔ ہاتھ میں تنکوں کی جھاڑو، دوپٹا ندارد، لمبی چوٹی کا جوڑا بنا ہوا، پنڈلیوں تک شلوار کے پائنچے چڑھا کر موٹا سا پائپ دوسرے ہاتھ میں پکڑے، آنکھوں میں آنسو لیے وہ کھڑی تھی۔ بلاشبہ ڈیڑھ ماہ میں اس کا وزن حیرت انگیز طور پر کم ہوا تھا۔ سرخی مائل سفید رنگت منہ بسورنے کی وجہ سے مزید سرخ ہورہی تھی۔ ننگے گلابی سفید پاؤں پانی کی ٹھنڈک کی وجہ سے سرخ ہو رہے تھے۔
''کسی سے نہیں۔'' اس نے جلدی سے آستین سے آنکھیں رگڑیں۔
''دوپٹا تو لے لیا کرو۔'' اس کے بھرے بھرے جسم سے نظریں چراتے ہوئے نعمان نے کہا۔
''اب یہ کھڑاگ سمیٹوں یا دوپٹا لوں۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب۔ یعنی دونوں مشقت کے کام اکٹھے۔'' وہ بچوں کی طرح جھلائی۔
''اچھا بھئی جو جی میں آئے کرو۔'' نعمان جلدی سے آگے بڑھ گیا اور وہ اپنے حال پر آنسو بہاتی خراش خراش جھاڑو لگانے لگی۔
''کومل آپی.....آلو بخارے کھائیں گی؟'' مانی بستہ لیے نجانے کہاں سے وارد ہوا۔ اس نے فٹ سے جھاڑو اور پائپ

پھینکے اور قمیص سے ہاتھ صاف کرکے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔
''ارے......رے، آپ کے کپڑے؟'' بیچارہ مانی بوکھلا گیا۔
''چھوڑ......ویسے بھی کون سے سوکھے ہیں۔ لاؤ، مصالحہ ڈلوایا؟'' اس کے منہ میں پانی آ گیا۔
''جی، آپ کے لیے لایا ہوں ظاہر ہے۔'' مانی نے تھیلی اسے پکڑائی۔
''اگزامز کب ہیں؟'' اس نے آلو بخارے کے دو تین پیس منہ میں رکھے۔
''دو ماہ ہیں۔''
''اچھا......تیاری کیسی چل رہی ہے؟''
''فرسٹ کلاس۔ دادو نے میتھس کی زبردست پریکٹس کرادی ہے۔ ویسے آپ کہاں تک پہنچیں؟'' وہ کرسی پر بیگ رکھ کر بیٹھ گیا۔
''میری تیاری بھی تقریباً ہو ہی گئی ہے۔ سارے سبجیکٹس ایزی ہیں۔ بس انگلش میں مسئلہ ہوتا ہے۔'' وہ چٹخارا بھرتے ہوئے بولی۔
''ایک بات ہے آپی، اب تو آپ پہلے سے اسمارٹ ہوگئی ہیں۔ کالج جانا شروع کردیں۔'' اس نے مشورہ دیا تو اس نے برا سا منہ بنایا۔
''آپ کی جان چھوٹے گی ان کاموں سے۔'' اس نے رازداری سے کہا۔
''ہیں......ہاں......ارے یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔'' وہ چونکی۔
''تو اب سوچیں۔''
''تم میرے پیارے بھیا ہو۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر مانی کا گال کھینچا۔ بیچارہ بلبلا کر رہ گیا۔
''آپ کے ساتھ ہمدردی بہت مہنگی پڑتی ہے۔'' مانی نے گال سہلایا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
''تم یہاں گپیں ہانک رہی ہو، کام ختم کرو۔ سارا پانی بھر رہا ہے۔'' عنایہ چوٹی سے ایڑھی تک تیار اندر سے نکلی۔ کومل نے اسے سر سے پیر تک نظر بھر کر دیکھا۔ کیمل کلر کی فٹنگ والی لانگ شرٹ اور چست پائجامے میں، شولڈر کٹ بالوں کو سنوارے بالکل ہلکے سے میک اپ میں وہ کمال کی حسین لگ رہی تھی۔
''کہاں کی تیاری ہے؟'' حسن نک سک سے تیار اندر سے نکلا۔ وہ عنایہ سے مخاطب تھا۔ کومل اسے نظر ہی نہ آئی تھی۔
''یونیورسٹی جارہی ہوں۔ آج ایگزیبیشن ہے پی سی میں۔ سب فرینڈز یونیورسٹی میں جمع ہوں گی پھر اکٹھے ہی جائیں گی۔ مگر یہ محترمہ تو یہاں تالاب بنائے بیٹھی ہیں۔ گزروں کیسے؟'' اس نے بیزاری سے کومل کو دیکھا۔ حسن نے پورچ میں بہتے پانی کو دیکھا۔
''ویسے آپ کہاں کی تیاری میں ہیں؟'' اس نے حسن کو دیکھا نیوی بلیو سوٹ میں زبردست لگ رہا تھا۔
''ڈنر ہے آفیشل۔ پی سی تو مجھے بھی جانا ہے۔ میں ڈراپ کردوں؟'' اس نے پوچھا۔
''ٹھیک ہے، میں فرینڈز کو کال کردوں گی۔'' عنایہ نے ادا سے کندھے اچکائے۔
''کومل......پلیز یہ پانی ہٹا دو وائپر سے۔ مجھے کار تک پہنچنا ہے۔'' حسن نے شائستگی سے اسے مخاطب کیا۔
''جی۔'' وہ اٹھی، قدم جیسے من من بھاری ہورہے تھے۔ آلو بخاروں کا سارا مزہ کرکرا ہوگیا تھا۔ اسے حسن کے سامنے عجیب سی سبکی کا احساس ہوا تھا۔
''میں لگاتا ہوں۔ آپ نل بند کردیں۔'' مانی نے اس کے ہاتھ سے وائپر لے لیا اور پانی صاف کرنے لگا۔ کومل نے نل بند کیا۔ حسن اور عنایہ باتیں کررہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ اس کی نگاہ بھٹک کر دونوں پر پڑتی پھر وہ سر جھٹک دیتی مگر نظریں اس کے ذہن سے بغاوت کررہی تھیں۔ حسن نے عنایہ کے لیے اپنی بلیک مرسڈیز کا فرنٹ دروازہ کھولا تھا۔ عنایہ بڑی ادا اور نزاکت سے اندر بیٹھی تھی۔ حسن نے کومل پر نگاہ غلط بھی نہ ڈالی تھی۔ وہ اسے یوں نظر انداز کرگیا تھا گویا اس کا وجود ہی نہ ہو۔
''آپی......چلیں۔ اندر چلیں۔'' سترہ سالہ مانی جیسے اس کے ذہن تک پہنچ گیا تھا۔ اسے کومل کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر دلی

رنج ہوا تھا۔ وہ اس سے صرف تین سال چھوٹا تھا۔
''مانی...... کیا کبھی میں عنایہ جیسی خوب صورت اور دبلی ہوسکوں گی؟'' نجانے کیوں اس نے یہ کہا تھا، حالانکہ اس گھر کی تمام لڑکیاں ہی اسمارٹ اور پیاری تھیں مگر وہ عنایہ سے اپنا موازنہ کرتی تھی۔ لاشعوری طور پر...... اس میں کافی حد تک عنایہ کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ شعوری طور پر کومل کو یہ جتاتی تھی کہ وہ خود کس قدر حسین، نازک اندام اور بہترین جامہ زیب بھی۔ یہ حقیقت تھی کہ عنایہ خود پر بے حد توجہ دیتی تھی۔ اپنے لباس، اپنی خوراک، اپنے حسن، اپنی نیند، اپنی ہر شے کی حفاظت اور اپنا خیال رکھتی تھی۔ اس کے پاس صرف اپنی ذات کے لیے وقت ہوتا تھا۔ وہ خود سے ہٹ کر کسی کے بارے میں نہیں سوچتی تھی۔ وہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ کہ اس کے ناخن اور ہاتھ خراب نہ ہوں، صرف رات کے وقت وہ دکھلاوے کو برتن رکھتی اور اٹھاتی تھی، وہ بھی اپنی ماں کے کہنے پر تاکہ گھر کے مردوں کے سامنے اس کی ساکھ بنی رہے۔
''آپ عنایہ باجی سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ آپ صرف خود پر توجہ دیں۔'' مانی نے کسی دوست کی طرح اسے مشورہ دیا۔
''کیسے دوں؟'' وہ بیچارگی سے بولی۔
''سب سے پہلے اپنی ڈائٹ شیڈول اور سخت کریں۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھیں، دادو کہتے ہیں کہ نماز ہماری بہترین ورزش ہے، زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ رات کو دس بجے تک سو جائیں اور ہاں، مجھے میرے ایک دوست کی امی نے بتایا تھا کہ وزن کم کرنے کے لیے سورہ فاتحہ رات کو سونے سے پہلے اکیس مرتبہ پڑھنے سے وزن کم ہوجاتا ہے اور...... رات کو سونے سے پہلے آپ کم از کم پانچ بار اذان سن کر اسے دہرایا کریں۔ یہ بھی بہت مفید ہے۔ میں آپ کو آپ کے موبائل میں اذان ڈاؤن لوڈ کردوں گا۔ یہ کافی ساری بیماریوں کا علاج ہے۔ وہ بھی مفت......'' وہ بڑوں کی طرح مشورے دے رہا تھا اور کومل غور سے سن رہی تھی۔
''سچ؟'' اس نے مانی کو دیکھا۔
''جی ہاں، آپ اب میرے مشورے پر چلیں۔ عنایہ باجی کیا حسین ہوں گی۔ جو آپ بن سکتی ہیں۔ آپ خود پر سے خود ترسی کی چادر اتار دیں۔'' مانی اس وقت بڑا بھائی بن کر اسے سمجھا رہا تھا۔
''اپنا حلیہ درست کریں۔'' اس کے کہنے پر وہ کمرے میں گئی اور نہا دھو کر اپنا جوڑا نکالا۔
''سب کپڑے ایک جیسے ہیں۔ تھیلے جیسے، نہیں بوری جیسی، نہ اسٹائل نہ رنگ، عنایہ کے ڈریسز کتنے اچھے ہیں، کلر نیس کتنا اچھا ہے اس کا۔'' وہ سوچ رہی تھی پھر بے دلی سے کپڑے چڑھانے لگی۔
اس نے اپنی ڈائٹ اور ایکسر سائز کا زیادہ خیال رکھنا شروع کردیا تھا۔ ریگولر کلاسز میں داخلہ تو کچھ دن بعد ہونے تھے مگر اس نے امام سے کہہ کر کالج میں داخلہ کے لیے اپلائی کروادیا تھا۔ اس عہد کے ساتھ کہ وہ گھر پر فی الحال کسی کو نہیں بتائے گا۔ انہی دنوں صوفیہ کی شادی کے ہنگامے نے ایک بار پھر سر اٹھایا۔ گھر بھر کی خواتین شادی کی تیاریوں میں جت گئیں۔ اس بار کومل نے سب سے چھپ کر مختلف میگزینز میں کپڑوں کے ڈیزائن تلاش کرنے شروع کردیے تھے مگر جب وہ ماڈلز پر ان ڈریسز کو دیکھتی تو اسے بہت اچھا لگتا اور جب تصور میں خود کو وہی لباس پہنے دیکھتی تو اس کا دل ہی ٹوٹ جاتا۔
''میرے ایک دوست کی ممی ڈریس ڈیزائنر ہیں۔ ان کے گھر میں اپنا بوتیک ہے۔ آپ ان سے مل کر مشورہ کرلیں۔'' مانی نے مشورہ دیا اور پھر وہ صنم کو ساتھ لے کر مانی کے دوست کی ممی سے ملنے چل آئی۔ امی جان نے تینوں بہنوں کے لیے لاہور سے کپڑوں کے تھان منگوائے تھے، ان کی کفایت شعار طبیعت یہ گوارا نہ کرتی کہ وہ بازار کے ریڈی میڈ سوٹ بچیوں کو دلائیں۔
''بھئی ان سلے کپڑے سے انسان اپنی مرضی کے ڈیزائن بنا سکتا ہے پھر فٹنگ کا بھی مسئلہ نہیں رہتا۔ دل کو بھی تسلی رہتی ہے کہ جو میٹریل ہم نے لگایا ہے وہ کس قسم کا ہے، بازار کے سوٹ کے کپڑے کی نہ سلائی اچھی ہوتی ہے نہ ہی کپڑا اچھی کوالٹی کا ہوتا ہے۔ عقل مندی تو اسی میں ہے کہ خود

ہی اپنی مرضی کا کپڑا لے کر سلوالیں۔'' وہ کبھی کبھار کہتی تھیں۔
''ویسے تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟ پہلے تو تم نے کبھی اپنے ڈریسز کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ جو ہیں جیسے ہیں بس پہن لینا ہے پھر اس بار اتنی کانشس کیوں ہو رہی ہو؟'' صنم بہت حیران ہوئی۔
''بس جی چاہ رہا ہے اس بار۔ کیوں آپ خوش نہیں ہیں اس چینج پر؟'' اس نے پوچھا۔
''ایسی بات نہیں ہے۔ تم میری بہن ہو، میں خوش نہیں ہوں گی تو کون ہوگا؟ بس معمول سے ہٹ کر جب کچھ ہوتا ہے ناں تو عجیب لگتا ہے۔'' صنم نے اس کا گلابی گال کھینچا۔
''ویسے تم نے کافی محنت کی ہے۔ اچھا رزلٹ آنے کی امید ہے۔'' اس کا اشارہ کومل کے سراپے کی طرف تھا۔ وہ بس مسکرادی تھی۔
''مانی...... تمہارے اس دوست کا گھر کیا کوہ قاف میں ہے؟'' صنم پچھلے بیس منٹوں سے چل چل کر تھک گئی تھی۔ کومل بھی ہانپ رہی تھی۔
''اس نے یہیں کا ایڈریس بتایا تھا۔ میرے پاس لکھا ہوا ہے۔ بس شاید ہم قریب ہیں۔'' مانی نے جیب سے پرچا نکال کر ایڈریس پھر سے پڑھا۔
''لاؤ دکھاؤ مجھے۔'' کومل نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا۔
''یہ والی اسٹریٹ اور بینگلو نمبر کی سیریل تو یہاں نظر نہیں آرہی۔'' کومل نے بغور ایڈریس پڑھا پھر اردگرد کے بنگلوں پر لگی نام کی تختیوں کو دیکھا۔
''بھئی میں تو تھک گئی ہوں۔ مجھ سے اور نہیں چلا جارہا۔'' کومل ایک بنگلے کے باہر دیوار کے پاس بنی لکڑی کی بینچ پر بیٹھ گئی۔
''میرا بھی یہی حال ہو رہا ہے مگر کیا کریں؟ مجھے لگتا ہے کہ یہ مانی کا بچہ گھر بھول گیا ہے۔'' صنم نے کومل کے برابر بیٹھتے ہوئے مانی کو گھورا۔
''اب میں بھی تو فرسٹ ٹائم جارہا ہوں۔ مجھے کیا خبر؟'' بے چارہ شرمندہ ہوا۔ اس نے کپڑوں کا تھیلا بینچ پر رکھا اور خود کیاریوں کی باؤنڈری وال پر بیٹھ گیا۔

''ویسے تمہیں یہ مشورہ کس عقل مند نے دیا تھا؟ سیدھے سیدھے درزی سے سلوا لیتیں کپڑے۔ اتنی خواری ایویں مول لے لی یا پھر امام کی بائیک پر آجاتیں۔'' صنم نے دوپٹا سے خود کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔
''گھر پر کہاں ہوتا ہے وہ؟ سارا دن آوارہ گردی...... پچھلے دو دنوں سے میچ کے چکر میں کھانا پینا بھلائے بیٹھا ہے پھر ہمیں کیا خبر تھی کہ گھر ڈھونڈنے میں اتنا وقت لگ جائے گا۔'' اس نے ابھی بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ بنگلے کا گیٹ کھول کر اندر سے لمبا تڑنگا بڑی بڑی مونچھوں والا چوکیدار نما کوئی شخص نکلا۔
''یہ کیا چیز ہے؟'' کومل نے آنکھیں پٹپٹا کر سیاہ پشاوری چپلوں سے لے کر سر پر بندھی پگڑی تک اسے دیکھا۔
''لگتا ہے پی سی کا دربان ہے مگر یہاں کیا کر رہا ہے؟'' صنم نے حیران ہو کر کہا۔ ''چوکیدار ہے۔'' مانی نے اپنا سر پیٹتے ہوئے دانت پیسے۔
''چوکیدار'' دونوں کورس میں بولیں اور ایک بار پھر سر سے پیر تک اس بے چارے کو گھورا۔
''تم چوکیدار ہو؟'' کومل نے پوچھا۔
''جی...... تم کو کس سے ملنا اے؟''
''کون ہے خان؟'' مردانہ بھاری آواز پر چاروں نے چونک کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ چھ فٹ سے لمبا قد، مضبوط جسامت والا گندمی رنگت اور تیکھے نین نقش والا مرد کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں اس قدر چمک دار تھیں اور رنگ شہد جیسا تھا۔ کومل چند لمحوں تک اس کی آنکھوں سے نظر ہی نہ ہٹا پائی۔ مرد بلاشبہ پرکشش اور خوبرو تھا۔ اس نے پہلے چوکیدار کو دیکھا پھر اس کی نظریں حرکت کرتی ہوئی مانی، صنم اور کومل پر جا کر رکیں۔
''فرمایئے، آپ کون ہیں اور کس سے ملنا ہے؟'' انداز سخت سنجیدہ اور لہجہ نرم تھا۔
''جی...... میں......'' کومل نے منہ کھولا مگر صنم نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے منہ بند رکھنے کا اشارہ کیا۔
''دراصل ہم یہاں قریب ہی میں رہتے ہیں۔ ہمیں اس

ایڈریس پر پہنچنا ہے مگر پچھلے آدھ گھنٹے سے یہ گھر ہمیں مل نہیں رہا۔''صنم نے مانی کو اشارہ کیا تو اس نے پرچے پر لکھا پتا زبانی سنایا۔

''آپ لوگ یہاں رہتی ہیں اور آپ لوگوں کو اندازہ نہیں ہوا کہ آپ لوگ اس وقت بالکل غلط سمت میں آئے ہوئے ہیں۔ آپ لوگوں کی رہائش کہاں ہے؟'' مرد نے مشکوک نظروں سے تینوں کا معائنہ کیا۔

''آج کل ڈکیتیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے خان، خیال رکھا کرو۔'' ساتھ ہی اس نے چوکیدار کو تنبیہہ کرتے ہوئے انہیں کچھ جتایا۔

''مطلب کیا ہے آپ کا؟ ہم آپ کو چور لگتی ہیں شکل سے؟ اور یہ مانی...... یہ کس اینگل سے چور لگتا ہے؟ بیچارہ ابھی تو میٹرک میں ہے اور ہم چاند منزل میں رہتے ہیں۔ ہمارے دادو بہت بڑے جج تھے اور نعمان بھائی بھی اب ان شاء اللہ جلد ہی جج کی سیٹ پر بیٹھنے والے ہیں اور حسن بھائی......''
اس کا منہ جو الزام سن کر کھلا تو پھر نوجوان کے ٹوکنے پر ہی بند ہوا۔ جو چاند منزل کا نام سن کر چونکا تھا۔

''آپ نعمان کی کیا لگتی ہیں؟'' اس نے کومل کی بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

''بھائی ہیں میرے تایازاد۔'' وہ اکڑ کر بولی۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری، مس انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی، میرا نام فیروز بخت ہے، میں نعمان کا دوست ہوں، دراصل ہمارے پڑوس میں پرسوں ڈکیتی ہوئی تھی، ڈکیت تین خواتین اور ایک بچہ تھے۔'' فیروز نے معذرت خواہ انداز میں کہا۔

''تو آپ نے سمجھ لیا کہ ہم بھی ڈکیت ہیں۔ ماشاء اللہ کیا عقل مند دوست ہیں نعمان بھائی کے۔'' کومل نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں معذرت خواہ ہوں۔ وہ خواتین بھی خاصی ویل ڈریسڈ تھیں۔ آپ لوگوں سے بھی زیادہ فیشن ایبل تھیں۔ میرا قصور نہیں، سوری اگین'' فیروز بخت نے کہا۔

''اٹس او کے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوجاتا ہے۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔'' صنم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھہریں، میں ڈراپ کردیتا ہوں۔ یہاں (پرچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو کہ مانی جیب سے نکال کر اسے تھما چکا تھا) تک پیدل پہنچنے میں آپ لوگوں کو مزید آدھ گھنٹہ لگ جائے گا۔ آپ رکیں، میں گاڑی لاتا ہوں بلکہ ایسا کریں اندر ہی آجائیں۔ امو سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ امو میری والدہ ہیں۔'' فیروز بخت نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ تو جھٹ سے تیار ہوگئی۔ مانی نے بھی شکر ادا کیا مگر صنم نے اخلاقاً تکلف برتا۔

''شکریہ...... آپ تکلف مت کریں۔ ہم چلے جائیں گے۔'' اس نے منع کیا۔

''تکلف کیسا، کار میں چند منٹ میں پہنچ جائیں گی۔ آجایئے پلیز۔'' وہ اپنی بات کہہ کر رکا نہیں بلکہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔

''عجیب آدمی ہے۔'' صنم بڑبڑائی۔

''عجیب نہیں شریف...... اچھا ہے ناں پیدل چلنے سے چھٹکارا مل گیا۔ میری تو ٹانگیں درد کرنے لگی ہیں۔'' کومل نے شکر کا سانس خارج کیا۔

''ہاں صنم باجی...... اچھا ہے ناں، لفٹ بن مانگے مل رہی ہے پھر نعمان بھائی کے دوست ہیں۔ اعتبار کیا جاسکتا ہے۔'' مانی نے ٹکڑا جوڑا۔

صنم کو اچھا نہیں لگ رہا تھا ایک غیر آدمی سے لفٹ لینا۔ بے چارہ چوکیدار ہکا بکا سا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ کومل کے آگے بڑھتے ہی وہ تیزی سے ایک طرف ہوا۔

''واؤ۔'' اندر قدم رکھتے ہی کومل کے منہ سے نکلا۔ ''کتنا خوب صورت گھر ہے۔'' وہ دنگ رہ گئی۔ گرے اور سلور اسٹون جن میں بلیک اسٹون کی آمیزش تھی، سے اندرونی عمارت ایک الگ ہی رنگ لیے ہوئے تھی۔ عمارت کی کنسٹرکشن قدیم اور جدید اطالوی طرز پر کی گئی تھی۔ وسیع وعریض لان میں رنگ برنگے پھول عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ عمارت کے عقبی طرف کی دیوار بوگن ویلیا سے ڈھکی تھی۔ بائیں جانب بہت بڑا سنہری رنگ کا پنجرہ تھا جس میں بہت سارے رنگ برنگے پرندے نظر آرہے تھے اور جن کی چہچہاہٹ سے فضا

میں خوشگوار سی ہلچل تھی۔ کار پورچ ماربل کا تھا اور اس وقت وہاں تین مختلف رنگوں اور ماڈلز کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک گاڑی کا فرنٹ ڈور فیروز بخت کھول رہا تھا۔

"آپ کا گھر بے حد حسین ہے۔ کیا میں دیکھ سکتی ہوں؟" کومل نے تعریف اور فرمائش ایک ساتھ کردی۔

"تھینکس۔ آف کورس۔ میں نے تو آپ لوگوں سے کہا تھا کہ امو سے مل لیں۔ آیئے پلیز۔" وہ شائستگی سے بولا اور قدم آگے بڑھائے۔

"احمق...... کیا ضرورت تھی بے وقت فرمائش کرنے کی۔ تمہارا پھوپا لگتا ہے؟" صنم کو سچ مچ غصہ آیا۔

"نہیں، اللہ رکھے ہمارے پھوپا کو، ایک ہی کافی ہیں۔" وہ ہنسی تو مانی بھی کھی کھی کرنے لگا۔

"چپ رہو۔ اسے بگاڑنے میں پچاس فیصد ہاتھ تمہارا بھی ہے۔" اس نے لگے ہاتھوں مانی کو بھی ڈپٹا۔ بے چارہ ہونٹوں کو بند کرکے سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ گھر کا انٹیریر، کلر اسکیم ہر چیز اپنی تعریف جیسے خود تھی۔ فیروز نے پہلے انہیں سارا گھر دکھایا اور پھر ایک کمرے میں لے آیا، پورے گھر میں یہی ایک کمرہ ایسا تھا جو بالکل ہی سادہ تھا۔ صرف ایک قالین، مختصر سا مگر قیمتی لکڑی کا فرنیچر اور دیوار پر چند ایک تصاویر آویزاں تھیں۔ سائیڈ میز پر ایک ٹائم پیس، تسبیح اور پانی کا گلاس رکھا تھا جو کہ آدھا خالی تھا۔ قالین پر ایک طرف ایک تخت پر قالین والا مصلہ بچھا ہوا تھا۔ سفید بڑے سے دوپٹے میں ملبوس ایک عمر رسیدہ سادہ سی خاتون اس وقت قرآن شریف رحل پر رکھے، تلاوت میں مشغول تھیں۔

"امو...... کچھ مہمان آئے ہیں۔" فیروز بخت نے آہستگی سے پکارا۔ خاتون نے چونک کر گردن موڑی۔

"کون؟" آواز بہت خوب صورت تھی مگر چہرہ اس سے بھی زیادہ خوب صورت تھا۔ سفید لباس میں سفید دوپٹے کے ہالہ میں بہت ہی پرنور لگ رہی تھیں۔

"نعمان کی بہنیں ہیں اور بھائی بھی۔" اس نے بتایا تو خاتون نے قرآن بند کرکے واپس رحل پر رکھ کر بغور تینوں مہمانوں کی طرف دیکھا۔ پہلی نظر مسٹرڈ کلر کے چھوٹے چھوٹے پھولوں والے کرتے ٹراؤزر میں بڑا سا دوپٹا اوڑھے سرخ و سپید رنگت والی کومل پر پڑی۔ تیکھے نقوش جاذب تھے مگر صحت مندی کی کثرت نے اس کے حسن و کشش کو ڈھانپ رکھا تھا۔ (حالانکہ ڈائٹنگ اور ایکسرسائز کی وجہ سے خاصی کمی آئی تھی)

اس کے برابر میں دھان پان سی اسٹائلش سے کپڑوں میں ملبوس پیاری سی صنم اور صنم کے پیچھے جھانکتا ہوا مانی۔ خاتون نے سوالیہ نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا مگر کچھ بولی نہیں بلکہ مسکرا کر ان کا استقبال کیا۔ سلام کرنے کے بعد کومل جلدی سے آگے بڑھ کر ان سے ملی۔ صنم نے بھی اس کی تقلید کی۔

"جیتی رہو۔ ماشاء اللہ بہت اچھی بچیاں ہیں۔ آپ لوگ بیٹھیں۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ "فیروز بیٹا خانساماں سے چائے وغیرہ کا بولو۔" انہوں نے بیٹے سے کہا۔

"تکلف کی ضرورت نہیں ہے پلیز، ہم تو بس یونہی آگئے تھے۔ محض اتفاقاً...... ہمیں جانا ہے۔" صنم نے جلدی سے کہا۔

"کیا مطلب اتفاقاً؟" وہ حیران ہوئیں۔

"مام...... یہ کسی اور کا گھر ڈھونڈ رہی تھیں۔" فیروز نے بے حد اختصار سے جواب دیا۔

"او...... چلو تو اچھا ہی ہوا ناں...... اسی بہانے اللہ کی رحمتیں ہمارے غریب خانے پر بھی آ کر برسیں۔" وہ مسکرائیں۔ فیروز بخت نے آگے بڑھ کر ماں کا ہاتھ پکڑا اور انہیں پلنگ پر بٹھایا۔

"تشریف رکھیں پلیز۔" فیروز نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

"واقعی میں بہت دیر ہورہی ہے، گھر پر امی پریشان ہو جائیں گی۔ ہم کافی دیر سے نکلے ہوئے ہیں۔ وعدہ رہا...... پھر ضرور آئیں گے، آپ سے ملنے۔" صنم نے سہولت سے منع کردیا۔

"جی...... آپ کا گھر بھی بہت خوب صورت ہے اور آپ بھی بہت اچھی ہیں۔" صنم کی تقلید میں کومل بولی۔

"چلیں ٹھیک ہے مگر میں انتظار ضرور کروں گی۔" وہ بولیں۔

"بیٹا، انہیں ان کی منزل تک چھوڑ آؤ۔" وہ بیٹے سے مخاطب ہوئیں۔

"جی۔" فیروز بخت انہیں مطلوبہ پتے پر ڈراپ کر کے چلا گیا تھا۔

"تم ہر جگہ لٹومت ہوا کرو۔ جان نہ پہچان گھس گئیں گھر کے اندر۔ نعمان بھائی کو پتا چلا تو کیا سوچیں گے۔" صنم نے اسے جھاڑا۔

"کچھ نہیں سوچیں گے۔" اس نے منہ بنایا۔ مانی کے دوست کی ممی واقعی بہت اچھی ڈیزائننگ اور سلائی کرتی تھیں۔ دونوں بہنیں مطمئن ہو کر واپس لوٹی تھیں۔ اسد کی ممی نے کومل کو ایک بالکل نیا لک دینے کا وعدہ کیا تھا۔

پہلے وہ لاؤنج میں آ کر ڈائننگ کر رہی تھی۔ اب کسی کی خاطر اپنا خیال رکھ رہی تھی۔ اس کی سوچ میں کب تبدیلی پیدا ہوئی، کب اس کی سیدھی سادی دھڑکنوں میں ارتعاش برپا ہوا، اسے بالکل خبر نہ ہوئی تھی۔ اب اسے حسن سے پڑھنا اچھا لگتا تھا۔ حسن اگر اسے چاکلیٹس نہ دیتا تب بھی وہ اس کی ساری باتیں مان لیتی۔ اب وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات پر توجہ دینے لگی تھی۔ کچن اور گھر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ شادی کے دن بالکل قریب آ گئے تھے۔ اس کے تینوں دنوں کے کپڑے بھی تیار ہو گئے تھے۔ امی نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے بل کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے پہلی بار اتنے شوق سے کچھ تیاری کی تھی۔ پہلی بار اتنی چاہ سے کپڑے بنوائے تھے۔ وہ اس کی خوشی ملیا میٹ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ وزن گھٹانے کی وجہ سے اب اس کا جسم قدرے بہتر لگ رہا تھا۔

❁......❁......❁

صوفیہ کی مہندی والے روز جب کومل تیار ہو کر سب کے سامنے آئی تو سب سے زیادہ جھٹکا عنایہ نے کھایا تھا۔ کاہی رنگ کے ساتھ سلور کی ٹچنگ والا بہت اسٹائلش سا لباس، چاندی کی نہایت مناسب ڈیزائنگ والی جیولری اور ہلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی، بالوں کا بہت خوب صورت سا اسٹائل بنائے وہ پرانی والی کومل تو لگ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ اتنی جاذب نظر اور پیاری لگ رہی تھی کہ حسن حیران رہ گیا۔

"ارے.....! تم تو پہچانی ہی نہیں جا رہی۔" اس نے کہا، وہ نہال ہوئی۔ اپنی محنت وصول کر کے اس کا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔

"اتنا اچھا میک اپ کرنا کہاں سے سیکھا تم نے؟" صوفیہ نے پوچھا تو کومل نے بس مسکرا کر اسے دیکھا۔ اسد کی ممی سے اس نے بیس دنوں میں میک اپ اور ہیئر اسٹائلنگ سیکھ لیا تھا۔ ذہین تو وہ تھی ہی، دماغ سے چربی اترنے کے بعد اس کے دماغ نے تیزی سے کارکردگی شروع کر دی تھی۔

"ہر اقدام موٹیویشن مانگتا ہے۔ موٹیویشن جتنا اسٹرونگ ہوگا، عمل بھی اتنا ہی مضبوط ہوگا، بس یہ سمجھ لیں کہ یہ والی کومل کہیں کھو گئی تھی، اسے ڈھونڈ کر لانے میں میرے دل کا ہاتھ ہے۔" اس نے اپنی کزن کی کسی بات کے جواب میں کہا۔

"اتنی بڑی بڑی باتیں کرنا کہاں سے سیکھی؟" پونم حیران رہ گئی۔

"بقراط کی صحبت میں رہتی ہیں محترمہ آج کل۔ انہی سے فلسفہ پڑھا ہوگا۔" کانوں میں جھمکیاں پہنتی ہوئی عنایہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

"جی نہیں، آپی شروع سے ہی بہت عقل مند رہی ہیں، بس کسی نے انہیں پہچانا نہیں، حسن بھائی تو جوہری نکلے، جنہوں نے اس ہیرے کو پہچان کر ضائع ہونے سے بچا لیا۔" مانی نجانے کب وہاں آیا تھا۔ کومل کا مذاق اڑتا دیکھا تو نمک حلالی سے باز نہ آیا۔ یہ نمک حلالی بے چارے کو خاصی مہنگی پڑ گئی تھی۔

"ایک یہ عقل مند ہیں اس گھر میں اور ایک ان کی آپی۔ ایک اندھے کا سہارا دوسرا اندھا۔" عنایہ نے قہقہہ لگایا تو چند ایک کو چھوڑ کر باقی ساری لڑکیاں بھی ہنس دیں۔ کومل کو شدید ذلت کا احساس ہوا۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اتر گیا۔ پونم کو عنایہ پر شدید غصہ آیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

''یہ دستورِ زمانہ ہے کہ اچھی تبدیلی کی آمد لوگوں سے ہضم نہیں ہوتی۔ تنقید کا حوصلہ رکھنا چاہیے، گر وہ صحیح ہو...... وگرنہ جواب دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ کومل تمہیں اگر عنایہ کی بات صحیح نہیں لگی تو خود جواب دینا سیکھو اور عنایہ اگر اسی بھری محفل میں کومل اس طرح تمہاری انسلٹ کر دیتی تو تمہیں کیسا لگتا؟'' حسن راسلک کے کرتے اور شلوار میں ملبوس سینے پر ہاتھ باندھے کہہ رہا تھا۔

''میں صرف مذاق کر رہی تھی۔'' عنایہ کو غصہ آ گیا۔

''مذاق کرنے اور مذاق اڑانے میں فرق ہوتا ہے عنایہ۔ اگر تمہیں کومل کی یہ تبدیلی اچھی لگی تو کھلے دل سے اعتراف کرو۔ اس سے تمہاری عزت نہیں گھٹے گی اور سب لوگ اچھی طرح سے سمجھ لیں کہ کومل کا مذاق اب کوئی نہیں اڑائے گا۔ یہ کوئی کھلونا نہیں کہ جسے جب چاہا پیروں کے نیچے روندا جائے۔ یہ ہماری کزن ہے، ہماری اپنی ہے۔ ہماری طرح انسان ہے اور ہم سب سے بہت خوب صورت ہے۔'' وہ اس وقت بے حد سنجیدہ تھا اور یقیناً سخت غصے میں بھی کیونکہ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ماحول یک دم ہی مکدر ہو گیا تھا۔

''آپ لوگ انجوائے کریں۔ میں تو مانی کو بلانے آیا تھا۔ چلو یار تمہیں دادو بلا رہے ہیں۔'' وہ مانی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر لاؤنج سے باہر نکل گیا۔ عنایہ سخت خراب موڈ میں باہر نکل گئی تھی۔ سب خاموش ہو گئی تھیں۔

''ارے یہ سب کو سانپ بیک وقت کیسے سونگھ گیا؟'' امام اور فواز اندر آئے تو حیرت سے سب کو دیکھا۔

''اتنی خواتین کے ہوتے اتنی خاموشی کیسے، یہ کیا معمہ ہے؟'' فواز نے ٹکڑا لگایا۔

''ہم خواتین نہیں لڑکیاں ہیں۔ فوراً تصحیح کی جائے۔'' فواز کی ایک ننھیالی کزن نے ماحول کے بھاری پن کو دور کرنے کی غرض سے کہا۔

''او کے او کے، مائی مسٹیک، تو لڑکیوں آپ سب اتنی خاموش کیوں ہو، بھئی دھوم دھڑکا کرو۔ کل سے چاند منزل کی ایک کرن کسی اور گھر میں اجالا کرے گی۔ خوشی کا مقام ہے۔'' امام نے اپنی پٹاری سے فلسفہ نکال کر سب کو علم بانٹا۔

''لو، یہاں بقراطوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک اور آ گئے ہیں۔'' ایک دوسری کزن ہنسی اور ماحول میں جلترنگ بجنے لگے۔ کچھ دیر پہلے کی بدمزگی کا شائبہ بھی نہ رہا تھا مگر وہ اب بھی چپ چپ تھی۔ حسن کی باتیں اس کے ذہن میں گونج رہی تھیں۔

❁......❁......❁

عنایہ فطرتاً ایک خود پسند اور خود غرض لڑکی تھی۔ اس کی ان دونوں خامیوں کو پال پوس کر جوان کرنے میں اس کی ممی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ غلط تربیت نے اس کے اندر بہت ساری خامیاں پیدا کر دی تھیں۔ جو بظاہر نظر نہیں آتی تھیں۔ جو لوگ اس کے قریب تھے صرف وہی ان خامیوں سے آگاہ بھی تھے۔ خود پسندی کا یہ عالم تھا کہ اپنی ذات سے آگے اسے کوئی دکھائی نہ دیتا اور خود غرضی اس عروج پر تھی کہ چاہے کسی کا بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے مگر جو وہ چاہتی اسے ہر حال میں پورا ہونا چاہیے۔

اسے کومل سے تب سے خار اور حسد محسوس ہونے لگا تھا جب سے حسن نے اسے توجہ دینی شروع کی تھی۔ حالانکہ حسن کے لیے اس کے جذبات خاص نہ تھے۔ جس طرح اور کزنز تھے ویسے ہی حسن بھی اس کے لیے تھا مگر اس روز جب حسن کے منہ سے اس نے دادو کے سامنے کومل کے لیے باتیں سنیں تو اسے بہت برا لگا۔ وہ اسے پڑھانا چاہتا تھا جبکہ بظاہر اس معاملے سے عنایہ کا کوئی تعلق نہ تھا۔ نہ ہی کومل اور عنایہ کا کوئی مقابلہ تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ حسن نے عنایہ کے حسن کو خراج نہ بخشا تھا۔ دوسرے لوگوں کی طرح اس کے انداز اور نگاہوں میں عنایہ کے لیے تحسین اور عنایات نہ تھیں۔ اس نے عنایہ کو اتنے سالوں میں دیکھنے کے بعد بھی اسی طرح برتا تھا جیسے کہ اپنی باقی کزنز کو۔ عنایہ کے نزدیک یہ اس کی بے عزتی کرنے کے مترادف تھا کہ حسن نے اسے نظر انداز کیا مگر وہ یہ بات نہیں سمجھی تھی کہ حسن نے اپنی عمر کا بہت ہی حساس اور نازک دور اس معاشرے میں گزارا ہے جہاں عورت نامی ''زندہ مجسمے'' حسن میں اپنی مثال آپ مانے جاتے ہیں۔ عنایہ کا حسن اس ملک کی نسوانی خوب صورتی کے مقابلے میں

کچھ بھی نہ تھا۔

شاید عنایہ میں حسن کو کوئی کشش محسوس ہوتی، اگر وہ اپنے حسن کو حجاب وحیا کا زیور پہناتی مگر مغربی معاشرے کی تہذیب وآرائش اسے بدبودار لگی تھی۔ اسے مغرب زدہ عنایہ میں کیسے دلچسپی ہوسکتی تھی مگر عنایہ نے حسن کو راغب کرنے کے لیے محنت ضرور شروع کردی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے باتیں کرتی۔ اس کے سامنے جاتی، جان بوجھ کر کوئی نہ کوئی بحث چھیڑ دیتی تاکہ اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت بتایا جاسکے۔ وہ جان گئی تھی کہ حسن کے دل میں کومل کے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ اسے صرف اٹھارہ انیس سال کی بچی سمجھتا ہے اور بس مگر کومل کا رجحان وہ حسن کی جانب دیکھ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کومل عمر کے جس دور سے گزر رہی ہے، اس دور کی نزاکت کانچ سے زیادہ نازک ہوتی ہے۔ اس نے کومل کی عمر، اس کی سوچ اور اس کے اکیلے پن کا فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی تھی۔

❁......❁......❁

''آئم سوری۔'' جب عنایہ نے کومل سے اپنے رویے کی معذرت کی تو کومل اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

''میں نے تمہیں ہرٹ کیا، حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ سوری فار دیٹ۔'' اس نے کومل سے مسکرا کر کہا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اٹس او کے۔'' عنایہ جیسی مغرور لڑکی اس سے معذرت کررہی تھی اور کومل کے ذہن میں کیوں کا سوالیہ نشان بھی نہیں بنا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد عنایہ مدعا پر آئی۔

''حسن بھائی تو تمہارا اتنا ذکر کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ کومل جیسی کوئی لڑکی نہیں۔''

''اچھا۔'' اس نے اشتیاق سے گال کے نیچے نرم گلابی ہتھیلی رکھی اور آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے عنایہ کو دیکھا۔

''اور کیا کہتے ہیں؟''

''حسن کہتے ہیں کہ کومل اتنی اچھی ہے کہ کوئی بھی لڑکا اس سے محبت کرسکتا ہے اور فنکشن میں تو سب سے زیادہ اچھی لگ رہی تھیں کہہ رہے تھے کہ جب بھی وہ شادی کریں گے کومل......'' عنایہ لگاتار بول رہی تھی کہ اسی وقت دادی اور امی باتیں کرتی ہوئی اس طرف چلی آئیں اور عنایہ نے ان دونوں کو دیکھ کر بات ہی بدل دی۔ کومل کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ عنایہ سے کہے کہ پلیز اپنی بات پوری کرو۔ تمہاری اس ادھوری بات نے میرے اندر ہلچل مچادی ہے۔ تم نے میرے دل کے بند دروازے پر اتنی زور سے ضرب دی ہے کہ پورے کا پورا دروازہ ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے مگر حجاب آڑے آگیا تھا۔ بیس سالہ اس صحت مند لڑکی کا نازک سا دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ عنایہ خود تو جاچکی تھی مگر اسے بے چین کرگئی تھی۔ حسن بھائی اسے بہت اچھے لگتے تھے مگر عنایہ نے پسند اور محبت کے درمیان موجود اس بال برابر دیوار کو ٹھوکر سے توڑ دیا تھا۔ محبت اور توجہ کو ترسی وہ لڑکی اس سیلاب کے ساتھ بہتی ہوئی محبت کی حدود میں داخل ہوگئی اور اس دریا کی گہرائیاں ناپنے لگی جسے لوگ، شاعر، دنیا والے، دل والے، احساس رکھنے والے محبت کہتے ہیں۔

❁......❁......❁

سفید اور سلور کنٹراسٹ لباس جس پر میرون اور کاپر کلر کی بے حد باریک تاروں کا بہت ہی ہلکا سا کام بنا ہوا تھا، جس کے گلے پر سلور بے حد چھوٹے چھوٹے موتیوں کا کام تھا اور جس کا دوپٹا لباس کے ہم رنگ اور کام سے بوجھل تھا، میں ملبوس تھی۔ اس نے لباس سے میچنگ کے بڑے بڑے آویزے پہن رکھے تھے اور اس کی دودھیا انگلیوں میں دو بہت خوب صورت اسٹائل کی انگوٹھیاں تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی زیور نہیں پہنا تھا۔ اس لباس کی آستین نفیس نیٹ سے بنی تھیں اور اس کے کفز پر تقریباً ایک ایک بالشت کے برابر لباس سے ہم رنگ موتی اور تاروں سے کڑھائی کی گئی تھی۔ آستین فٹنگ والی تھیں اور پہلی نظر میں دیکھنے پر یہی گمان ہوتا کہ اس نے دونوں کلائیوں میں چوڑے کڑے پہن رکھے ہیں۔ آج وہ بطور خاص اسد کی ممی سے ان کے پارلر میں جاکر تیار ہوئی تھی۔ اس کے ریشمی بے حد گھنے اور لمبے بالوں کا بے حد خوب صورت سا ہیئر اسٹائل بنا کر بہت ہی نفیس سے میک اپ نے اس کے چہرے کے نقوش کو مزید

حسین بنا کر اسد کی ممی سمیت جس جس نے اسے دیکھا تھا سراہا تھا۔ اس کے لباس نے کومل کے جسم کے خدوخال کو سنبھال لیا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی کہیں گم تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی امام کے ساتھ واپس آئی تھی۔ امام اسے چھوڑ کر خود نجانے کہاں اڑن چھو ہوگیا تھا۔ گھر میں پہلا ٹکراؤ اس کا حسن اور اس کے ساتھ کھڑے فیروز بخت کے ساتھ ہوا تھا۔

''ارے کومل......! تم تو پہچانی ہی نہیں جارہی ہو۔'' حسن نے واقعی حیرت سے کہا اور وہ جھینپ گئی۔ اسے فیروز بخت یاد ہی نہیں تھا۔

''ان سے ملو...... یہ فیروز بخت ہیں، نعمان کے اور میرے بہت اچھے دوست اور فیروز یہ میری کزن ہے۔'' حسن نے اخلاقاً تعارف کرایا۔

''میں انہیں جانتی ہوں۔'' کومل کے منہ سے نکلا۔

''اچھا کیسے؟'' وہ حیران ہوا کیونکہ اس کے علم کے مطابق فیروز کا آنا جانا اس کے گھر میں بہت ہی کم تھا۔ کومل نے بہت ہی اختصار سے حسن کو ساری بات بتائی۔

''او...... اچھا...... چلو تم جاؤ اندر۔'' اس نے سر ہلایا۔ فیروز بخت کی آنکھوں میں کومل کے لیے عجیب سے رنگ اتر آئے تھے۔ اس چیز کو نہ کومل نے محسوس کیا نہ ہی حسن نے دیکھا کیونکہ فیروز کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔

۞......۞......۞

حسن نے بظاہر کچھ بھی نہیں کہا تھا اس نے تعریف بھی جس انداز میں کی تھی اس میں کوئی الگ رنگ نہیں تھا مگر کومل کے ذہن نے حسن کے ایک جملے کو اپنے ہی رنگ میں لیا تھا۔ عنایہ کی باتوں کے سحر نے اس کے ذہن کو جو راستہ دکھایا تھا، وہ اپنی خواہشوں کی رتھ سواری لے کر اسی راہ کی طرف نکل گئی تھی۔ بلاشبہ وہ حسین لگ رہی تھی مگر اس کے حسن کو دوآتشہ حسن کی طرف سے ملنے والی تعریف نے بنایا تھا۔ اس کے چہرے پر الوہی سی خوشی تھی۔ دھنک کے ساتوں رنگ تھے، جن کی حقیقت صرف عنایہ جانتی تھی۔ وہ پوری تقریب کو انجوائے کرتی رہی کیونکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی تھی۔

''محبت ایک دلدل ہے، جس کا فریب نظر نہیں آتا۔ چلتے چلتے پیروں کے نیچے سے زمین غائب ہوجاتی ہے اور کیچڑ میں پیر دھنس جاتے ہیں پھر جتنا بھی خود کو کھینچو، باہر نکالنے کی جدوجہد کرو، جسم اندر ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔ ساری کوششیں بیکار جاتی ہیں، میں بھی اسی دلدل میں دھنس چکی ہوں۔ خود کو کھینچنے کی اور باہر نکالنے کی کوشش مجھے اور زیادہ دھنسا رہی ہے مگر ایک عجیب اور نامانوس سا احساس ہے، جو نیا ہے مگر، سکون بخش رہا ہے، ایسا سکون جس میں بے چینی، اضطرار، تڑپ ہے مگر پھر بھی سکون ہے، یہ کیسی کیفیت ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوئی، یہ کیسا احساس ہے جو اجنبی ہے مگر پھر بھی اپنا اپنا سا ہے، حسن جن کو کل تک میں بھائی لگا کر سوچتی تھی، آج پرانے رشتے مگر نئے احساس کے ساتھ میرے دل میں اتر گئے ہیں، اس نئے رشتے کو کیا نام دوں؟ محبت......؟'' وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنے ہی عکس سے محو کلام تھی، کیسا انکشاف تھا، اس انکشاف نے اس پر آگہی کے نئے دروا کردیئے تھے۔ زندگی کو برگر اور پراٹھوں کے ذائقے میں تولنے والی لڑکی پر چاہت کی قوس وقزاح کے رنگوں کی بوچھاڑ پڑی تو اس کی اپنی سمجھ بھی جھٹکا کھا گئی۔

حسن کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی اور وہ ہیر بن کر اس کے قدموں میں بیٹھ گئی تھی۔ پورے فنکشن میں اس کی آنکھیں حسن کو تلاش کرتی رہتی تھیں۔ وہ اسے کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آہی جاتا یا پھر کسی مہمان سے گپیں لڑاتا ہوا، مکس گیدر رنگ تھی، زنانہ مردانہ الگ تھلگ کا چکر نہ تھا، ایک ہی ہال میں تمام مہمان موجود تھے، خوب دھوم دھڑ کا تھا، پھوپو بھی اپنے اکلوتے فرزند سمیت آئی تھیں، پھوپا دادو کے ساتھ سر جوڑے جانے کون سی کتھا سلجھا رہے تھے۔

''سمیہ بھابی...... یہ اپنی ننھی تو بہت پیاری ہوگئی ہے۔ شکر ہے اس نے اپنا فگر مینٹین کیا، دیکھیں ناں کیسی گلاب سی کھل رہی ہے ماشاء اللہ۔'' پھوپو شبنم کہہ رہی تھیں۔ وہ جو ادھر ہی تھی شرما گئی۔

۞......۞......۞

''حسن بھائی کو دیکھا ہے تم نے؟ تم سے نظریں ہی نہیں

ہٹا یار ہے، سبھی نے نوٹس لیا ہے۔'' جب وہ باربی کیو میں سے سلیکشن کررہی تھی تب عنایہ نے اس کے کان میں کہا۔

''اچھا......'' وہ چونکی اور تب ہی اس کی نظر حسن پر پڑی، کچھ قدموں کے فاصلے پر وہ فیروز بخت کے ساتھ کھڑا کباب پلیٹ میں نکالتے ہوئے ہنس رہا تھا اور تب ہی اس کی نظریں اتفاقیہ طور پر کومل سے ملیں۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا اور کومل کے پاگل دل نے اس عام سی مسکراہٹ کو بہت خاص سمجھ لیا۔ عنایہ نے معنی خیز نظروں سے کومل کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ میری بات پر یقین آ گیا۔ کومل نے اپنی پلیٹ میں بیکڈ فشن اور گرل کباب رکھے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر کھانے لگی مگر اس کا سارا دھیان حسن کی طرف تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اپنی اسمارٹنس اور ڈریسنگ پر مزید توجہ دے، اس پر سلیف گرومنگ کا بھوت سوار ہوگیا تھا۔

ساری تقریب میں وہ حسن کو سوچتی رہی اور فیروز بخت اسے...... اگر حسن سے توجہ ہٹا کر وہ ذرا بھی فیروز بخت پر دھیان دیتی تو اسے اندازہ ہوتا کہ وہ کتنی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے، فیروز بخت کی نگاہوں کو اس نے تو نہیں البتہ عنایہ نے ضرور نوٹس کیا تھا اور اس کی خود پسند طبیعت پر یہ بار گراں گزرا تھا کہ اس کی موجودگی میں اسے نظر انداز کرکے کوئی کومل کو دیکھے۔ اس وقت بھی وہ پانی کا گلاس منہ سے لگاتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

''ہیلو۔'' فیروز بخت کی آواز پر چونکی۔

''ہیلو۔'' وہ قدرے سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' اس نے کومل سے پوچھا اور ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''کیوں نہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ آج بہت الگ نظر آرہی ہیں۔ اگر میں یہ کہ آپ بہت حسین لگ رہی ہیں تو یقیناً آپ برا نہیں مانیں گی۔'' فیروز بخت خوب صورت انداز میں مسکرایا۔ کومل ہنس دی۔

''کوئی پاگل ہی ہوگا جو اپنی تعریف کا برا منائے گا۔ تھینکس۔'' وہ سادگی سے بولی۔

''آپ بہت معصوم ہیں، آج کے دور میں ایسی معصومیت کم ہی نظر آتی ہے۔'' وہ کشمیری چائے کا مگ لبوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

''ارے نہیں۔ آپ تو ضرورت سے زیادہ ہی تعریف کررہے ہیں۔'' وہ اس بار جھینپ گئی۔

''یہ سچ ہے۔'' فیروز بخت اعتماد سے بولا۔

''آپ کو لگتی ہوں، تھینکس۔ آپ کی مدر کیسی ہیں؟'' اس نے موضوع بدلا۔

''بالکل ٹھیک۔ اس روز جب آپ آئی تھیں ان کے گھٹنے میں کافی تکلیف تھی۔ آپ آیئے گا وہ آپ کو یاد کرتی ہیں۔'' فیروز نے کہا۔

''میں ضرور آؤں گی۔ ویسے آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لائے؟''

''آج کل وہ اپنے بڑے بھائی یعنی میرے ماموں کے پاس کویت گئی ہیں۔ اگلے ہفتے آ جائیں گی۔'' فیروز بخت نے کہا۔

''ہیلو۔'' عنایہ نے قریب آ کر ان دونوں کو چونکایا۔

''ہیلو۔'' فیروز بخت نے مسکرا کر کہا۔

''میں عنایہ ہوں، کومل اور نعمان بھائی کی کزن۔ آپ فیروز بخت ہیں ناں؟'' اس نے بے تکلفی سے کہتے ہوئے ایک کرسی کھینچی اور فیروز کے سامنے بیٹھ گئی۔

''جی ہاں...... آپ کے انداز و تکلم سے لگتا ہے کہ اس ناچیز کو جانتی ہیں مگر میں آپ سے پہلی بار مل رہا ہوں۔'' فیروز نے حیرت چھپاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''آپ کو حسن بھائی بلا رہے ہیں۔'' مانی کہیں سے وارد ہوا، کومل نے فیروز بخت سے ایکسکیوز کیا اور مانی کے ساتھ چل دی۔ مانی نے فیروز بخت کو مسکرا کر دیکھا۔ وہ اس سے مل چکا تھا۔

''آپ سے غائبانہ تعارف تھا، آج ملاقات کا شرف بھی ہوگیا۔'' عنایہ بولی۔ فیروز بخت در حقیقت اس کی بے تکلفی پر دل ہی دل میں حیران تھا کیونکہ نعمان کی فیملی کتنی ایڈوانس تھی اور کتنی بے تکلف اسے اندازہ تھا پھر کومل اور صنم سے ہونے والی ملاقات نے بھی چاند منزل کے مکینوں کے رہن سہن کی

کچھ وضاحت ضرور کردی تھی مگر عنایہ اسے باقی سب سے مختلف لگی تھی۔ بہت بولڈ اور ضرورت سے زیادہ بے تکلف۔ بے تکلف تو کومل بھی تھی مگر اس کی بے تکلفی میں حجاب وسنجیدگی تھی۔

''نعمان نے ذکر کیا ہوگا۔'' اسے پہلا خیال یہی آیا۔

''نہیں کومل نے۔'' وہ مسکرائی۔

''اچھا...... مگر ہماری تو ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔'' وہ حیران ہوئے مگر حیرت میں خوشگواریت کا تاثر زیادہ تھا۔ عنایہ اس کی بات پر چونکی۔ ان کی پہلی ملاقات اس کے علم میں نہیں تھی۔ مگر اس نے اپنی حیرت پر قابو رکھا تھا۔

''جی...... اور اسی پہلی ملاقات نے اس کے ذہن پر کافی گہرا اثر چھوڑا ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' اس بار فیروز بخت اپنی حیرت پر قابو نہ رکھ سکا۔

''مطلب تو واضح ہے۔ ہمارے گھر کی کومل کلی فیروز بخت کو دیکھ کر کھلنے لگتی ہے۔'' اس نے بہت ہی آسان زبان میں فیروز بخت کی حیرت دور کی۔

''جی......؟'' وہ بچہ نہیں تھا، عنایہ نے پردے میں ڈھکی بات پر سے پردہ ہی کھینچ دیا تھا۔

''مجھے تو کومل نے بتایا تھا کہ آپ بھی...... اوہ...... سوری...... شاید کومل کو کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔'' عنایہ نے چونکنے کی اداکاری کی اور اپنے لہجے میں شرمندگی پیدا کی۔

''کومل کو ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ ویسے بھی آپ جیسا اسمارٹ بندہ کومل کو تھوڑی پسند کرے گا۔'' اس نے تاسف سے کہا۔ فیروز بخت بالکل چپ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے کیا جواب دے۔

''معاف کیجیے گا میں ابھی آئی۔'' وہ معذرت کرکے اٹھ گئی اور فیروز بخت کو عجیب سی کیفیت سے دوچار کرگئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ عنایہ صرف اور صرف کومل کو دوسروں کی نظروں سے گرانا چاہتی ہے، چاہے وہ فیروز بخت ہو یا حسن۔ اپنی خود پسندی اور خودغرضی نے اسے اس دلدل میں دھکا دیا تھا جس میں گرنے کے بعد انسان کو کوئی ہاتھ مدد کے لیے نہیں ملتا۔ یہ دلدل انسان کی اپنی بنائی ہوئی ہے، جس میں گرنے کا فیصلہ بھی انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ فیروز بخت نے سفید لباس میں ملبوس ہنستی ہوئی کومل کو دیکھا، بے ریا اور معصوم ہنسی، جیسے کسی معصوم بچے کی ہوتی ہے۔ وہ حسن اور صوفیہ کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ فیروز بخت کے دل میں عجیب سی کیفیت نے سر اٹھایا پھر وہ لمحہ بھر نہیں رکا، نعمان سے معذرت کرکے گھر چلا آیا تھا۔

❁......❁......❁

شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو پھوپو اور اسفند یار بھی واپسی کے لیے رخت سفر باندھ رہے تھے، شبنم پھوپو نے اسفندیار سے بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ جانے سے پہلے اسفند کی مرضی سے کومل کے لیے بات بڑھانا چاہتی تھیں۔

''حسن بھائی...... میں نے پھوپو کے لیے یہ شرٹ ڈیزائن کی ہے، انہیں امبرائیڈڈ کرتے پسند ہیں۔ دیکھیں تو کیسی ہے؟'' وہ خوشی خوشی دکھا رہی تھی۔

''بہت زبردست ہے۔ تم اتنی سگھڑ نکلو گی مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ کہاں تو وہ روتی بسورتی کومل اور کہاں یہ ذمہ دار سی سلجھی ہوئی سنجیدہ کومل۔ جیسے تصویر کے دو رخ۔'' حسن کو واقعی اسے دیکھ دیکھ کر دلی سکون ملتا تھا۔ وہ ہنس دی۔ حسن نے دلچسپی سے اس کے گداز گالوں میں پڑنے والے ڈمپلز کو دیکھا۔ اس کے چہرے کی سب سے حسین چیز اس کی مسکان تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے اس کا چہرہ جگمگانے لگتا تھا۔

''اچھا چلو، میں بھی پھوپو کے کمرے میں ہی جارہا ہوں۔'' دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے۔

''کالج میں ایڈمیشن تو کرالیا ہے، اب جوائن کب سے کروگی؟'' حسن نے پوچھا۔

''امام کے بچے نے آپ کو بتادیا، اس کے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔'' کومل نے دانت پیسے۔

''اس نے مجھے نہیں بتایا، میں نے اس کے پاس کالج کا فارم دیکھ لیا تھا۔ ویسے اس میں چھپانے کی کیا بات؟ اچھی بات تو سب کو پتا لگنی چاہیے اور میں تو تمہارا ٹیچر بھی ہوں۔'' وہ

مسکرایا۔

"میں آپ کو بتانے والی تھی۔" اس نے بات بنائی۔

"اچھی بات ہے۔ تم اپنے گرد بنائی ہوئی اس چار دیواری کو توڑو۔ کومل کیا ہے، سب کو پتا لگنا چاہیے، تم میں اتنی خوبیاں ہیں کہ کسی عام لڑکی میں اتنی خوبیوں کا ہونا مشکل ہے۔ مجھے تم پر فخر ہے۔" حسن اس کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ کومل نے اپنی لانبی پلکوں والی نرگسی آنکھیں حسن پر جمائیں۔ وہ اس کے بالکل ساتھ ساتھ قدم ملا کر چل رہا تھا۔ وہ اس کا خواب تھا جو مجسم بنا اس کے ہم قدم تھا۔ وہ اس کی ہمت تھا جو اس کی ریڑھ کی ہڈی بن کر اس کی پشت اور وجود کو سہارا دیئے ہوئے تھا۔

"آپ نا ہوتے تو یہ کومل ضائع ہوجاتی۔ اس کومل کو کھوجنے والے تو آپ ہیں۔ میری شناخت ہیں آپ، اندھیروں سے نکال کر مجھے پہچان کی شناسائی دینے والے آپ ہیں۔ آپ کیا ہیں، میرے لیے میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔" وہ خاموش لبوں سے حال دل اس کو سنا رہی تھی۔ شبنم پھوپو کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تا کہ دستک دے مگر اندر سے آتی آوازوں نے اس کے ہاتھ کو مفلوج کردیا۔

"آپ سمجھتی کیوں نہیں، مجھے موٹی لڑکیاں پسند نہیں۔" اسفند یار جھلائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ حسن نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی طرح کھڑی تھی۔

"وہ موٹی نہیں رہی، صحت مند ہے، ڈائٹنگ کررہی ہے، مزید خود کو اسمارٹ کرلے گی۔" پھوپو نے کہا۔

"شادی کے بعد تو اچھی خاصی اسمارٹ لڑکیوں کو موٹا ہوتے دیکھا ہے میں نے ممی، وہ کیا خاک اسمارٹ ہوگی؟ مجھے کومل سے شادی نہیں کرنی، عنایہ کی بات کرلیں آپ۔" وہ اپنا فیصلہ سنا رہا تھا۔

"عنایہ کے مقابلے میں کومل بہت اچھی اور نیک بچی ہے اسفی۔ میں نے یہاں رہ کر اسے ٹھیک سے پرکھا ہے، اتنی سگھڑ اور گھریلو لڑکی ہے، اسے تھوڑا سا پالش کرلو گے تو وہ مزید گرم ہوجائے گی۔ عنایہ بالکل اپنی ماں جیسی ہے، حسنہ بھابی والے تیور ہیں اس کے۔ وہ تمہیں گھر کا سکھ نہیں دے گی۔" پھوپو نے اسے سمجھنا چاہا۔

"اگر کومل سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو صنم یا پونم میں سے کسی کو چن لو۔ عنایہ سے تو بہتر ہیں۔" پھوپو نے کہا۔

"نہیں ممی...... بس عنایہ ہی، آپ اب مزید کچھ مت کہیں۔" اسفند نے بات ہی ختم کردی۔ حسن نے پتھرائی ہوئی کومل کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اسی حالت میں تھی۔ اس نے نرمی سے اس کا فضا میں معلق ہاتھ اپنے گداز مضبوط ہاتھوں میں لیا اور اسے دیکھے بنا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے اس کے ہمراہ کھینچی ہوئی چلی جارہی تھی۔ حسن اسے لے کر دادو کی اسٹڈی میں آ گیا۔

"بیٹھو......" اس نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا پھر خود بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"دنیا کا معیار نظر اتنا سطحی ہے؟ مجھے پتا نہیں تھا۔" اس کے لب کھلے۔

"تمہیں اس بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ تم میں کوئی کمی نہیں۔" حسن بولا کومل نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے دکھ اس بات کا نہیں کہ مجھے رد کیا گیا، یہ تو زندگی کا حصہ ہے مگر وجہ کتنی بودی تھی۔ کیا اتنی سی بات پر کوئی کسی کو ٹھکرا سکتا ہے؟ عنایہ آپی اسمارٹ اور خوب صورت ہیں، بہت پڑھی لکھی ہیں، بات کرنے کا فن جانتی ہیں، فیشن پر بات کرسکتی ہیں، ڈریسز ڈیزائن کرسکتی ہیں، ایک سے ایک فیشن کرسکتی ہیں مگر کیا وہ کھانا پکانا جانتی ہیں، بڑوں کی جس طرح سے عزت کرنی چاہیے کیا وہ کرتی ہیں، کیا وہ خود سے ہٹ کر کسی کا سوچتی ہیں، کیا وہ کسی کے درد میں شریک ہوسکتی ہیں، کیا وہ گھر آئے مہمانوں کی خاطر داری اس طرح کرسکتی ہیں جس طرح سے ایک وضع قطع والے خاندان میں مہمان نوازی کرنی چاہیے، کیا وہ جانتی ہیں کہ رشتوں کو نبھانے کے اصول کیا ہوتے ہیں، کن اصولوں پر رشتہ داریاں نبھانا

ضروری ہوتا ہے؟ اور کتنا کچھ...... اور کتنا کچھ ہے حسن بھائی...... وہ ان میں سے کچھ نہیں جانتیں...... زندگی گزارنے کے لیے جن شرائط پر ہم رشتے نبھاتے ہیں انہوں نے کچھ نہیں سیکھا۔ پھر بھی انہیں سلیکٹ کیا گیا اور میں جو سب کچھ جانتی ہوں، عملاً کرتی ہوں، صرف میرے موٹاپے کی وجہ سے مجھے مسترد کیا گیا۔ میں اتنی ارزاں ہوں؟'' وہ بے حد دکھ سے کہہ رہی تھی۔

''سطحی نظر رکھنے والے ہیرے کو پتھر ہی سمجھتے ہیں کومل، ایک عام و معمولی پتھر، ہیرے کی اصل پہچان جوہری کرتا ہے اچھا ہی ہوا کہ تم کسی سطحی نظر اور تنگ ذہن رکھنے والے کے حوالے نہیں کی گئیں، ورنہ کوئلہ بنادی جاتیں۔ تمہاری قدر کیا ہے؟ مجھ سے پوچھو، دادو، دادی، تمہارے گھر والے، ہم سب ہی تمہارے جوہر سے واقف ہیں۔ تمہیں دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم میں کس چیز کی کمی ہے جو تم سوگ مناؤ؟ تمہارا جوڑا کوئی تمہارے جیسا ہی ہیرا ہوگا۔'' حسن کہہ رہا تھا، نرمی سے شفقت سے۔

''یہ آپ نہیں کہہ رہے، آپ کی محبت کہہ رہی ہے، ورنہ میری خوبیاں نظر بھی تو آتیں سب کو۔'' لاشعوری طور پر اس کے منہ سے نکل گیا۔

''ہاں...... یہ میری محبت بول رہی ہے کومل مگر محبت بھی یونہی نہیں بولتی، تم اتنی طاقت ور ہو کہ اپنا آپ منواتی ہو۔ جنہوں نے تمہیں رد کر کے کنکر کا انتخاب کیا ہے۔ انہیں بھی کچھ وقت بعد اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔'' حسن نے بے ریا اور سادہ سے انداز میں کہا مگر اس کی تسلی اور گفتگو کو کومل نے من چاہا رنگ دے دیا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو گئے اور پلکیں بوجھل ہو کر سرخ ہوتے عارضوں پر گر گئیں۔ حسن اس کے دل کی حالت سے بے خبر جانے کیا کچھ اسے سمجھا رہا تھا، کیا کچھ کہہ رہا تھا مگر اس کی سماعتوں میں حسن کے منہ سے نکلا جملہ امرت گھول رہا تھا۔

''ہاں...... یہ میری محبت بول رہی ہے۔'' کومل اس جملے کی بازگشت کی زنجیریں خود کو پہنا رہی تھی، اسے کچھ یاد تھا نہ سنائی دے رہا تھا۔ مانی وہاں آیا تھا۔ حسن کے لیے کسی کا فون تھا وہ باہر چلا گیا مگر کومل اس جملے کی قید سے باہر نہ آسکی تھی۔ مانی اس سے نجانے کیا کہہ رہا تھا مگر اس کی سماعتیں کسی اور کی آواز کو قبول ہی نہیں کر رہی تھیں۔ مانی حیرت سے اس کو دیکھ رہا تھا۔

✿......✿......✿

پھوپو جاتے جاتے حسنہ سے اسفند یار اور عنایہ کے رشتے کی بات چھیڑ گئی تھیں۔ ان کے اس فیصلے میں دادو اور دادی سمیت گھر کے سب ہی بڑے بزرگ شامل تھے۔ عنایہ کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اتنا خوبرو، امیر اور زبردست سا بندہ اس کی زندگی کا ہم سفر بنے گا، ایسی شاندار زندگی جیسی وہ چاہتی تھی اس کی منتظر تھی، اس نے خود پر پہلے سے زیادہ توجہ دینا شروع کر دی تھی۔ اس روز کومل ڈرائنگ روم کے پرانے کشنز کور اتار کر نئے چڑھا رہی تھی۔ ان کورز پر ایپلک ورک اس نے خود کیا تھا۔

''یہ کہاں سے آئے؟ بہت خوب صورت ہیں۔'' نازیہ کی نظر پڑی تو پوچھا۔

''یہ ڈیزائن تو میں نے پچھلے ہفتے نیٹ پر دیکھا تھا۔ بالکل نیا ہے، امی لائی ہیں کیا؟'' پونم نے پوچھا۔

''میں نے بنائے ہیں۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تم نے......! تم نے کہاں سے سیکھ لیا اتنا سب کچھ؟'' عنایہ جو میگزین اٹھا رہی تھی چونکی اور حیران ہو کر اسے دیکھا مگر پوچھا طنز سے۔

''میں فارغ اوقات میں اسی طرح کے تجربے کرتی ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''واقعی......! بھئی تم نے تو حیران کر دیا۔ بڑی چھپی رستم نکلیں تم تو اور کیا کیا تخلیق کیا ہے ہماری ننھی نے؟'' تائی جان نے حیرت سے مگر خوش ہو کر پوچھا۔

''تائی جان...... اس نے تو ہم میں سے بھی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ بڑی گھنی ہے یہ۔'' پونم نے محبت سے اس کو ساتھ لگایا۔

''گھنی نہیں سگھڑ، سگھڑاپے کی نشانی یہی ہوتی ہے کہ انسان کہیں سے بھی کچھ بھی اٹھا کر کوئی شاہکار تخلیق کر لے۔

آپ کو پتا ہے کومل نے یہ ساری چیزیں پرانی ردی سے بنائی ہیں۔" امام نے بھٹہ کھاتے ہوئے کہا۔
"جی ہاں، ساری ردی مجھ سے ہی چنوائی جاتی تھی۔" مانی منہ بنا کر داد وصول کرنے چلا آیا۔
"میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ ہماری کومل بہت گنوں والی ہے۔ بس ایک موقع چاہیے تھا اسے۔ اب دیکھیں...... کیسے کیسے جوہر باہر آ رہے ہیں۔ گھر بیٹھے، بغیر کسی انسٹرکٹر کی مدد کے ازخود کیسے کیسے تجربے ہو رہے ہیں۔" حسن سیب کھاتے ہوئے بولا اور کومل کو دیکھا۔
"خیر...... یہ تو کوئی بھی بنا سکتا ہے۔ اتنا مشکل نہیں ہے۔" عنایہ نے نخوت سے ناک سکیڑی۔
"ہر کوئی وہ نہیں کر سکتا جو کومل کر سکتی ہے۔ چچی جان آپ کا یہ والا پیس نادر و نایاب ہے۔" حسن نے کھلے دل سے تعریف کی۔ وہ مسکرا کر بیٹی کو دیکھنے لگیں۔ ان کی نظروں میں فخر اور محبت تھی۔
تائی جان نے غور سے بیٹے کی طرف دیکھا پھر کومل پر جا کر ان کی نظریں ٹھہر گئیں مگر کوئی واضح نتیجہ اخذ نہ کر سکیں۔ حسن کو وہ جانتی تھیں، اتنی تعریفیں تو وہ ان کی بھی نہیں کرتا تھا حالانکہ ماں تھیں۔
"جو قمیص تم نے شبنم کے لیے کاڑھی تھی لاجواب تھی، بھئی سمعیہ، تمہاری بیٹی تو ہیرا نکلی۔" انہوں نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی تو کومل کے گلابی رخساروں پر دھنک اتر آئی۔
"لڑکیوں کی اصل سجاوٹ اور حسن ان کا سگھڑاپا ہی ہوتا ہے۔ شکل و صورت تو اللہ بناتا ہے باقی لباس اور بناؤ سنگھار تو ہر لڑکی کر ہی لیتی ہے۔ اللہ نے ہماری ننھی کو سجا سنورا بنایا ہے۔" دادی جان نے ٹکڑا لگایا۔
"صحیح فرمایا اماں جان، اللہ نصیب بھی سجائے۔ آمین۔" تائی جان نے خلوص دل سے دعا دی۔
"اچھا لڑکیوں...... تم لوگ ذرا رات کے کھانے کی تیاری کرو۔ شاباش۔" تائی جان نے سب لڑکیوں کو وہاں سے اٹھانا چاہا۔
"چڑیاں ہیں یہ سب...... ایک ایک کر کے اڑ جائیں گی۔ کچھ چڑیوں کا آشیانہ، ٹھکانہ اسی چاند منزل میں کرلو۔" دادی جان نے لڑکیوں کے باہر نکلتے ہی معنی خیز انداز میں کہا۔
"جی اماں جان...... میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں۔ ویسے آپ ذرا کھل کر بات کرلیں تو اچھا ہے۔" تائی جان نے ادب سے کہا۔
"راحیل اور سمعیہ کی تینوں لڑکیاں ابھی گھر میں ہی ہیں۔ صوفیہ اور عنایہ تو باہر چلی گئیں مگر تمہارے ابا جی اور میں چاہتے ہیں کہ اب یہ تینوں لڑکیاں گھر میں ہی رہیں۔ ماشاء اللہ سے حسن، نعمان، صنوبر اور فواز اپنے ہی بچے ہیں۔ خیر فواز تو ابھی بہت چھوٹا ہے، ابھی تو پڑھ رہا ہے مگر حسن اور نعمان تو ماشاءاللہ سے برسر روزگار ہیں۔ صنوبر بھی اگلے سال پڑھائی ختم کر رہا ہے، اس کے پاس بھی مواقع اچھے ہیں۔ تم لوگ بسم اللہ کرلو۔ کم سے کم یہ تینوں بچیاں تو چاند منزل سے باہر نہ جائیں۔" انہوں نے عندیہ پیش کیا۔
"بہت اچھی بات ہے اماں جان، میرے دل کی بھی یہی آرزو ہے۔" تائی جان بولیں۔ حسن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔
"السلام علیکم!" نعمان نے اسی وقت اندر آتے ہوئے حاضرین پر سلامتی بھیجی۔
"وعلیکم السلام! جیتے رہو آؤ یہاں بیٹھو۔" دادی جان نے نعمان کے لمبے چوڑے وجود کو دیکھ کر اندر ہی اندر نظر اتاری۔
"بڑی اہم محفل سجی ہے بڑے بھیا۔ آپ بروقت تشریف لائے۔" امام نے ہانک لگائی۔
"اچھا...... کیا اہمیت ہے اس محفل کی، ذرا ہم بھی سنیں۔" وہ مسکرایا۔
"اسے تو عادت ہے ہانکنے کی۔ تم سناؤ، سب ٹھیک چل رہا ہے۔" سمعیہ نے امام کو گھورا تو وہ کان کھجا کر باہر نکل گیا۔
"جی چچی جان، شکر ہے، اچھا مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" نعمان خواتین سے مخاطب ہوا۔
"ہاں...... ہاں بولو۔" دادی جان نے کہا۔
"میرا دوست ہے فیروز بخت، صوفی کی شادی میں

ملاقات ہوئی تو تھی آپ سب کی۔'' نعمان نے کہا۔

''ہاں ہاں...... یاد ہے۔ بہت ہی اچھا بچہ ہے۔ اس کی ماں نے بڑی محنت کی ہے بچے پر تربیت صاف نظر آ رہی تھی۔'' دادی جان بولیں اور دونوں خواتین نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔

''وہ کل اپنی والدہ کے ہمراہ گھر آنا چاہتا ہے، میں نے اسے شام کی چائے پر مدعو کرلیا ہے۔ آپ لوگ ذرا اچھا سا ارینجمنٹ کر لیجیے گا اور ہاں ننھی سے کہیے گا کہ ڈھنگ سے تیار رہے۔ میرے خیال میں وہ لوگ اسی سلسلے میں آ رہے ہیں۔'' نعمان نے بتایا تو سب ہی چونکے۔

''کیا...... ؟ اچھا مگر تم سے کوئی بات ہوئی ہے کیا؟'' تائی امی نے چونک کر پہلے ساس کو پھر بیٹے کو دیکھا۔

''نہیں...... واضح تو نہیں مگر اشارہ دیا تھا، فیروز کی والدہ نے۔ میری ان سے اچھی بات چیت ہے۔ بہت سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ بہت مختصر سی فیملی ہے۔ فیروز کے والد کا پچھلے سال انتقال ہوگیا تھا۔ فیروز نے تعلیم مکمل کر کے اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے بہت پہلے ہی بزنس میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ شوہر کے گزر جانے کے بعد بیٹے کے ساتھ بزنس کو دیکھتی ہیں، اب چند مہینوں سے بہت بیمار رہنے لگی ہیں، باقی فیرزو سے آپ لوگ مل چکے ہیں، میں جہاں تک اسے جانتا ہوں وہ بہت میچور اور سلجھا ہوا ہے، طبیعت میں بھی سادگی ہے۔'' نعمان نے بتایا۔

''مگر ننھی سے تو خاصا بڑا ہوگا عمر میں۔'' دادی نے پوچھا۔

''حسن بھائی جتنے ہیں۔ عمر کا فرق ہے بھی تو کوئی خاص آبجیکشن والی بات نہیں ہے۔ مرد کی عمر اس وقت نظر انداز کی جاسکتی ہے جب وہ ہر لحاظ سے بہتر ہو پھر وہ ینگ ہے بوڑھا نہیں۔ آپ لوگ کل مل لیجیے گا۔ اتنی جلدی کیا ہے؟ کل تو وہ لوگ آ رہے ہیں۔'' نعمان اطمینان سے بولا۔ حسن چپ تھا، اس نے نہ کوئی سوال کیا نہ ہی کوئی بات پوچھی تھی، وہ کسی سوچ میں گم تھا۔

''ٹھیک ہے تم اپنے چچاؤں سے بھی ذکر کر دینا اور دادا سے بھی۔''

دادی نے کہا۔

''جی، ظاہر ہے، دادو سے تو ذکر کر چکا ہوں۔'' نعمان نے بتایا۔ ''کھانے میں کیا ہے؟ بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' نعمان نے پوچھا۔

''بس کھانا لگنے والا ہے، تم ہاتھ منہ تو دھولو۔''

❁......❁......❁

ماں کو تو وہ صاف منع کر چکا تھا۔

''کومل مجھ سے بہت چھوٹی ہے باقی صنم اور پونم کو میں نے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ وہ میرے صوفی کی طرح ہیں۔ آپ نومی کے لیے بات کرلیں۔'' اس کے صاف انکار پر تائی جان بجھ سی گئی تھیں۔ انہوں نے نعمان سے بھی یہی بات کی تو اس نے صنم کے لیے رضامندی ظاہر کردی۔ صنوبر سے انہوں نے پونم کے بارے میں پوچھا تو اسے ہامی بھرنے میں وقت نہ لگا۔ وہ رات ان کے لیے بہت خوشی کا مقام تھا۔ انہوں نے دادو اور دادی جان تک بچوں کی رضامندی پہنچا دی۔

''اگر حسن ننھی کے لیے ہامی بھر لیتا تو گھر کی بچی گھر میں ہی رہ جاتی مگر خیر...... ہم رشتوں میں زبردستی کے قائل نہیں۔ فواز کے لیے ہم نے حسنہ اور راحت سے بات کی تھی۔ رات تو راضی تھے مگر حسنہ بہو نے ہمیں خاصا مایوس کیا یہ کہہ کر کہ کومل میں کوئی گن نہیں۔ ہم اپنی ہیرا سی بچی کسی ناقدرے کو نہیں سونپ سکتے...... خیر جوڑے تو بنتے ہی آسمانوں پر ہیں۔ یہ رشتہ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔'' انہوں نے بات سمیٹی۔ گھر بھر میں ابھی یہ بات کھلی نہیں تھی۔ بڑوں کا ارادہ تھا کہ فیروز بخت والے رشتے کے بعد باقی رشتوں والی بات بھی کھول دی جائے۔ وہ حسن سے خود بات کرنا چاہتے تھے۔ قصداً لڑکیوں کو مہمانوں کی آمد کی اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ صرف یہ بتایا گیا تھا کہ نعمان کے دوست اور ان کی فیملی ملنے آ رہی ہے۔ چاند منزل میں مہمانوں کا آنا جانا معمول کی بات تھی۔

چائے کی دعوت میں خاصا اہتمام تھا۔ جب سے کومل

نے کچن کا چارج سنبھالا تھا ماما کی جان سکھی ہوگئی تھی۔ وہ بہت پھرتی اور صفائی سے کام کرتی تھی۔ جسمانی پھرتی کے ساتھ ساتھ اس کا سلیقہ وصفائی ستھرائی کی خوبیاں بھی نکھر کر سامنے آ گئی تھیں اس وقت بھی وہ ماما اور صنم کے ساتھ مل کر لوازمات تیار کررہی تھی۔ حسن کچن میں آیا تو وہ بری طرح مگن ومصروف تھی۔ حسن نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا تھا۔ اکیس سال کی وہ ہری بھری ڈال اپنی دھن اور سرمستی میں جھوم جھوم کر کام نبٹا رہی تھی۔ گلابی رنگ کے لباس میں ملبوس وہ جب حرکت کرتی تو اس کی گھٹنوں تک لہراتی چوٹی جھوم جاتی۔ چولہے پر کباب تلتی، سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ وہ اردگرد سے بے خبر تھی۔

''ارے حسن میاں کچھ چاہیے؟'' ماما کی نظر اس پر پڑی تو چونکی۔ کومل نے چونک کر پلٹ کر اسے دیکھا بلیک پینٹ اور وائٹ ٹی شرٹ پہنے چپ چاپ سا کھڑا تھا۔

''آیئے حسن بھائی...... کباب کھائیں گے؟'' اس نے پیشکش کی۔

''تم نے بنائے ہیں؟'' اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

''جی ٹرائی کریں۔'' اس نے ایک چھوٹی سی پلیٹ میں کباب اور چمچ رکھ کر اسے پیش کیا۔

''تم جانتی ہو کون لوگ آئے ہیں؟'' اس نے کباب کو چمچ سے توڑا۔

''نومی بھائی کے گیسٹ ہیں۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''پہچانتی ہو انہیں؟'' حسن نے کباب کا دوسرا پیس توڑا۔

''پتا نہیں، میں نے پوچھا نہیں کون ہیں۔ آپ جانتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں...... تم ان سے ملو گی؟'' حسن نے پھر سوال کیا۔ کومل نے اس بار حیرت سے اسے دیکھا۔

''میرا کیا کام...... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں، کباب بہت اچھا تھا۔'' اس نے پلیٹ آہستگی سے رکھی اور باہر نکل گیا۔ وہ کچھ نا سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکا کر اپنے کام میں مگن ہوگئی۔

❁......❁......❁

''حسن...... بیٹے نھی کے بارے میں منع کرنے کی کیا صرف وہی وجہ تھی جو تم اپنی ماں کو بتا چکے ہو؟'' دادو نے اس سے پوچھا۔

''جی دادو۔'' اس نے نظریں جھکائیں۔

''تو بیٹا...... یہ تو کوئی ایسی قابل اعتراض وجہ نہیں، عمروں کا طبعی فرق اس وقت مٹ جاتا ہے جب ذہنی ہم آہنگی ہو جائے اور میرا خیال ہے کہ نھی اور تمہارا ذہن ملتا ہے۔ تم اسے اچھی طرح سمجھتے ہو اور وہ بھی تمہیں اپنے دل سے بہت قریب رکھتی ہے۔ کیا تم اس کے بارے میں کوئی خاص احساس اپنے اندر نہیں پاتے؟'' دادو کی جہاندیدہ نظروں نے پوتی کا احوال تو پالیا تھا مگر پوتے کے معاملے میں وہ بھی تذبذب کا شکار تھے۔ فیروز بخت کی والدہ رشتہ ڈال گئی تھیں مگر ان کا دھیان کومل کے بجھتے ہوئے چہرے پر تھا...... جس طرح اس نے بے قراری سے حسن کی طرف دیکھا تھا، اس کی نگاہوں کا وہ انداز ان کی زیرک نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا تھا۔ بھری محفل میں کسی اور کی طرف کومل کی نگاہ کیوں نہ اٹھی تھی؟ کیوں اس نے کسی اور کی طرف یا جس سے اس کا رشتہ طے ہونے جارہا تھا، اس کو نہ دیکھا تھا...... وہ پہلو بدل کر رہ گئے تھے۔ ان کا ذہن ڈیڑھ سال پیچھے چلا گیا۔ کومل کی زندگی میں، اس کی ذات میں، اس کے وجود میں، اس کی ہر ہر بات میں تبدیلی اس وقت آنا شروع ہوئی جب سے حسن کے ساتھ اس کا وقت گزرنے لگا تھا۔

وہ سرتا پیر بدل گئی تھی، ان کچھ مہینوں میں یا یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس نے خود کو اس ڈیڑھ سال میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے خود کو ہر لحاظ سے پرفیکٹ بنانے کی کوشش جاری رکھی تھی اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہی تھی۔ اس کے چہرے پر قوس وقزح کے رنگ صرف حسن کو دیکھ کر ابھرتے تھے۔ وہ ان کا پوتا کم اور دوست زیادہ تھا۔ اس نے ان سے آج تک کوئی بات نہیں چھپائی تھی۔ وہ پرانے زمانے کے تھے مگر ان کی سوچ پرانی نہیں تھی۔ وہ اپنے زمانے میں

بھی بہت روشن خیال اور خوب صورت ذہن رکھتے تھے۔ معاملات کو کنوئیں میں بند کرنے کے بجائے آزاد فضا میں روشنی میں حل کرنے کے عادی تھے۔ حسن ان کی سب سے بڑی اولاد کا لخت جگر تھا۔

اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ انہیں حسن کی صورت میں گویا جہاں مل گیا تھا۔ وہ حسن سے روبرو بات کر کے معاملہ صاف کرنا چاہتے تھے کہ آیا یہ معاملہ یک طرفہ ہے کہ حسن نے جان بوجھ کر کومل کو کسی غلط فہمی کا شکار کیا ہے اتنے سارے لڑکوں میں انہوں نے حسن کو اگر کومل کی ذمہ داری سونپی تھی تو اس کی ایک بڑی وجہ اس کی شرافت پر اعتبار تھا۔ انہیں یقین تھا کہ حسن کسی قسم کے چھوٹے پن کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔

''دادو...... کومل بچی ہے۔ بالکل کسی پھول کی طرح معصوم۔ میں نے کبھی اس کو بڑا سمجھا ہی نہیں۔ میرے نزدیک تو اس کی شادی بھی ابھی نہیں کرانی چاہیے، مگر بہرحال آپ لوگ بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں۔ فیروز اچھا اور میچور لڑکا ہے وہ کومل کو اپنے سانچے میں ڈھال لے گا۔ ویسے بھی کومل فلکیس ایبل لڑکی ہے۔ اس کی یہ خوبی اسے ہر سانچے میں ڈھلنے میں مدد دیتی ہے۔'' حسن نے کہا۔

''تو فیروز بخت سے بہتر ساتھی تو تم ثابت ہو سکتے ہو حسن، کیا مضائقہ ہے؟ یا پھر تمہارا جیون ساتھی کے لیے معیار بلند ہے۔'' دادو نے ایک کوشش اور کی۔

''نہیں دادو...... یہ بات نہیں، مجھے جس قسم کی لڑکی چاہیے اس میں صرف یہ خوبیاں ہوں گی۔ وفا اور ایمان داری، میری اور کوئی ڈیمانڈ نہیں ہوگی۔'' وہ مسکرایا۔

''تو کومل میں یہ دونوں خوبیاں ہیں۔'' وہ فوراً بولے۔

''جی...... مگر دادو وہ بہت چھوٹی ہے، میرا ذہن اسے بیوی کے روپ میں قبول نہیں کرے گا۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں، قدر کرتا ہوں، جیسی محبت ایک انسان کو دوسرے انسان سے، ایک رشتے دار کو دوسرے سے ہوتی ہے، میں اس سے ویسی محبت بھی کرتا ہوں، مگر جب بھی اسے بیوی کے روپ میں سوچتا ہوں تو ذہن باغی ہونے لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی نہیں مانے گی۔'' حسن نے کہا۔ دادو نے مایوسی سے اس کا روشن چہرہ دیکھا۔ یہاں تو بے نیازی و بے خبری ہے مگر وہ پاگل لڑکی، یک طرفہ محبت کا شکار ہے۔ اکیلے ہی آگ میں ہاتھ جلا بیٹھی۔ کومل کا دکھ اور اس کا حال دل محسوس کر کے دادو کے دل پر بوجھ سا آ پڑا تھا۔

''آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟'' ان کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر حسن پریشان سا آگے بڑھا۔ دادو راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے۔ وہ ان کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''وہ آپ کو بہت عزیز ہے، مجھے معلوم ہے، اگر آپ پھر بھی کہیں گے تو میں اسے قبول کر لوں گا۔ آپ کی خاطر۔'' وہ بولا۔

''نہیں...... بھیک نہیں...... بھیک نہیں۔'' اسٹڈی کے دروازے کے ساتھ لگی کومل کی روح چیخ اٹھی۔

''نہیں حسن...... یہ رشتے زبردستی بندھ جائیں تو ان کے ٹوٹنے کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے۔ یہ بہت نازک بندھن ہوتا ہے بیٹے۔ میں تم سے کیوں خفا ہوں گا بھلا؟ تم نے اس سے کوئی عہد و پیماں تھوڑی کیے ہیں کہ ایفائے وفا کی خاطر تم پر زبردستی تھوپی جائے۔ بس رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں، ثابت ہوا...... انسان کتنے ہی پتھروں سے سر پھوڑے بے سود جاتا ہے۔'' انہوں نے گہری سانس لے کر اس کے گھنیرے بالوں والے سر کو چوما۔

''وہ خوش رہے گی یقین کر لیجیے۔'' حسن کے الفاظ اس کے اندر تک اتر گئے۔ وہ آہستگی سے پلٹ گئی تھی۔ وہ تو اس رشتے کے سلسلے میں دادو سے مدد طلب کرنے آئی تھی۔ وہ دادو سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ یہ رشتہ قبول نہ کریں کیونکہ حسن اور وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں مگر یہ کیا ہو گیا تھا؟ یہاں آئی تو آگہی کا طمانچہ منہ پر پڑا اور حواس کھلے۔ پتا چلا کہ محبت تو صرف وہ کرتی تھی، حسن تو اسے بچہ سمجھتا تھا۔ شادی کر کے گھر تو وہ بسانا چاہتی تھی، حسن کے نزدیک تو ابھی وہ بچی تھی اور بچوں سے شادی نہیں کی جاتی۔

''بچہ...... بچہ...... بچہ۔'' وہ بیڈ پر گر کر سسک اٹھی۔

''تو...... آپ کے دل میں میرے لیے وہ جذبات

واحساسات تھے ہی نہیں حسن رحیم اللہ..... آپ..... آپ مجھے بچہ سمجھ کر اپنا بڑا پن جتاتے رہے اور میں..... میں احمق اس شفقت کو محبت سمجھ بیٹھی۔" وہ خود پر ہنس رہی تھی۔ وہ خود پر رو رہی تھی۔ وہ خود پر ترس کھا رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر اپنی وارڈروب کھولی اور کپڑوں کی تہہ کے نیچے سے چاکلیٹس کا وہی پیکٹ اٹھایا جسے دینے کا وعدہ حسن نے کیا تھا، حسن نے اسے تین ماہ بعد ہی وہ پیکٹس دے دیئے تھے کیونکہ ان تین مہینوں میں اس نے خود کو بدل لیا تھا۔ چاکلٹس کے لیے نہیں، حسن کے لیے، اس کی محبت کی خاطر..... اسے پانے کی چاہ میں۔

"عنایہ..... تم نے مجھے احمق سمجھ کر مجھے حسن کی طرف سے وہ سنہری خواب دکھایا، جس کی کوئی تعبیر نہیں تھی، تم نے مجھے بہکایا اور میں اپنی پسند کو محبت بنا کر اپنا سب کچھ تیاگ بیٹھی۔ جس روز میں نے حسن سے اپنی محبت کو جانا، اسی روز سے میں بڑی ہوگئی تھی۔ حسن، میں اب بچی نہیں رہی، میں اب بچی نہیں رہی، تمہاری محبت نے مجھے دنوں میں صدیوں کا سفر طے کرادیا ہے۔ میں بچی سے بوڑھی ہوگئی ہوں۔" وہ پیکٹ سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔

❁.....❁.....❁

اسے بہت شدید بخار تھا۔ دو دن بے ہوشی میں گزارنے کے بعد تیسرے روز وہ ہوش میں آئی تھی۔ بخار اب خاصا کم تھا۔ ابھی امی اسے دوا کھلا کر کمرے سے باہر نکلی تھیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے چھت کو گھور رہی تھی کہ حسن کی آواز پر چونکی۔ گرین شرٹ اور بلیک جینز میں وہ بہت تازہ دم اور پرکشش لگ رہا تھا۔ کومل نے اپنی جان کے روگ کو دیکھا۔ وہ اس کے نزدیک بیٹھ کر اس کا احوال پوچھ رہا تھا مگر وہ خاموش، چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا کچھ بولو..... تم بولتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ کچھ چاہیے، کھانا ہے کچھ؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔

"حسن....." آج وہ اس سے بھائی لگائے بغیر مخاطب تھی۔ حسن چونکا، اس نے سمجھا کہ شاید اس نے بھائی کا اضافہ سنا نہیں۔

"آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں نے آپ کو بھائی کیوں نہیں کہا؟" وہ اپنے سوکھے لبوں کو جنبش دے رہی تھی۔ حسن کا گمان غلط تھا۔ وہ یک دم سنجیدہ ہوا۔

"مجھے اس لفظ سے منافقت کی بو آتی ہے، جب میں آپ کے نام کے ساتھ اس کا استعمال کرتی ہوں۔" وہ ہولے سے بولی۔ حسن کے اعصاب کو شدید جھٹکا لگا۔ اس نے کومل کو دیکھا۔ پھول سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ گلابی چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ انسان کی زندگی میں ایسا بھی وقت آتا ہے، جب حیرت کے جھٹکے سے اس کے اعصاب پتھرا جاتے ہیں۔ حسن اسی لمحے کی زد میں تھا۔

"یہ بوجھ لے کر میں کسی کی زندگی میں داخل نہیں ہوسکتی حسن۔ اس بوجھ کو آپ کے کندھوں پر ڈال رہی ہوں۔" وہ ہولے سے بولی۔ دو موتی اس کی خشک آنکھوں سے لڑھکے۔

"مجھے آپ کو بتانا ہے کہ عنایہ کی غلط نشاندہی نے مجھے بہت پہلے ہی بچی سے بڑا بنا دیا تھا۔ مجھے آپ کو صرف یہ بتانا ہے کہ..... میں..... اب بڑی ہوگئی ہوں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ حسن ششدر سا بیٹھا رہ گیا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے، بزنس کی دنیا میں بڑے بڑوں کو چپ کرا دینے والا حسن رحیم اللہ آج اس پل ایک معصوم بچی کے سامنے گنگ ہوگیا تھا پھر اچانک ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیریں۔ کومل کا رونا بند نہیں ہوا، حسن کے ہاتھ کے لمس نے اسے بالکل بے اختیار کردیا تھا۔

"کیا ضرورت تھی ایسی بیوقوفی کرنے کی؟ کیوں اپنے لیے دکھوں کو خرید لیا؟" اس نے دکھ سے کہا۔

"جانتے بوجھتے کون سودے بازی کرتا ہے دکھوں کی۔" وہ برجستہ بولی۔ حسن لاجواب سا ہوگیا۔

"خود کو سنبھالنا ہوگا۔ تم اب کسی اور کی زندگی میں داخل ہونے جارہی ہو۔ کوئی بیوقوفی مت کرنا۔" حسن نے اپنے لہجے کو ذرا سا سخت بنایا۔ بند ٹوٹا ہوا تھا، پانی کا زور روکنا ضروری تھا۔

"مجھے اب کسی ٹیوشن کی ضرورت نہیں، اب تو سب جان

لیا ہے ناں۔‘‘اس نے التجا کی۔ حسن اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔
’’پاگل مت بنو۔ رشتہ پکا ہو چکا ہے۔ نکاح کی تاریخ رکھی جاچکی ہے۔ اپنا اور میرا تماشا مت بنواؤ آئندہ ایسی بات سوچنا بھی مت۔‘‘ اس نے غصہ کیا۔
’’سب جان کر آنکھیں بند کررہے ہیں...... رحم نہیں آتا مجھ پر؟‘‘ اس نے بھیگی پلکوں سے دشمن جاں کو دیکھا۔
’’اس مہینے کی ستائیس تاریخ کو تمہارا نکاح ہو رہا ہے فیروز بخت کے ساتھ۔ میں دادو سے کہوں گا کہ شادی کی تاریخ جلد رکھیں، اب بہت ضروری ہے کہ تم فیروز بخت کی دلہن بن کر اس کے گھر جلد از جلد جاؤ۔‘‘ وہ سخت ناراض تھا یا ظاہر کررہا تھا۔
’’اتنا سنگ دل تو جلاد بھی نہیں ہوتا۔‘‘ وہ تڑپی، اپنی انا، اپنی نسوانیت کو یک طرف رکھ کر اس نے دل کی مانی تھی مگر کیا فائدہ؟ دل تو اس ظالم کے پیروں میں رل رہا تھا۔ وہ اسے شادی اور گھر بسانے کے مشورے دے رہا تھا۔ اس سے زیادہ توہین اس کے بس سے باہر تھی۔
’’جب شادی ہوجائے گی تب اپنی اس بیوقوفی کو بھلاؤ گی۔ ابھی تم میچور نہیں ہو۔ محبت تو امیچور لوگوں کا کام ہے۔ تم وقتی سی ایک کیفیت کو محبت سمجھ بیٹھی ہو۔‘‘ وہ بے دردی سے کہہ رہا تھا اور اس کے انمول جذبوں کی توہین کررہا تھا۔
’’تم جلد از جلد خود کو سمجھالو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔‘‘ حسن چلا گیا اور اپنی محبت کی توہین پر اس کا دل خون کے آنسو رورہا تھا۔

❁......❁......❁

اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ بات بات پر جھنجلا رہا تھا۔ تائی جان نے رات کے کھانے کا پوچھا تو صاف منع کر دیا کہ موڈ نہیں ہے۔ جب بھوک لگے گی تو کھالوں گا۔ بس فون سے چپکا ہوا تھا۔ رات گہری ہوگئی تھی۔ وہ ٹہل ٹہل کر تھک گیا تھا۔ اس نے لیپ ٹاپ اٹھایا اور کچھ ای میل کرنے لگا پھر میل سینڈ کر کے خود کمرے سے باہر نکل کر چھت پر چلا آیا۔ رات کے سناٹے میں ان کے دل کی دھڑکنوں اور کلائی پر بندھی گھڑی کی ٹک ٹک کا شور تھا۔ چھت پر موجود پھولوں کی مہک نے اس کی سانسوں کو معطر کیا، اس نے سر اٹھا کر نیلے آسمان کو دیکھا۔ سیاہ ستاروں بھرا آنچل اوڑھے رات اپنے سفر میں مگن تھی۔ حسن منہ پر بازو رکھ کر آگے کی طرف جھک کر کھڑا تھا۔ دادو کے انداز و گفتگو بمعہ معنی و مطلب اس کی سمجھ میں آرہے تھے۔
’’تو کیا کومل نے دادو سے کچھ کہا ہے یا پھر دادو از خود سمجھ گئے تھے؟‘‘ وہ سوچ رہا تھا۔ ’’دونوں صورتوں میں دادو پر میرا امپریشن کتنا غلط پڑا ہوگا۔‘‘ وہ اندر ہی اندر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ اس بیوقوف لڑکی نے یہ کیا کیا، وہ گہری سانس لے کر مزید آگے جھکا تو اسے لان میں لگی لائٹ کی مدھم روشنی میں عنایہ نظر آئی۔ وہ فون پر کسی سے بات کررہی تھی۔ اتنا زیادہ فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس کی آواز تو وہ سن نہیں سکتا تھا مگر اتنی رات کو وہ کس سے بات کررہی تھی، اس سوال کے بجائے اس کے ذہن میں کومل کی کہی بات نے جھما کا کیا۔
’’مجھے آپ کو بتانا ہے کہ عنایہ کی غلط نشاندہی نے مجھے بہت پہلے ہی تجی سے بڑا بنادیا تھا۔‘‘ وہ بری طرح چونکا۔ اس وقت تو شدید جھٹکے اور دکھ نے اس کی توجہ کومل کے اس جملے کی طرف نہیں دلائی تھی مگر اس لمحہ وہ ٹھنڈے دماغ کے ساتھ اس کی بات پر غور کرنے لگا تو اس کا مطلب ہے کہ عنایہ نے کومل سے کچھ غلط بیانی کی مگر کیوں؟ وہ اس سوال کا جواب لینے سیدھا عنایہ کے پاس نیچے پہنچ گیا۔ اس کا اس وقت عنایہ سے بات کرنا اس کے ذہنی خلفشار کا ثبوت تھا۔ وہ ایک پل بھی انتظار نہیں کرسکا تھا۔
’’کس سے بات کررہی ہو اس وقت؟‘‘ وہ اس کے سر پر پہنچا۔
’’وہ...... آپ...... سوئے نہیں۔‘‘ عنایہ کی پشت اس کی طرف تھی۔ حسن کی آواز پر اچھل پڑی۔
’’یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔‘‘ وہ سنجیدگی سے بولا۔
’’میری فرینڈ ہے۔‘‘ اس نے فون بند کرتے ہوئے جواب دیا۔
’’اس وقت تم اپنی فرینڈ سے کیا باتیں کررہی ہو؟‘‘ حسن

نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ میری جاسوسی کررہے ہیں؟ باتیں کرنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔'' وہ بدمزگی سے بولی، اسی پل فون سیل دوبارہ بجا۔ حسن چونکہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا لہٰذا اس کی نظر سیل اسکرین پر چمکتے نمبروں پر پڑی، مگر اس سے پہلے کہ وہ پورے نمبر پڑھ یا دیکھ پاتا عنایہ نے فون ریسیو کرلیا۔

''ہاں...... وہ میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ کوئی نہیں...... میرے کزن ہیں، حسن بھائی، اوکے۔'' اس نے فون بند کردیا۔

''آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ میری جاسوسی کیوں کرتے پھر رہے ہیں؟'' اب وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''عنایہ...... مجھے تمہاری جاسوسی کرنے کا شوق نہیں مگر تم مجھے یہ بتاؤ کہ کومل سے تم نے میرے بارے میں کیا الٹا سیدھا بولا تھا؟'' وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''میں نے کیا کہنا ہے...... مطلب کیا ہے آپ کا؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھو عنایہ...... میرے ضبط کا امتحان مت لو۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے کومل سے کیوں غلط بیانی کی اور کیا کہا؟'' وہ تپ گیا۔ بات اس کے کردار پر آ گئی تھی۔

''حسن بھائی...... مجھے کچھ نہیں پتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اور میں نے کومل سے آپ کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ میرا مطلب ہے کوئی غلط بات...... باقی ایز اے کزن ہمارے درمیان عام باتیں ہوتی رہی ہیں، جیسے کہ عام طور پر لوگ ایک دوسرے کو ڈسکس کرتے ہیں۔ البتہ کومل کا رجحان آپ کی طرف تھا تو میں نے صرف اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ آپ کے بارے میں اس انداز سے نہ سوچے کیونکہ آپ اسے چھوٹی بہن سمجھتے ہیں۔ بس اسی بات کو لے کر اس نے مجھ سے بھی منہ ماری کی تھی لیکن اس نے آپ سے کیا کہا؟'' عنایہ نے بہت سنبھل کر تواتر سے جھوٹ بولا۔ حسن کا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے الجھی ہوئی نظروں سے عنایہ کو دیکھا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ پلٹا اور عنایہ زیرلب مسکراتی ہوئی نمبر پھر سے ڈائل کرنے لگی۔

''جی فیروز بھائی...... حسن بھائی تھے، جی اس وقت تو وہ اور کومل یہیں لان میں ہوتے ہیں۔ روٹین ہے ان کی یہ۔ گھر والے سب سو رہے ہیں، میں نے اپنا اسائنمنٹ بنانا تھا اس لیے جاگ رہی ہوں۔ ابھی تو وہ دونوں اٹھ کر اندر چلے گئے ہیں۔ آپ کہیں تو بات کروا دوں۔ نہیں...... اچھا چلیں ٹھیک ہے، آنٹی کو سلام دیجیے گا۔ اللہ حافظ۔'' اس نے فون بند کردیا اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔

❁......❁......❁

جس نے سنا وہ دنگ رہ گیا۔

''مگر کیوں؟''

''اتنا اچانک؟''

''وجہ کیا ہے آخر؟''

''ننھی کی شادی تک تو رک جاتا۔'' جس نے سنا اپنے تئیں حیرت کا اظہار کیا۔ حسن نے یہ فیصلہ راتوں رات کیا تھا۔

''میرا جانا بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔'' اس نے دو دنوں کے بعد کا اپنا ٹکٹ کرالیا تھا۔ سب ہی حیران تھے مگر کومل اور دادو حیران نہیں تھے۔ دکھی تھے، حسن نے جانے سے پہلے دادو کو ساری سچائی بتادی تھی۔

''اس طرح فرار سے معاملات سلجھیں گے نہیں، معاملات کے سلجھاؤ کے لیے بہادری سے ان کا سامنا کرنا چاہیے، تم بھاگ رہے ہو بزدلوں کی طرح۔'' دادو نے تاسف سے کہا۔

''نہیں...... میں سامنے رہا تو وہ مجھے بھول نہیں پائے گی، اسے اپنی زندگی کی شروعات نئے سرے سے کرنی چاہیے، میری موجودگی اسے نئی زندگی شروع کرنے سے روکے گی۔ اسے وقت چاہیے دادو، میری ذات نے اسے انجانے میں دکھ پہنچایا ہے۔ مجھ سے جو ہوسکا میں کررہا ہوں مداوے کے لیے، مجھے مت روکیں۔ اس وقت میرا چلے جانا بہتر ہے۔'' حسن نے جانے سے پہلے آخری بات ان سے کی پھر وہ کومل

کے پاس آیا تھا۔
"حرف آخر کچھ بھی نہیں ہوتا، تم اپنی یادداشت سے میرا ہر نشان مٹا کر نئی خوشیوں کا اخلاص کے ساتھ خیر مقدم کرنا، کچی مٹی پر گھروندے بناؤ گی تو بارش کا ایک چھینٹا اسے توڑ دے گا۔ اپنی زندگی کو مضبوط بناؤ، میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔" اس نے کومل کو دیکھا۔ کومل نے اسے تڑپ کر دیکھا، وہ جا رہا تھا اور وہ اتنی بے بس تھی کہ زندگی کو روک نہیں سکتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی...... اسے بہت کچھ، اسے روکنا چاہتی تھی مگر...... وہ کچھ نہ کر سکی۔ حسن دور دیس بادلوں میں اڑان بھر چکا تھا اور وہ چند مہینوں کے اندر اندر پیا دیس سدھار گئی تھی۔ اپنے نام کے ساتھ حسن کے بجائے کسی اور کے نام کو لگا دیکھ کر اس کا دل یوں تڑپا تھا جیسے رقص بسمل اور پھر بس اس کا دل خاموش ہو گیا تھا۔

❁......❁......❁

اس کی شادی کے اتنی جلد ہو جانے کی وجہ دادو تھے۔ حسن نے جانے سے پہلے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کومل کی شادی جلد از جلد کرائیں گے، انہیں خود بھی یہ بات مناسب لگی تھی۔ کومل جتنی جلدی اپنی ازدواجی زندگی کی شروعات کرلے اس کے لیے اتنا بہتر ہے۔
چاند منزل کی کومل راحیل، کومل فیروز بن کر بخت ولا آ گئی تھی۔ فیروز بخت کے کمرے میں لاتے ہوئے فیروز بخت کی اموجان کہہ رہی تھیں۔
"کتنا ارمان تھا مجھے فیروز کی دلہن لانے کا، اللہ نے میری سنی ہے کہ میری آنکھیں بند ہونے سے پہلے میرے فیروز کی زندگی میں رونق کر دی۔ تم فیروز کی پسند ہو کومل۔ میری بہو نہیں بیٹی ہو۔ اس گھر کی مالکن ہو، سیاہ و سفید کی مالکن ہو، بس مجھے تم سے صرف ایک چیز چاہیے۔" وہ اس کا گداز دودھیا ہاتھ اپنے نرم ضعیف ہاتھوں میں لے کر کہہ رہی تھیں۔ اس نے اپنی مسکارے سے بوجھل لانبی پلکوں کی جھالر اٹھا کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔
"تم میرے فیروز سے بہت محبت کرنا، اس کا بہت خیال رکھنا۔ اسے کبھی مت چھوڑنا۔" انہوں نے کہا۔
"محبت...... محبت کروں۔" اس نے درد کی شدت سے آنکھیں موند لیں۔ بیگم بخت اس ادا کو اس کی حیاء سمجھیں۔
"وعدہ کرو کومل۔" وہ اس سے عہد لے رہی تھیں۔
"سو...... تو آپ نے تو مجھے ٹھکرا دیا...... مسٹر حسن مگر میں بھی اب آپ کو ثابت کر کے بتاؤں گی کہ میں کوئی راستے میں پڑا ہوا پتھر نہیں ہوں، جسے پیر کی ٹھوکر سے کنارے پر لگا دیا جائے...... اب میں آپ کو ویسی ہی بن کر دکھاؤں گی جیسی آپ نے تقریر جھاڑ کر مجھے بننے پر مجبور کیا ہے۔ میں اس پل...... اس لمحے آپ کی محبت آپ کو لوٹا رہی ہوں، اب میں فیروز بخت سے محبت کروں گی جو کہ میرا شوہر ہے۔ اصل محبت...... سچی محبت...... میں اب آپ کو کبھی یاد نہیں کروں گی۔ اگر کبھی آپ یاد آئے تو میں خود کو سزا دوں گی اور کبھی سامنے آئے تو سنگ میل کی طرح نظر ڈال کر سائیڈ سے نکل جاؤں گی۔ کسی نے خود کو کیا اور کتنا گرایا ہوگا محبت میں جتنا میں نے گرا دیا تھا۔ بھیک مانگی تھی آپ سے مگر جو خود خالی ہو وہ دوسرے کا کشکول کیا بھرے گا؟" وہ دکھ اور تکلیف سے سوچ کر رہ گئی۔
"کیا سوچ رہی ہو؟" بیگم بخت کی آواز پر وہ چونکی۔
"جی...... میں وعدہ کرتی ہوں، فیروز کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" وہ مسکرائی اور اس پل اسے احساس ہوا کہ مسکرانا کس قدر مشکل و مشقت والا کام بھی ہو سکتا ہے۔
"جیتی رہو۔" وہ ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے اسے سجے سجائے کمرے میں لے آئی تھیں۔ فیروز کی رشتے کی کزنز اور دوستوں کی بیویاں پہلے سے کمرے میں موجود تھیں، روایتی چھیڑ چھاڑ اور شوخ جملوں کی کہکشاں سے کمرہ جگمگا رہا تھا۔ حجلہ عروسی بھی روایتی انداز میں سجی ہوئی تھی۔
"دلہا میاں تو پھول سجانے ہی نہیں دے رہے تھے، ہم سمجھ گئے کہ جو گلاب ان کے کمرے اور زندگی کو مہکانے آ رہا ہے، انہیں اسی کی مہک چاہیے، اسی لیے ہم سب نے ٹیوپس سجا دیئے۔ پسند آئے آپ کو؟" فیروز کی ایک شوخ و شنگ شادی شدہ کزن نے بیگم بخت کے کمرے سے نکلتے ہی کہا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ اتنی ساری شوخ و شنگ لڑکیوں کے

درمیان وہ کم عمر اور گھبرائی ہوئی سی خاصی حیا محسوس کررہی تھی۔ یہاں تو ساری خواتین ہی شادی شدہ تھیں۔ اس نے چھ، سات بجی بنی گڑیوں جیسی لڑکیوں کو دیکھا۔ سب اپنا اپنا تعارف کرارہی تھیں۔

''فیروز بھائی تو کسی کے لیے ہامی ہی نہیں بھرتے تھے، امی تین سال سے لگاتار ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی تھیں۔ پھر قرعہ تمہارے نام کی نکلی۔ اتنی کم عمر اور معصوم سی ہو مگر ہو بہت کیوٹ...... چلو دیر آید درست آید۔'' فیروز کی ایک ننھیالی کزن نے کہا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی سر جھکائے سن رہی تھی۔ کم سن، معصوم، بچی، اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے، اعصاب ایک بار پھر چٹخنے لگے تھے۔ اس نے بختی سے حسن کے تصور کو جھٹکا۔ اسی ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں فیروز کو کمرے میں بھاری نیگ کی ادائیگی کے بعد چھوڑا گیا، کومل نے اپنے دل کو بری طرح تھام لیا تھا۔

''نہیں، اب اور نہیں...... بس...... اے دل ناداں...... بس اب بہت ہو چکا۔ تیری مان کر نری ذلت وخواری مول لی...... اب بس......'' اس نے بری طرح دل کو جھاڑا، قدموں کی چاپ پر بھی اس نے سر نہ اٹھایا۔

''کیا ہماری دلہن ہمیں ایک نگاہ دیکھنے کی روادار بھی نہیں۔'' فیروز کی بھاری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے سر اور زیادہ جھکا لیا تھا۔

''کومل......'' اس نے اسے پکارا۔ ''میری طرف دیکھیے۔'' وہ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ کچھ تو تھا اس کے لہجے میں غیر معمولی جو اسے چونکا گیا۔ اس نے بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ تھری پیس بلیک سوٹ میں گلے میں صرف ایک گلابوں کا ہار ڈالے وہ اپنی پوری شان ووجاہت سے اس کے سامنے سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ بلاشبہ وہ حسن سے کئی گنا زیادہ وجیہہ وپرکشش تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد، کسرتی جسم، بے حد چمکدار روشن آنکھیں اور تیکھے نقوش اس کے چہرے پر سب سے زیادہ قابل توجہ شے اس کی آنکھیں تھیں۔ اسے یاد آیا کہ حسن کے چہرے پر بھی سب سے زیادہ نمایاں اس کی آنکھیں تھیں۔ فیروز کی آنکھیں سنہری چمکتی کانچ جیسی تھیں جبکہ حسن کی آنکھیں گہری سیاہ جھیل سی تھیں۔ اف خدایا...... اس نے نہایت بے دردی سے حسن کے تصور کو نوچ کر ہٹایا اور آنکھیں جھکا لیں۔

''کومل...... یہ سچ ہے کہ میں نے پہلی ملاقات میں آپ کو پسند کرلیا تھا، میری پسند کا معیار دوسروں سے ہٹ کر ہے۔'' فیروز بخت آہستہ آہستہ کہتے ہوئے گلابوں کا ہار اتار کر بیڈ پر پھینک رہا تھا، اس کا دل دھڑکا۔

''مجھے لگا کہ آپ بہت انوسینٹ ہیں، صاف دل اور بے ریا ہیں۔ بالکل کسی شفاف پانی کی جھیل جیسی۔'' اس نے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ ''پھر آپ کی کزن صوفیہ کی شادی پر آپ سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ آپ زندگی کے باقی معاملات میں بھی اچھی خاصی ہیں۔ فیئر ہیں، مجھے آپ کی سادگی بھائی تھی۔ اس کی وجہ سے میں آپ کی سمت متوجہ ہوا تھا۔ ورنہ حسن تو ہمارے خاندان اور ملنے جلنے والوں میں بے تحاشا ہے مگر حسن ظاہر کبھی بھی میرا معیار، میری ترجیح نہیں رہا۔'' اس نے کوٹ اتار کر کرسی پر پھینکا اور وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''میں نے امو جان سے کہہ دیا تھا کہ مجھے آپ کو ہی اپنی زندگی میں شامل کرنا ہے۔'' وہ کچھ دیر رکا اور گفتگو کو گہری سانس لے کر پھر جوڑا۔ وہ ہمہ تن گوش تھی۔ فیروز بخت کے انداز میں کچھ الگ تھا، جس نے اسے چونکا دیا تھا۔ عورت ذات کی چھٹی حس بے حد تیز ہوتی ہے۔ اللہ نے اسے یہ خاص تحفہ نوازا ہے اور اسی حس نے کومل کو بھی چونکایا تھا۔ پہلی رات کے دلہا کے لہجے میں ''دلہاپے'' والی کوئی بات کوئی انداز نہ تھا۔ تجربہ نہ سہی مگر خاندان کی شادیوں نے تجزیہ تو دیا تھا۔ اس نے نہایت آہستگی سے گھونٹ کی آڑ سے اسے دیکھا۔ وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے، ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ حیران اور الجھ رہی تھی کہ آخر بات کیا ہے؟

''امو اس رشتے پر خوش تھیں۔ انہیں بھی آپ پہلی ملاقات میں ہی اچھی لگی تھیں مگر امو نے مجھ سے کہا تھا کہ کومل کم عمر ہے، کیا تم اپنے اور اس کے درمیان کے اس فرق کو کور

کرپاؤ گے؟ کیونکہ کومل صرف طبعی طور پر نہیں ذہنی طور پر بھی معصوم ہے۔ تب میں نے سوچا تھا کہ میں محبت سے آپ کو اپنے رنگ میں رنگ لوں گا۔ کچھ آپ کے رنگوں سے خود کو رنگین کرلوں گا۔" اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا تو کومل نے جلدی سے نظریں جھکائیں۔

"میں اس رشتے سے بہت خوش تھا۔"

"تھا...... سے کیا مراد ہے؟" وہ مزید صبر نہ کرسکی اور بے ساختہ پوچھا۔

"نکاح سے کچھ دن پہلے آپ کی کزن میرے گھر آئی تھیں۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

"کون؟" وہ حیران سی ہوکر پوچھنے لگی۔

"عنایہ۔" فیروز نے اس کا نام لے کر مزید اسے حیران کیا۔

"کیوں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"مجھے یہ بتانے کے لیے کہ میں اس رشتے سے انکار کردوں، کیونکہ آپ کسی اور میں انوالو ہیں۔" فیروز بخت نے سنجیدگی سے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

"کیا......؟" اس کے لب نیم وا ہوئے اور آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

"کومل...... میں نے اپنی زندگی میں جو معاملات بھی کیے وہ بہت فیئر رہے ہیں۔ مجھے دو چیزوں سے نفرت ہے، جھوٹ اور دھوکہ، ہر غلطی معاف کرسکتا ہوں میں، ہر قسم کا سچ سننے کی طاقت ہے مجھ میں مگر یہ دو غلطیاں معاف نہیں کرسکتا...... میں نے آپ سے فون پر کئی بار بات کرنی چاہی، کئی بار ملاقات کرنے کا سوچا مگر موقع نہیں مل سکا۔ گھر پر جب بھی فون کرتا تو آپ کے علاوہ کوئی نہ کوئی اٹھالیتا، یہ دن مجھ پر بہت بھاری گزرے تھے۔ مجھے صرف سچ سننا ہے۔ صرف سچ۔ کیا آپ اور حسن ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے تھے؟ کیا آپ دونوں میں کمٹمنٹ تھی؟ صرف ہاں یا نہیں میں جواب چاہیے مجھے...... کوئی تفصیل نہیں، کوئی ایکسکیوز نہیں۔ صرف ٹو دی پوائنٹ آنسر۔" وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور اپنی انگلی اسے اس کی تھوڑی کو اٹھا کر پوچھا۔ وہ اپنی شفاف آنکھوں سے اس کی نم آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کاش، آپ مجھ سے یہ پوچھ لیتے کہ کیا تم حسن سے محبت کرتی تھیں؟ کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتی تھیں؟ تو میرے لیے جواب دینا مزید آسان ہوجاتا...... کہ جھوٹ تو مجھ پر بھی بارگراں ہے۔" اس نے سوچا اور آزردگی سے پلکیں جھپکیں۔

"نہیں۔" اس کے لبوں سے پورے اعتماد سے نکلا۔ اعتماد اور یقین تو حسن نے اسے اس روز تفصیلی انکار سمیت عطا کر ہی دیا تھا۔ اسی کے بخشے ہوئے اعتماد نے کہ وہ نہ اس سے محبت کرتا ہے اور نہ ہی شادی کرسکتا ہے، اسے جواب دینے میں آسانی بخشی تھی۔

"تھینکس گاڈ۔" بے ساختہ فیروز کے منہ سے نکلا اور ایک گہری سانس لے کر اس نے کومل کو اپنے سینے سے لگالیا۔

"آپ نے میرے دل اور دماغ سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹادیا، شکر ہے اللہ کا مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ عنایہ نے غلط بیانی کیوں کی؟" اس نے کچھ سوچ کر پوچھا، اس نے کومل سے یہ نہیں کہا تھا کہ عنایہ شادی سے پہلے تین چار مرتبہ اسے مختلف اوقات میں فون کرکے حسن اور کومل کے بارے میں غلط قسم کے بیانات دے کر اپنی طرف سے متنفر کرنے کی کوشش کرچکی ہے۔

"شاید اسے غلط فہمی ہوگئی ہو۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔ فیروز نے اس کے آہستہ آہستہ کپکپاتے ہوئے وجود کو اپنی مضبوط بانہوں میں مزید کس لیا۔

"میرے ماں باپ نے تمام زندگی ایک دوسرے کے ساتھ وفا نبھائی، پاپا کے چلے جانے کے بعد بھی امو نے پاپا سے بے وفائی نہیں کی۔ پاپا بہت ہی عام شکل وصورت کے انسان تھے۔ ان کا جسم بھی فربہ تھا اور رنگت بھی ڈارک تھی جبکہ امو کو تو آپ نے دیکھا ہی ہے، پاپا کی ڈیتھ سے پہلے اگر دیکھتیں تو نظر نہ ہٹا پاتیں۔ وہ اس قدر حسین تھیں پھر ان کی ڈریسنگ وغیرہ غضب کی تھی۔ غضب کی اسمارٹ تھیں مگر پاپا سے محبت اور وفا کا یہ عالم تھا کہ ایک دن ان کے بغیر نہیں رہ

سکتی تھیں۔ امو کی یہ حالت پاپا کے جانے کے بعد ہوئی تھی۔ انہیں روگ لگ گیا کومل، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں نے وراثت میں وفا اور اخلاص پایا ہے۔ میں اپنی نسل میں بھی یہی خوبیاں منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری خوب صورتی نہیں خوب سیرتی چاہیے۔ تم بھلے موٹی ہو جاؤ مگر مجھے تمہاری وفا اور اخلاص چاہیے۔ شادی کی صورت میں مجھے ایک باوفا اور خلوص بھری زندگی چاہیے۔ تم میری زندگی بن جاؤ کومل۔'' وہ اپنی گمبھیر آواز سے اپنی محبت امرت اس کے کانوں میں گھول رہا تھا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں فیروز...... میری وفائیں صرف اور صرف آپ کے لیے ہوں گی۔'' اس نے آنکھیں موندتے ہوئے وعدہ کیا۔

''ویسے ایک بات اور ہے......'' فیروز نے اسے شانوں سے پکڑ کر پرے ہٹایا۔

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ڈائیٹنگ کا ارادہ آگے بھی ہوگا یا نہیں؟'' وہ شرارت سے بولا۔

''آپ کو کس نے بتایا؟'' وہ حیران ہوئی۔

''امام نے، اس نے بڑی تفصیل سے ڈائٹنگ کا سفرنامہ سنایا ہے۔'' اس نے چھیڑا۔ اسے امام پر سخت غصہ آیا۔ (پیٹ کا ہلکا) اس نے سوچا۔

''بھئی...... تم کھل کر کھاؤ پیو، چاکلیٹس، آئس کریم جو چاہے کھاؤ، بس مجھے تمہارے لبوں کی مسکراہٹ ویسی ہی چاہیے، جیسی پہلی بار دیکھی تھی۔ تم مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔'' اس نے پل کے پل آپ سے تم تک کا فاصلہ طے کر کے اجنبیت کی ہر دیوار گرا دی تھی۔ کومل کو پھر سے کچھ یاد آیا مگر اس نے سر جھٹک دیا۔

''کچھ وقت تو لگے گا خود کو سنبھالنے میں۔'' اس نے سوچا اور فیروز کے سینے میں اپنا چہرہ چھپالیا۔ فیروز نے اس کی اس ادا کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہن کے کینوس پر اتار لیا تھا۔

❁......❁......❁

سنہری رنگ کا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کتنی ہی دیر سے وہ یہ کارڈ تھامے اس پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ اگر جمائمہ اسے متوجہ نہ کرتی تو پتا نہیں مزید کتنی دیر وہ ایسے ہی بیٹھا رہتا۔

''کیا ہے یہ؟ اتنی دیر سے تم اسے ہی دیکھ رہے ہو؟'' اس نے کافی کا مگ اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کومل کی شادی کا کارڈ ہے۔'' اس نے کارڈ میز پر رکھا اور مگ اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔

''گرم ہے، خیال سے۔'' جمائمہ نے دھیان دلایا مگر جب تک وہ مگ لبوں سے لگا چکا تھا۔ بھاپ اڑاتی کافی نے لبوں کو جلایا، ہلکی سی سسکاری اس کے منہ سے نکلی۔

''خدایا...... تمہیں عادت نہیں ہے گرم کھانے پینے کی، منہ جلایا ناں۔'' وہ تشویش سے اس کے نچلے ہونٹ کو دیکھنے لگی پھر اس نے اپنا پرس کھول کر اس میں سے آئل بام نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔

''جلدی سے لگالو ورنہ چھالہ بن جائے گا۔'' حسن نے خاموشی سے بام اس کے ہاتھ سے لے کر ڈھکن کھولا۔

''اب تک تو شادی ہو بھی چکی ہوگی۔ ایک ہفتہ پرانی تاریخ ہے۔'' چونکہ کارڈ انگریزی میں لکھا ہوا تھا لہٰذا وہ آسانی سے پڑھ پارہی تھی۔

''ہاں۔'' حسن نے شہادت کی انگلی کی پور پر لگا آئل نچلے ہونٹ پر لگایا۔

''تم ڈسٹرب ہو؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔'' اس نے حسن کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''میں ڈسٹرب نہیں ہوں۔ بس اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنی بے فکر زندگی سے نکل کر وہ بہت بڑی ذمہ داری والی زندگی کی حدود میں داخل ہوگئی ہے، کیا نبھا پائے گی وہ اس ذمہ داری کو؟'' وہ آہستگی سے بولا۔

''تھینکس۔''

''یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ وہ اکیس بائیس سالہ لڑکی ہے، لڑکی ذات تو پیدائشی ذمہ دار اور حساس ہوتی ہے۔ انہیں ٹریننگ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وقت خود ہی سب کچھ سکھا اور پڑھا دیتا ہے۔'' جمائمہ نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ محبت

جار سے کلکیز نکالتے ہوئے وہیں آ کر بیٹھ گیا۔ کافی اب تقریباً ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

"ویسے کومل بہت حسین لگ رہی ہے۔ فیروز بخت کے ساتھ پرفیکٹ میچ ہے۔ دیکھو جمائمہ اور کہیں سے بھی بچی نہیں لگ رہی۔" محبّ نے کومل کی شادی کی تصویریں دیکھتے ہوئے لیپ ٹاپ جمائمہ کے سامنے کیا۔ سنہری اور میرون کنٹراسٹ میں دلہن بنی کومل امام کی کسی بات پر اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ حسن کی بے چین نگاہیں اسکرین کی طرف اٹھیں۔ کومل سے ہوتی ہوئی اس کے پہلو میں ہنستے ہوئے فیروز بخت پر پڑیں اور پھر جھک گئیں۔

"تم اس کو پسند کرتے ہوناں حسن۔"

"شٹ اپ محبّ......" وہ جھلایا۔

"میرے چپ ہونے سے کیا ہوگا؟" وہ غصے سے بولا۔

"محبّ پلیز......اب ماضی کو دہرانے کا فائدہ؟" جمائمہ نے دھیرے سے کہا۔

"میرا دل جلتا ہے اس کو دیکھ کر۔ کہنے کو دوست ہے میرا مگر اللہ گواہ ہے کہ سگے بھائیوں سے بڑھ کر محبت کرتا ہوں اس سے۔ اس کی طرح کون بیوقوف ہوگا جو اپنے ہی ہاتھوں اپنی خوشیوں کو آگ لگائے، محض اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے، اس احمق نے عمر بھر کا روگ خرید لیا۔ خود بھی دکھی ہوگیا اور اس پاگل سی لڑکی کو بھی ویران کرآیا۔ دیکھو ذرا اس کی آنکھوں کی طرف، دلہن بنی ہے مگر آنکھیں کتنی خالی ہیں۔" وہ گویا پھٹ پڑا۔

"مجھے اس سے کوئی محبت نہیں تھی، سمجھے، وہ میری کزن ہے اور بس۔" حسن نے جھلا کر مگ میز پر پٹخا اور کرسی گھسیٹ کر باہر نکل گیا۔

"تم کیوں اس کے زخم کریدتے ہو؟ وہ پہلے ہی دکھی اور ڈسٹرب ہے۔" جمائمہ نے خفگی سے کہا۔

"یہ دکھ اس نے خود خریدے ہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اندر ہی اندر گھٹنے کے بجائے وہ ایک بار کھل کر اعتراف کرلے۔ چاہے خود سے ہی سہی، اس طرح وہ کم از کم پرسکون تو ہوجائے گا۔" محبّ نے کہا۔

"محبّ ہوسکتا ہے وہ ٹھیک کہہ رہا ہو۔ ہم غلط ہوسکتے ہیں۔" جمائمہ کو خیال آیا۔

"وہ پاکستان تین سال رہا ہے، ان تین سالوں میں اس کی ہر میل، ہر فون، ہر میسٹر میں سب سے زیادہ ذکر کومل کا ہوتا تھا۔ کومل نے یہ کیا، کومل نے وہ کیا، وہ یہ کررہی ہے، گھر کی اور کسی لڑکی اور کسی فرد کا وہ تذکرہ نہیں کرتا پھر اس کے اعتراف کرنے پر یہ پاگلوں کی طرح اٹھ کر کیوں بھاگا آیا یہاں؟ واپس آنے کے بعد اس کی وہ ہنسی، وہ شوخی کہاں چلی گئی۔ کیوں اس کی شگفتگی غائب ہوگئی، کتنی کتنی دیر کومل کی تصویر دیکھتا رہتا ہے، میں یا کوئی جائے تو اس کی تصویر ہٹا دیتا ہے اور یہ شو کرتا ہے کہ بہت ضروری کام کررہا ہے۔ تم حسن کو اتنا نہیں جانتیں، جتنا میں جانتا ہوں، گیارہ سالوں کا ساتھ ہے ہمارا، اسے اس لڑکی سے عشق ہے مگر خود سے کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ دوسرے اس کے بارے میں غلط تاثر قائم کرلیں گے کہ اپنی ہی کزن سے افیئر کررہا ہے۔ دنیا کی پروا میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کسی اور کے حوالے کردی۔ خود بھی دکھوں کا سودا کیا اس کے لیے بھی دکھوں کا سامان کردیا۔ کیا وہ وہاں اور یہ یہاں خوش رہ پائے گا؟" محبّ اس کا سچا دوست تھا، جب ہی اس کے غم پر خود بھی رو رہا تھا۔

"ندا بھی آئی ہوئی ہے، میں اسے سمجھاؤں گی کہ ندا سے شادی کرلے۔ وہ بھی حسن کو پسند کرتی ہے اور بہت مخلص لڑکی ہے۔ یقیناً اپنی سمجھداری سے وہ حسن کو سنبھال لے گی۔" جمائمہ نے شوہر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ محبّ اور حسن لڑکپن کے ساتھی تھے، محبّ کی پوری فیملی امریکہ میں آباد تھی اور واشنگٹن ڈی سی میں مقیم تھی۔ حسن کا یہاں ہر قدم پر محبّ نے ساتھ دیا تھا۔ جمائمہ اور محبّ کی پسند کی شادی تھی، جمائمہ کیتھولک تھی، وہ بہت باوفا اور ہمدرد لڑکی تھی۔ اس نے محبّ سے شادی کے بعد اپنا مذہب بدل لیا تھا۔ حسن سے اس کی دوستی محبّ کے ذریعے ہوئی تھی۔ یونیورسٹی میں تینوں اکٹھے پڑھتے تھے۔ ان کی شادی میں حسن نے ہر ممکنہ طور پر مدد کی تھی اور محبّ کی فیملی کو منانے میں حسن کا بہت نمایاں کردار تھا،

جمائمہ کا اسلامی نام جمیلہ تھا مگر حسن اور محبّ اب بھی عادتاً اسے جمائمہ کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ ندا محبّ کی کزن تھی اور جن دنوں حسن پاکستان جارہا تھا انہی دنوں ندا کی فیملی بھی پاکستان جارہی تھی۔ ندا حسن کو پسند کرتی تھی اور حسن اس بات سے واقف ہونے کے باوجود تجاہل برتتا تھا۔ اس کا یقین تھا کہ شادی سے پہلے ہونے والی محبت، محبت نہیں ہوتی، دماغ کا فتور ہوتی ہے اور جو محبت شادی کے بعد کی جاتی ہے وہی پائیدار ہوتی ہے۔ اپنے اسی نظریے پہ ڈٹے رہنے کی وجہ سے وہ کبھی گمراہ نہیں ہوا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ گھر لوٹنے پر چاند منزل کی وہ اول جلول سادہ لوح بے ڈھب لڑکی یوں اس پر شب خون مارے گی کہ پھر خود کو سمجھانے اور سنبھالنے میں ہی نجانے کتنا وقت نکل گیا تھا۔

❁......❁......❁

وقت کی ہتھ گاڑی چیونٹی کی چال چلتے چلتے کب چیتے کی رفتار میں چھلانگتے اور پھلانگتے کس قدر آگے نکل گئی، اس کو احساس تک نہ ہوسکا، وہ کومل فیروز بخت کے روپ میں ایک ذمہ دار اور حساس بیوی، ایک سعادت مند بہو تھی، فیروز بخت اس پر جان چھڑکتا تھا، اماں اس کے واری صدقے جاتی تھیں، شادی کے چھ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھی۔ فیروز ان چھ سالوں میں اسے بہت سے ڈاکٹرز کے پاس لے گیا تھا۔ رپورٹیں یہی کہتیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہے، یہی کہتی کہ ابھی اللہ کی مرضی نہیں ہے کہ اس کی گود بھرے، فیروز نے کبھی اس پر کسی معاملے میں روک ٹوک نہیں کی تھی۔ بچے کے معاملے میں بھی وہ اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ فیروز ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل شوہر تھا بس اس میں ایک خامی تھی کہ کوئی بات اگر اس کے ذہن میں اٹک جاتی تو بہت مشکل سے نکلتی تھی۔ اور اس بات کا اندازہ کومل کو اس طرح ہوا تھا کہ اب تک وہ کبھی کبھی کسی نہ کسی بہانے سے حسن کا ذکر نکال لیتا تھا۔ اس نے ہماری شادی میں شرکت کیوں نہیں کی، وہ پاکستان کیوں نہیں آتا، وہ ابھی تک کنوارہ کیوں بیٹھا ہے؟ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں جن کا جواب دینا اس بیچاری کے لیے محال ہوجاتا تھا۔ فیروز کی یہ باتیں اس کی کوششوں کو تھکانے لگتی جو وہ حسن کو بھلا کر ایک بہترین بیوی بننے کے لیے دن رات، شعوری ولاشعوری طور پر کرتی آرہی تھی۔

اسی عرصے میں گھر کے دوسرے بچوں کی بھی شادیاں ہوگئی تھیں۔ صرف فواز اور امام بچے تھے۔ امام آج کل لاس اینجلس میں تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کررہا تھا۔ پونم اور صنم بھی ایک ایک بچے کی مائیں بن گئی تھیں۔ عنایہ کے دو جڑواں بچے ہوگئے تھے اور اس کی ساری اسمارٹنس ونزاکت اسی ممتا کی نذر ہوگئی تھی۔ اسفندیار نے اس کی جس ظاہری خوب صورتی کو وجہ بنا کر شادی کی تھی، وہ حسن ونزاکت تو بچوں کی ریں ریں اور مہمان داریوں کی نذر ہوچکی تھی، اسفندیار جیسا حسن پرست اور نفاست پسند بندہ عنایہ کی لاپرواہیوں اور بے ڈھنگے پن سے بے زار ہوگیا تھا۔ اس سے شادی کے بعد ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ عنایہ محض کاغذ کا پھول ہے، جس سے خوشبو نہیں آتی، نہ اسے سلیقہ تھا نہ طریقہ، شبنم پھوپو نے اسفند کو بہت بار اس کی غلطی کا احساس دلایا تھا جو اس نے کومل کو ریجیکٹ کرکے عنایہ کو چن کر کی تھی۔ پونم کی شادی میں اسفندیار نے کومل کو دیکھا تھا۔ شادی کے اتنے عرصہ بعد بھی اس نے خود کو اس قدر مینٹین رکھا ہوا تھا جس کومل کو اس نے محض اس کے موٹاپے کی وجہ سے رد کردیا تھا، وہ اب بے حد پرکشش جسم کی مالک بن گئی تھی، نہایت سلیقے سے اس نے تجدید فیشن کرر کھا تھا، اس کی شخصیت میں عجیب سا ٹھہراؤ اور تمکنت تھی، وہ جس طرح اپنے شوہر اور ساس کا خیال رکھ رہی تھی، جس طرح شادی والے گھر میں اپنی ذمہ داریاں نبھارہی تھی وہ اسفند کے لیے بہت حیران کن تھا۔ اسے اپنی غلطی پر شدید افسوس ہوا مگر اب کیا ہوسکتا تھا، اب تو چڑیاں کھیت ہی چگ گئی تھیں۔

❁......❁......❁

انہی دنوں گھر میں امام کی شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ صوفیہ کے کسی سسرالی رشتے دار کی لڑکی تھی۔ امام کی رضا مندی سے معاملات آگے بڑھائے گئے اور سیدھی سیدھی شادی کی تاریخ ہی طے کردی گئی۔ دادو کی طبیعت بھی اب ناساز رہتی تھی، حسن کے چلے جانے سے ان کی طبیعت

میں بہت خاموشی سی آ گئی تھی۔ مانی ان کے پاس رہتا تھا، وہ اس سے دل کی باتیں کر کے بوجھ ہلکا کرتے تھے۔ مانی اپنی کومل آپی کے حال دل کا گواہ تھا، وہ دادو کے دل کے راز بھی جانتا تھا اور حسن کے فرار کی وجہ بھی جانتا تھا، اس کم عمر لڑکے کا دل عجیب گہرا سمندر تھا۔ وہ اکثر کومل کے گھر جاتا اور اس سے دیر تک باتیں بھی کرتا تھا مگر وہ کبھی بھی حسن کا ذکر نہیں کرتا۔ وہ جانتا تھا اس کا ذکر اس کی پیاری کومل آپی کے دل کا آزار ہے اور وہ جانتے بوجھتے کیسے اسے آزار دیتا۔

بھائی کی شادی کے لیے اس نے خاص طور پر ایک ہفتہ پہلے چاند منزل جانے کی اجازت مانگی تھی۔ اکلوتا بھائی تھا۔ وہ ماں اور بہنوں کے ساتھ مل کر شادی کے سارے ارمان نکالنا چاہتی تھی۔ امو نے تو اجازت دے دی مگر فیروز نے بہت ہی مشکل سے اسے گھر چھوڑا تھا۔

''اتنے دن تمہارے بغیر کیسے رہوں گا؟'' وہ یہی تکرار کر رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے، نہیں جاتی۔'' وہ خفا ہوگئی۔ تب جا کر اس نے اجازت دی۔ امام کی شادی کے لیے اس نے نئے کپڑے سلوائے تھے، بری کا سارا سامان وہ دونوں بہنوں کے ساتھ جا کر خرید کر لائی تھی۔ بس امام کی دلہن کے لیے جو سیٹ بنایا تھا، وہ جیولر سے لینا تھا۔ مہندی سے ایک روز پہلے وہ کسی کو ڈھونڈ رہی تھی جو اس کے ساتھ جا کر جیولر کے پاس سے زیور لاتا۔

''چلیں آپی..... آپ کا مسئلہ حل ہوگیا۔ ڈرائیور تلاش کرلیا ہے آپ فٹافٹ چلی جائیں۔ نعمان بھائی کی گاڑی کھڑی ہے باہر۔'' مانی نے کہا۔

''تم نہیں چلو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''جا رہا تھا عین وقت پر بڑے تایا نے فون کر کے بلوا لیا، ان کی کیٹرنگ والے سے ان بن ہوگئی ہے۔ کیٹرنگ والا اڑ گیا ہے، مجھے فوراً ادھر پہنچنا ہے۔'' وہ عجلت میں کہتے ہوئے بائیک کی چابی اٹھا کر بھاگا۔

''احتیاط سے چلانا بائیک۔'' اس نے پیچھے سے آواز لگائی۔

''جی۔'' مانی نے مڑے بغیر جواب دیا۔ وہ بھی اپنا پرس اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے لباس پر نظر ڈالی۔ قد آور ڈریسنگ مرر میں دھانی رنگ کے خوب صورت لباس میں وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے کھلے ہوئے بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا اور دوپٹا درست کرتی ہوئی باہر نکلی۔

''ماما..... میں جیولر کے پاس جا رہی ہوں۔'' نکلتے ہوئے اس نے ماما کو مطلع کیا۔

''دنھی..... ٹیلر سے میرا سوٹ لے آنا۔'' پونم نے گیلے بال تولیے سے آزاد کرتے ہوئے کہا۔

''اور میرا دوپٹا رنگ ساز سے لے آنا۔'' صنم نے سالن کے چمچے پر لگے مصالحے کو جھکتے ہوئے یاد دلایا۔

''جی۔'' وہ رکے بغیر بولی اور پورچ کی طرف بڑھی۔ اسی پل موبائل فون بجا۔ اس نے جلدی سے پرس کھولا اور اسی پل وہ کسی سے بری طرح ٹکرائی۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

''سی۔'' وہ ماتھا پکڑ کر رہ گئی۔

''آ..... آئم سوری۔ چوٹ زیادہ تو نہیں لگی؟'' حسن کی آواز پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا، سفید قمیص پر گہرے نیلے رنگ کا کوٹ اور نیلی ہی پینٹ میں ملبوس اس کی صحت قابل رشک تھی اور خوب صورت چہرے پر مونچھوں کا اضافہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ وہ سن سی کھڑی اپنے سے بلند و بالا قد والے حسن کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت کا گیا وہ آج آیا تھا۔ کسی کزن کسی بھائی کی شادی پر نہیں آیا تھا، عرصہ دراز گزر گیا تھا، کتنا وقت..... اس نے حساب لگانا چھوڑ دیا تھا۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو..... پہچانا نہیں؟'' وہ مسکرایا تو وہ ہوش میں آئی اور کہیں بہت شدید دکھن شروع ہوگئی تھی۔ درد سے وہ بے حال ہونے لگی تھی۔ اتنے سالوں کی محنت سیلاب کی زد میں آ گئی تھی۔

''آپ.....!'' کہیں دور کسی اتھاہ سے آواز آئی۔

''کیسی ہو..... میاں کیسے ہیں تمہارے؟'' حسن نے

پوچھا۔
"اچھی ہوں، وہ بھی ٹھیک ہیں، آپ کیسے ہیں، کب آئے؟" خود پر قابو پاتے ہوئے وہ مسکرا کر بولی۔ سنبھالنا مشکل تھا لیکن اب اسے مشکل کام کرنے کی عادت ہوگئی تھی۔
"کل رات آیا تھا۔" حسن بولا۔
"میں ذرا جلدی میں ہوں، باہر جارہی ہوں، ایکسکیوز می۔" وہ کترا کر نعمان کی گاڑی کی طرف بڑھی۔ اس نے فرنٹ ڈور کھولا اور بیٹھ گئی، اس کا خیال تھا کہ نعمان کار ڈرائیو کرے گا مگر دوسری طرف تو حسن آ کر بیٹھ گیا، اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
"نعمان بزی ہے، اس کے کلائنٹس آگئے تھے، اس نے مجھے تمہارے ساتھ جانے کو کہا ہے۔" وہ جیسے اس کا ذہن پڑھ چکا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس کا فون بج بج کر بند ہوگیا ہے۔ کرمو چاچا نے مین گیٹ کھولا۔ حسن نے کار اسٹارٹ کی اور جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ کار میں اتنی خاموشی تھی مگر پھر بھی کس قدر شور تھا۔ وہ شور جوان دونوں کے اندر برپا تھا۔
"تم خوش ہو؟ لگ بھی رہی ہو۔" حسن نے بالآخر خاموشی کی تہہ پر وار کیا۔ جی تو چاہا کہ کہے خوش رہنے اور نظر آنے میں فرق ہوتا ہے مگر کیوں کہتی...... اس بار وہ اپنی نسوانیت پر وار نہیں کرسکتی تھی۔ صرف اتنا بولی۔
"جی...... بہت زیادہ۔"
"گڈ۔" اس کے جواب پر حسن نے چند لمحوں کے توقف کے بعد صرف اتنا کہا، اسی پل فون کی بیل پھر بجی، کومل نے پرس سے موبائل نکالا اور مسکرا کر حسن کو دیکھا۔
"فیروز ہیں۔" اس نے کہہ کر یس کا بٹن دبایا۔
"کہاں تھیں یار؟" بہت بے تابی سے اس نے پوچھا۔
"سوری، پرس میں تھا فون، میں جیولر کے پاس جارہی ہوں، امام کی بری کا سیٹ کلیکٹ کرنا ہے۔ آپ کہاں ہیں، آفس نہیں گئے؟" اس نے پوچھا، حسن نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا وہ سر سے پیر تک مکمل نظر آرہی تھی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ اس نے موڑ آہستگی سے کاٹا۔
"وہیں سے بول رہا ہوں۔ تم کس کے ساتھ جارہی ہو؟" اس نے یونہی پوچھا۔
"حسن بھائی کے ساتھ۔" کومل نے نارمل سے انداز میں جواب دیا لیکن دل یکدم چوکنا ہوگیا تھا۔
"حسن...... وہ کب آیا امریکہ سے؟" نجانے اس کا لہجہ بدلا تھا یا پھر کومل کو محسوس ہوا تھا۔
"جی، کل رات کو، بات کریں گے؟" اس نے پوچھا۔
"کرادو۔" فیروز بخت نے کہا تو اس نے موبائل حسن کی طرف بڑھایا۔
"فیروز بات کرنا چاہتے ہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔ حسن نے موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ بہت خوشگوار انداز میں فیروز سے بات کررہا تھا۔ اس نے لمحے بھر کے لیے بھی کوئی خاص تاثر اپنے انداز سے نہیں دیا، حالانکہ دل کا حال عجب سا تھا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون کومل کی طرف بڑھایا۔ کومل نے فون کان سے لگایا مگر فیروز نے فون بند کردیا تھا۔
"فیروز کہہ رہا تھا کہ تم سے بعد میں بات کرلے گا۔" حسن نے گیئر بدلا۔ کومل نے فون پرس میں رکھ لیا۔ وہ فیروز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ حسن کے نام کا نقطہ پہلے ہی اس کے ذہن میں تھا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہ نقطہ بڑھ کر دھبہ بن جائے۔
"آپ نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔ حسن نے اسے صرف ایک نظر دیکھا اور جیولر شاپ کے آگے گاڑی روک دی۔
"شاپ آگئی ہے۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ کومل جواب کی تشنگی کو اندر اتارتے دوسرے دروازے سے اتری۔ زخموں کے کھرنڈ چھل گئے تھے۔ اس کو عجیب سی تکلیف ہورہی تھی۔ حسن نے جس بے دردی سے اس کو رد کیا تھا، اس ذلت بھری، اہانت بھری تکلیف کو سہنا اس کے لیے اب بھی مشکل تھا اور اس احساس کی نوکیں اس کے دل میں آج بھی چبھتی تھیں۔

"آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" اس نے پوچھا۔ حسن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"کوئی تم جیسا نہیں ملا اور تمہیں تو خود ہی کھو دیا تھا تو شادی کس سے کرتا۔" وہ سوچتا ہوا خود پر ہنس رہا تھا۔
"بس...... مجھے لگا کہ شادی اتنی ضروری چیز نہیں ہے کہ اس پر وقت برباد کیا جائے، ہونی ہوگی تو ہو جائے گی۔" وہ عام سے لاپرواہ انداز میں بولا۔ کومل نے اس کی پشت پر ایک نگاہ سرد ڈالی۔
"کچھ چیزیں کبھی نہیں بدلتی حسن رحیم اللہ، جیسے کہ تم۔" اس نے شاپ میں آ کر سیٹ لیا اور بقیہ پے منٹ کی۔
"ذرا یہ انگوٹھی دکھایئے گا۔" اسے ہیرے کی بہت حسین انگوٹھی پسند آئی۔ سیلز مین نے انگوٹھی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ اس نے بہت شوق سے انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی تو اسے لوز تھی۔ اس نے باری باری باقی دونوں انگلیوں میں پہن کر دیکھی مگر وہ انگوٹھی کسی انگلی میں نہیں فٹ آ رہی تھی پھر اس نے مایوس ہو کر انگوٹھی واپس رکھ دی۔
"بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ٹرائی کرو۔" حسن نے مشورہ دیا۔
"آل ریڈی پہنی ہے، ویڈنگ رنگ ہے۔" اس نے حسن کے سامنے ہاتھ کیا۔ دودھیا مخروطی انگلی میں یاقوت کی انگوٹھی دمک رہی تھی۔
"ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔" حسن نے کہا تو اس نے ویڈنگ رنگ اتار کر وہ انگوٹھی پہن لی۔ انگوٹھی واقعی اس کے ہاتھ میں سج گئی تھی۔
"بہت اچھی لگ رہی ہے۔" وہ تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔
"کتنے کی ہے؟" اس نے پوچھا۔ دکان دار نے انگوٹھی کی قیمت بتائی۔
"گاڈ...... اتنی مہنگی۔" وہ کھڑی ہوگئی اسی وقت اس کا موبائل بجا، وہ فون لے کر آگے کی طرف بڑھ گئی۔
"سر...... یہ ایک ہی پیس ہے۔ ایسا ڈیزائن آپ کو پورے شہر میں نہیں ملے گا۔ یورپ سے ڈیزائن آیا ہے۔ آپ اپنی مسز کے لیے لے لیجیے۔ ایسی چیز بار بار نہیں ملتی۔" سیلز مین نے اس سے کہا۔ حسن کے دل میں جانے کیوں اسے خریدنے کی چاہ پیدا ہوئی۔ اس نے انگوٹھی پیک کروالی، پے منٹ اس نے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے کی تھی۔
"آئس کریم کھاؤ گی؟" حسن نے ڈرائیو کرتے ہوئے آئس کریم پارلر دیکھا تو اس سے پوچھا۔
"نہیں۔" اس کے منع کرنے پر وہ حیران ہوا۔
"کیوں؟ آئس کریم تو تمہیں بہت پسند ہے۔" اس نے کہا۔
"اب پسند بدل گئی ہے میری۔ مجھے اب آئس کریم نہیں پسند۔" اس نے سن گلاسز پرس سے نکال کر آنکھوں پر چڑھائے، حسن نے بہت دکھ سے اس کی سمت دیکھا۔
"اور ویسے بھی میرے میاں کو پسند نہیں ہے کہ میں ان کے بغیر کسی کے ساتھ باہر کچھ کھاؤں پیوں۔" اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے مجھے خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ تم ایک اچھی اطاعت گزار بیوی ہو۔" حسن نے کار آگے بڑھا دی۔
"اتنا اچھا شوہر ملا ہے اطاعت گزاری کا شوق از خود ہوتا ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔
"اب تو مانتی ہوناں کہ جو فیصلہ میں نے چھ سال پہلے کیا تھا وہ درست تھا۔" حسن نے جیسے اسے کچھ جتایا۔
"جو آپ نے چھ سال پہلے کیا تھا وہ سب صحیح تھا حسن بھائی۔ تھینکس۔" اس نے بھی گویا جواب دینے کی قسم کھالی تھی۔
"اچھی بات ہے کہ تم نے حقیقت تسلیم کی۔ تم شروع سے ہی سمجھدار لڑکی ہو۔ عقل کی تم میں کبھی کمی نہیں رہی۔ فیروز تم سے یقیناً بہت خوش ہوگا۔" حسن نے ہلکے پھلکے انداز میں بات کو آگے بڑھایا۔
"فیروز واقعی آئیڈیل شوہر ہیں مگر ان سے عنایہ نے ہم دونوں کے بارے میں کچھ قابل اعتراض باتیں کی تھیں۔" اس نے حسن کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
"کیا......؟" حسن کا پیر بے اختیار بریک پر پڑا۔

''آرام سے۔'' وہ گھبرائی۔ اچھا ہوا کہ روڈ پر رش نہیں تھا ورنہ ایکسیڈنٹ ہوجاتا۔

''سوری...... بات ہی کچھ ایسی تھی۔ اب پوری بات بتاؤ۔'' حسن نے کار سڑک کے کنارے روکی۔ کومل نے اسے شادی کی پہلی رات فیروز کی زبانی جو باتیں سننے کو ملی تھیں، وہ اختصار سے بتادیں۔

''میری سمجھ میں یہ لڑکی نہیں آئی آخر اس کو ہم سے مسئلہ کیا ہے۔'' وہ بے حد بگڑے موڈ کے ساتھ اسٹیرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

''یہی بات تو مجھے سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے، خون کا رشتہ ہوتے ہوئے ایسی دشمنی کیوں؟ جبکہ میں نے تو کبھی اس سے فالتو بات بھی نہیں کی۔'' وہ خود بھی یہ گتھی سلجھا نہیں پائی تھی۔

''پھر...... فیروز اب تو کوئی بات نہیں کرتا؟'' وہ حسن کا اشارہ سمجھ گئی۔

''نہیں یہ بات کھٹکتی ہے کہ آپ شادی کیوں نہیں کررہے؟'' اس نے حسن کی طرف دیکھا۔ وہ نچلا ہونٹ دبائے کچھ سوچ رہا تھا پھر اس نے جواب دیئے بغیر کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھادی۔

❁......❁......❁

پوری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ فیروز اس سے بظاہر اچھے طریقے سے ملا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کچھ عجیب سا تاثر تھا۔ اگر کومل اسے مطلع نہ کرتی تو وہ کبھی اس تاثر کی گہرائی تک نہ جاتا، پوری رات سوچ و بچار کے بعد اس نے لیپ ٹاپ آن کیا اور ایک ای میل لکھ کر امریکہ سینڈ کردی۔ فیصلہ کرنے سے پہلے انسان مضطرب رہتا ہے فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہوجاتا ہے اور فیصلے پر عمل کرنے کے بعد وہ انتظار کرتا ہے، حسن بھی یہی کررہا تھا۔ اب اسے انتظار تھا۔

شادی والا گھر تھا۔ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ دور نزدیک کے سب ہی مہمان جمع تھے، عنایہ بھی اپنے بچوں سمیت پھوپو اور پھوپا سمیت موجود تھی۔ اسفند کو چھٹی نہیں ملی تھی لہٰذا وہ صرف بارات ہی اٹینڈ کرسکتا تھا کیونکہ بارات اتوار کو تھی۔ کومل باقی بہنوں اور کزنز کے ساتھ بہت مصروف تھی۔ ماما کے ساتھ مہمانوں کے لیے چائے پانی کا انتظام سنبھال رہی تھی۔ تین، چار ملازمائیں جو کہ شادی کے بکھیڑے سنبھالنے کے لیے جز وقتی رکھی گئی تھیں وہ بھی کام کررہی تھیں۔ رات کو مہندی تھی۔ اس نے کاموں سے فراغت حاصل کی اور مہندی کے تھال سجانے بیٹھ گئی۔

''ارے کومل چندا ذرا مہندی تو لگادو مجھے۔ ان چنے منوں کے بکھیڑوں میں وقت ہی نہیں ملا۔'' اس کی ننھیالی کزن جو کہ تین بچوں کی اماں تھیں، کون مہندی لیے سر پر پہنچ گئی۔

''ابھی لگائیں گی تو رنگ کیسے چڑھے گا نزی آپی؟'' صوفیہ نے کہا۔

''سوکھ جائے گی تو چینی کا شیرہ لگادوں گی۔ اس سے مہندی کا رنگ تیز ہوجاتا ہے، ابھی تو دیر ہے رات ہونے میں۔'' نزی آپی نے کہا۔

''لائیے۔'' کومل نے ٹشو سے تھال کے کنارے صاف کیے۔

''تمہاری مہندی کا ڈیزائن بہت اچھا ہے۔ رنگ بھی خوب چڑھا ہے۔ ایسا ہی ڈیزائن بنادو۔'' انہوں نے اس کے مہندی سے سجے سرخ سرخ ہاتھ تھامے۔

''نزی آپی...... ننھی کا میاں اس پر جان چھڑکتا ہے اور ساس بھی، اسی لیے رنگ تیز آیا ہی کون مہندی کا کمال نہیں۔'' امام نے نجانے کہاں سے سر انکالا۔

''اچھا تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میرے میاں مجھ سے نفرت کرتے ہیں؟ مجھ پر جان نہیں چھڑکتے۔'' وہ بھی اسی کی کزن تھیں آنکھیں نکال کر بولیں۔

''میری یہ مجال میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رسک لینے سے اچھا ہے کہ اچھی کوالٹی والی مہندی استعمال کریں تاکہ رنگ اچھا آئے اور بھرم بھی رہ جائے۔'' امام نے شوخی سے کہا۔

''اچھا...... دیکھتی ہوں تمہاری بیوی کو کتنا رنگ چڑھتا ہے، آنے دو اونٹ کو پہاڑ کے نیچے دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا۔'' وہ برجستہ بولیں۔

''ان کی جورو کے تو خوب ہی رنگ جمے گا بھئی۔ ننھے

میاں کے تیور تو پالنے میں ہی دیکھ لیے تھے۔'' شبنم پھوپو بھی آ کر دھم سے بیٹھ گئیں۔

''یہ حسن بھائی کو پکڑیے پھوپو، یہ ہمیشہ رسیاں تڑوا کر بھاگتے ہیں۔ مجھ غریب کو تو یوں بھی سولی پر چڑھا دیا ہے آپ لوگوں نے۔ چار دن کی آزادی تھی، چھین لی وہ بھی۔'' امام نے نادیدہ آنسو پونچھے۔ حسن ذرا فاصلے پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ فیروز بخت بھی اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

''اللہ رے معصومیت، کیا بیچارگی ہے۔'' زری آپا نے بھی ٹکڑا جوڑا۔ فیروز کی سوئی چھیڑ چھاڑ کے بجائے حسن والی بات پر اٹک گئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بات کا واضح جواب ملے تا کہ وہ پرسکون ہو جائے۔

''قاعدے کے مطابق تو حسن بھائی کا نمبر سب سے پہلے آنا تھا۔ پوچھیں تو ذرا ان سے خالہ جان ابھی تک بے مہار کیوں پھر رہے ہیں؟'' حسن کی ایک کزن نے تائی جان سے کہا، گویا فیروز کے دل کی مراد برآئی۔ اس نے ایک نظر تشکر ان پر ڈالی۔ کومل سر جھکائے مہندی کا ڈیزائن بنانے میں مگن تھی۔ وہ خود چاہتی تھی کہ حسن اس بات کا جواب دے اور اس کی جان چھوٹے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو کہ دو کشتیوں میں سواری کرتے ہیں۔ فیروز اس کی کشتی تھا اور وہ اسی کشتی میں سواری میں کنارے سے لگنا چاہتی تھی۔ دوسری کشتی حسن تھا جس میں سواری کی نا اسے اب چاہ تھی اور نا شوق۔

''تم ہی لوگ پکڑوا سے، میری تو مانتا نہیں۔'' تائی جان نے لڑکیوں کو حسن کے پیچھے لگا دیا۔

''ارے رے...... کیوں مجھ غریب کے پیچھے پڑ گئی ہیں سب؟ بھئی اس طرح آزاد جینے دیں...... مجھے اپنی آزادی بھلی ہے۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''جی نہیں، یہ فاؤل ہے، ہم سب پنجروں میں قید اور آپ آزادی سے فضا میں اڑان بھریں۔ بالکل غلط ہے۔'' صنوبر نے سب سے پہلے احتجاج کیا۔

''ہاں بھئی، بات تو ٹھیک ہے کہ اصولاً تو آپ کو زنجیر پہلے پہننی چاہیے تھی۔'' فیروز نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

''لیجیے صاحب، آپ بھی ان میں شامل ہو گئے۔'' وہ بولا۔

''تائی جان...... میں تو کہتی ہوں کہ امام کے ساتھ اسے بھی بٹھا دیتے ہیں، لڑکی پکڑ کر لائیں کہیں سے بس۔'' حسن کا ایک کزن بولا۔

''بس ٹھیک ہے حسن بھائی یا تو آپ خود لڑکی کو پیش کریں یا پھر ہمیں اس معرکہ کو انجام دینے دیں۔'' صنم نے کہا۔

''ارے رے، بھئی...... اتنی جلدی تو بازار سے جانور بھی نہیں ملتا...... بیوی کہاں سے لاؤں؟'' وہ سچ میں گھبرایا۔ شیطانی ٹولہ جو ٹوٹ پڑا تھا۔

''آپ لڑکی لے آئیں، ہم آپ سے اس کا نکاح پڑھوا کر بیوی بنا کر آپ کو پیش کر دیں گے۔'' عنایہ نے کافی دیر بعد گفتگو میں حصہ لیا، وہ اپنے بالوں کے لیے گجرا بنا رہی تھی۔ حسن نے اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''ہوسکتا ہے کوئی پسند ہو......'' اس نے بے نیازی سے بات مکمل کی۔

''کون ہے...... کون ہے؟ نام بتانا ہوگا۔'' ساری طوفان میل اس کے پیچھے سیٹی بجاتی ہوئی بھاگیں۔

''کوئی نہیں ہے۔'' وہ یکدم سنجیدہ ہوا۔ فیروز بہت غور سے اسے اور پھر کومل کو دیکھ رہا تھا۔ کومل اپنے کام میں مصروف تھی حسن نے غیر ارادی طور پر اسے دیکھا اور فیروز نے حسن کو۔

''تو پھر شادی کے لیے ہامی کیوں نہیں بھرتے۔ نام بتائیں شاباش۔'' کسی کزن نے نعرہ بلند کیا۔

''ہوسکتا ہے نام سب کے سامنے لینا نہ چاہتے ہوں۔ دل میں جھانکنا پڑے گا۔'' عنایہ ہنسی۔ کومل کے ہاتھ لحظہ بھر کو رکے پھر چند لمحوں کے بعد دوبارہ حرکت میں آ گئے۔ فیروز نے حسن کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو غور سے دیکھا تھا۔

''یہ کام ہم نہیں کر سکتے، مشکل ہے۔ آسان کام بتائیں۔'' آفت کی پڑیاں شور مچانے لگیں۔

''لگتا ہے یہ سب آپ کا نکاح پڑھوا کر ہی دم لیں گی۔

جلدی سے نام بتادیں یا کسی بھی گوری کو پکڑ کر لے آئیں۔'' امام نے کہا۔
''لیکن گوری واقعی گوری ہو، صرف نام کی گوری نہ ہو۔'' کسی شوخ لڑکے نے پیچھے سے ہانک لگائی۔
''حسن میاں...... فون ہے آپ کا امریکہ سے۔'' ماما نے اسی پل اطلاع دی تو وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
''امریکہ سے...... کس کا فون ہوگا؟ گوری کا...... ہاہاہا۔'' ایک ہاؤ ہو کا مچ گئی۔ ہنسی کا طوفان اٹھا جس نے کومل، فیروز اور حسن کے اندر اٹھنے والے جوار بھاٹا کو ڈھک لیا تھا۔
فون اٹینڈ کرنے کے لیے وہ دادو کے کمرے میں آیا تھا۔ دادو اس وقت اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ وہ اطمینان سے بات کرسکتا تھا۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا اور یس کہتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گیا۔
''ندا بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے مدہم سی آواز آئی۔
''کیسی ہو؟'' حسن نے پوچھا۔
''میں تو ٹھیک ہوں مگر تمہیں کیا سوجھی؟ میں نے ابھی تمہاری میل پڑھی...... حسن سب ٹھیک ہے ناں؟'' اس نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔
''ہاں، سب ٹھیک ہے، وہ بات دراصل یہ ہے کہ......'' اس نے آہستہ آہستہ اسے تمام قصہ سنایا۔ شروع سے اب تک کی ساری کہانی۔
''مجھے کبھی یہ احساس تک نہیں ہوا تھا کہ وہ لڑکی جسے میں محض بچی سمجھ کر اس کی مدد کررہا تھا، وہ اس طرح اس قدر خاموشی سے میرے دل میں آ کر بیٹھ جائے گی۔ ندا ایسا کب ہوا کیسے ہوا مجھے خبر نہیں، جانے کون سا لمحہ تھا جب میں نے اس پاگل سی لڑکی کے حوالے اپنی محبت کردی۔ جس پل اس نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اس وقت میرے ذہن نے سچ ماننے سے انکار کردیا تھا۔ فیروز بخت کے ساتھ رشتہ طے ہوجانے پر وہ جتنا تڑپی تھی میں جانتا ہوں کیونکہ میرا دل اس کے ہر ہر احساس کی ترجمانی کررہا تھا۔ میں اس احساس کو کچھ اور نام دے دیتا تھا، کبھی سوچتا کہ کومل کی عمر ابھی شادی کی نہیں ہے، کبھی سوچتا پتا نہیں وہ فیروز کو پسند کرتی ہے کہ نہیں، کبھی سوچتا کہ وہ شادی کے بعد ایڈجسٹ نہیں ہو پائے گی، کبھی سوچتا کہ وہ بعد میں خوش رہ بھی پائے گی کہ نہیں۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ، پھر خود کو خود ہی تاویلیں پیش کرتا، خود ہی سوال اور خود ہی جواب کے عمل سے گزرتا رہا۔ کومل کے دل میں میرے لیے محبت پیدا کرنے کی ذمہ دار عنایہ ہے مگر میرے دل میں کومل کی محبت کا پھول از خود کھلا تھا۔ کب کیسے؟ پتا نہیں، بس میں کتھارس کرنا چاہتا تھا۔ اتنے سالوں سے محب اور جمائمہ مجھ سے یہی اگلوانے کی کوشش کررہے تھے۔ میں جب تک اس سچائی کو قبول کرتا، بہت دیر ہوگئی تھی۔ وہ فیروز بخت کی ہوگئی تھی۔ کومل، دادو، محب، تم، جمائمہ اور خود میرا دل سب ہی مجھ سے سچ اگلوانے کی کوشش کرتے رہے مگر...... صد افسوس میں نے اپنے لیے دکھوں کو خود خرید لیا۔'' حسن نے کہا۔
''مگر اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟ اب تو اسے سوچنا بھی تمہارے اور ان دونوں کے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔'' ندا نے گہری سانس لے کر کہا۔
''اور پھر......''
''جانتا ہوں۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''مگر یہ باتیں کرکے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا نہیں کرنا چاہتا...... بس بات یہ ہے کہ عنایہ نے فیروز کے ذہن میں ہم دونوں کے متعلق غلط باتیں ڈال دی ہیں۔'' حسن نے کہا۔ فیروز بخت بت بنا کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات تھے۔ کومل نے خوف زدہ نظروں سے فیروز کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں دادو کے پاس بیٹھنے آئے تھے۔ مگر دادو کے بجائے حسن مل گیا۔ وہ ان دونوں کی موجودگی سے بے نیاز اور بے خبر اپنی بہت اچھی دوست سے اپنا سب سے اہم راز شیئر کررہا تھا۔ اگر وہ اس پل ذرا سا گھوم کر دیکھ لیتا تو فیروز بخت اور کومل کا رشتہ زلزلے کی زد میں نہ آتا۔
''فیروز...... سنیں تو......'' کومل اسے پکارتی ہوئی اس کے پیچھے لپکی، حسن بے اختیار چونک کر مڑا۔

''او...... گاڈ۔'' اس کے منہ سے نکلا۔
''کیا ہوا حسن؟'' ندا نے پریشانی سے پوچھا۔
''لگتا ہے فیروز نے سب سن لیا ندا۔''
''اوہ...... یہ تو بہت برا ہوا۔ تم جا کر اسے سمجھاؤ۔ کہیں کومل کے لیے کوئی مشکل نہ کھڑی ہو جائے۔'' ندا نے پریشانی سے کہا۔
''کیا اس وقت میرا فیروز سے بات کرنا ٹھیک ہوگا؟ شادی والا گھر ہے، مہمانوں سے بھرا ہوا ہے، کوئی تماشا نہ کھڑا ہو جائے۔'' وہ تذبذب کا شکار ہوا۔ آج ولیمہ تھا۔ لہٰذا جو رشتے دار بارات پر آئے تھے وہ بھی چاند منزل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔
''ہوں...... پھر...... کیا کیا جائے؟ بات تو کرنی ضروری ہے۔'' ندا سوچ میں پڑ گئی۔
''ویسے تم مجھ سے وہ خاص بات جو کرنا چاہتے تھے، کیا تھی؟ شاید تمہاری اس بات سے کوئی حل نکل آئے۔'' وہ ذرا توقف کے بعد بولی۔
''میں تمہیں پرپوز کرنا چاہتا تھا۔ اس مسئلے کا حل مجھے یہی نظر آیا تھا کہ تم سے شادی کرلوں۔'' حسن نے گہری سانس لے کر کہا۔
''میں ہی کیوں؟ شادی تو تم کسی بھی لڑکی سے کر سکتے ہو؟'' ندا نے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا کیونکہ اس سے پہلے اس نے حسن کو اشارے کنایوں میں بہت بار شادی کی پیشکش کی تھی مگر وہ جان کر انجان بن جاتا تھا، اب اس کے منہ سے یہ بات سن کر اسے خوشی نہیں تکلیف ہو رہی تھی۔
''تم مجھے خودغرض کہہ لو یا جو مرضی مگر میری اپنی غرض کے تحت ایسا کرنا چاہتا تھا...... تم میری بہت اچھی دوست پہلے ہو ندا...... مجھے شادی کے لیے بیوی سے زیادہ ایک دوست کی ضرورت تھی۔ جو میرے درد سے آشنا ہو۔ وہ راز جس میں، میں نے تمہیں آج شریک کیا ہے۔'' وہ آہستگی سے بولا۔
''مجھے معاف کرنا حسن، میں پوری زندگی تمہاری دوست بن کر گزار سکتی ہوں مگر تمہاری بیوی بن کر وہ ذلت اور تکلیف کا احساس نہیں سہہ سکتی جو تم مجھے بارہا انکار کر کے دلا چکے ہو۔ تم مان لو کہ تم ایک بزدل مرد ہو۔'' ندا نے تلخی سے بزدلی کا طعنہ اس کے منہ پر مارا۔ حسن نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں۔
''تم جو دل میں آئے کہہ لو...... میں برا نہیں مانوں گا۔ انکار کرو گی تب بھی نہیں مگر ایک سچ اور سن لو میں شادی اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ کومل اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر خوش رہے، آباد رہے، میرا کنوارا رہنا اس کے کردار پر سوال بن رہا ہے، میں اسے اس بوجھ سے آزاد کرانا چاہتا ہوں، جو وہ میرے شادی نہ کرنے سے اٹھائے اٹھائے پھر رہی ہے، تم انکار کر بھی دو کہ یہ تمہارا حق بنتا ہے مگر مجھے اب شادی کرنی ہے، کسی سے بھی کیونکہ ایک معصوم لڑکی کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہے حالانکہ یہ فیصلہ آسان نہیں تھا ندا۔'' وہ لمحہ بھر کو رکا۔
''دل کسی کے نام کرنے کے بعد زندگی میں کسی اور کو شامل کرنا بہت سخت سزا ہے۔ کم از کم مجھ جیسے مرد کے لیے...... جس کے لیے محبت ایک وقت گزاری کا کھیل نہیں ہے بلکہ عبادت ہے...... تم انکار کرنا چاہو تو کردو مگر یاد رکھنا کہ اس انکار سے ہماری دوستی کے رشتے پر کوئی فرق نہیں آئے گا۔'' وہ بے حد مضبوط لہجے میں کہہ رہا تھا۔
''آئی ایم سوری حسن...... میں زیادہ ہی جذباتی ہوگئی تھی اس مشکل گھڑی میں بجائے تمہاری مدد کرنے کے میں تم سے گلے شکوے کرنے بیٹھ گئی۔ مجھے معاف کردو۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔
''معافی تو مجھے مانگنی چاہیے ندا کہ میں تمہیں اپنی غرض کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔'' وہ دکھ سے بولا۔
''تمہاری غرض نہیں حسن...... تم آج پھر اس کی مدد کر رہے ہو...... جب تم اتنی بڑی قربانی دے سکتے ہو تو کیا میں دوست ہونے کے ناطے تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتی۔'' ندا نے ہنس کر کہا۔
''ندا تم......'' حسن نے کہنا چاہا۔
''میں جانتی ہوں کہ مجھے ساری زندگی تمہاری محبت کے بغیر تمہارے ساتھ گزارنا ہوگی مگر میرے لیے یہ احساس کافی ہوگا کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور جس سے میں محبت کرتی

ہوں اسی کے ساتھ رہتی ہوں۔ کم از کم ضمیر کا بوجھ تو نہیں ہوگا میرے اوپر..... تمہارے پاس ہونے کا احساس تو ہوگا پھر کیا پتا کہ تم واقعی مجھ سے محبت کرنے لگو کیونکہ میرا ماننا ہے کہ محبت بار بار ہوتی ہے۔'' ندا نے کہا۔

''میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں، دادو آ گئے ہیں۔'' حسن نے قدموں کی آہٹ پر مڑ کر دیکھا۔ دادو اس کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں لکڑی کی لاٹھی تھی۔ جس کے سہارے سے وہ چل رہے تھے۔ پچھلے کچھ سالوں سے انہوں نے اس لاٹھی کا استعمال کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اب ان کی ریڑھ کی ہڈی میں تکلیف رہنے لگی تھی۔ حسن ریسیور رکھ کر مڑا تو وہ اس کے قریب کھڑے تھے۔

''حسن..... یہ فیروز اتنے غصے میں کیوں نکلا ہے؟'' انہوں نے چھوٹتے ہی پریشانی سے پوچھا۔

''جی..... کہاں گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''افتخار آیا تھا۔'' انہوں نے اپنے دوست کا نام لیا۔

''ہم دونوں لان میں بیٹھے تھے۔ افتخار ابھی کچھ دیر پہلے گیا ہے میں لان سے آ رہا تھا تو ننھی کو داماد میاں کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ دونوں اسی طرف سے آ رہے تھے، فیروز کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ ننھی رو رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ میں وہاں تک پہنچتا فیروز میاں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر نکل گئے۔ ان کے پیچھے ننھی بھی دوسری گاڑی میں نکل گئی۔ تم بتاؤ تم تو یہیں تھے؟'' وہ خاصے فکر مند تھے۔ حسن نے گہری سانس لی۔ جس کا ڈر تھا وہی ہو گیا تھا۔

''دادو..... آپ یہاں بیٹھیں۔'' اس نے انہیں بیڈ پر بٹھایا اور خود ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ دادو پریشانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے مگر بولے کچھ نہیں، اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے۔

''دادو..... بات دراصل یہ ہے کہ.....'' حسن نے چند لمحے سوچنے کے بعد بات شروع کی۔ دادو ساری بات بہت توجہ سے سنتے رہے۔ اس نے اپنی بات کا اختتام کیا اور سر جھکا لیا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو جائے گا۔ اللہ کی قسم دادو، میں کومل کی خوشی، اس کی عزت چاہتا ہوں۔ اس کے دامن پر ایک چھینٹ بھی نہیں دیکھ سکتا اور آج..... اتنی احتیاط کے باوجود..... خود میری ہی وجہ سے.....'' اس نے ان کے گھٹنوں پر ماتھا ٹکا دیا۔

''جو ہوا..... بہت برا ہوا..... میں نے جب تم سے بات کی تھی تب میں نے کچھ سوچ کر ہی قدم اٹھایا تھا۔ ننھی کا رجحان تمہاری طرف تھا۔ ضرورت سے زیادہ اور تم بھی اس کا خیال رکھتے تھے ضرورت سے زیادہ۔ محبت کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔ اگر آپ کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس محبت کے بہترین اظہار کے طور پر آپ اس شخص کو دین وقانون کے مطابق اپنا سکتے ہو۔ یہ بہت ہی جائز اور باعزت طریقہ ہے۔ بجائے دوسرے طریقے اپنانے کے مگر اس وقت تم نے اپنی عقل پر خود ہی قفل لگا دیئے تھے تو سمجھ کہاں سے آتی؟ اس وقت سے جو بھاگ رہے ہو تو ابھی تک بھاگتے ہی رہے ہو۔'' دادو نے بے حد ناراضی سے کہا۔ حسن نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''ہاں..... تمہیں فرار کی عادت پڑ گئی ہے حسن۔ تم اس وقت سے لے کر اب تک فرار ہی ہو رہے ہو..... کبھی فیروز کے پیچھے چھپ جاتے ہو کبھی میرے پیچھے اور اب..... ندا کے پیچھے..... کیا میری تربیت میں یہ پہلو تھا؟ کیا میں نے کبھی تمہیں فرار کا سبق پڑھایا؟ اپنا سارا لڑکپن اور پھر جوانی کے بہترین دن تم نے ایک آزاد اور مادر پدر آزاد معاشرے میں گزار دیئے۔ تب تو تم ایسے قطعی طور پر نہ تھے میرے بچے، جب وہاں سے نہیں بھاگے تو اپنے دل سے کیوں بھاگتے پھر رہے ہو؟'' انہوں نے اس کا چہرہ اپنے جھریوں بھرے ہاتھوں میں تھام لیا۔

''پھر جب وقت اعتراف اور قبول کرنے کا تھا، تب تو نہ کیا..... اب کرنے چلے تو دیکھا..... دیکھا کیا ہوا؟'' حسن کی سیاہ جھیل سی آنکھوں میں موتی اتر آئے۔

''مرد سب کچھ برداشت کر سکتا ہے حسن.....'' انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

''چاہے کتنی ہی برداشت والا ہو مگر رقیب کو برداشت نہیں

کرتا...... اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی رہی ہو، چاہے ماضی میں ہی سہی...... یہ بات فیروز تو کیا کوئی بھی مرد نہیں سہے گا۔ ہاں اگر کوئی بڑے ظرف والا ہوا بھی تو کبھی نہ کبھی اس کے ذہن میں اپنی بیوی کو لے کر، یہ خیال ضرور آئے گا کہ یہ عورت کبھی کسی کو چاہتی تھی، چاہے وہ عورت کتنی ہی باوفا ہو، تم بھی مرد ہو حسن...... خود سوچو اپنے اوپر رکھ کر یہ بات سوچو۔'' وہ اسے آئینہ دکھا رہے تھے۔

''اور ندا سے شادی کرنے کے بعد کیا ہوگا؟ کیا فیروز، کومل کے لیے پہلے والے جذبات اپنے اندر رکھ پائے گا؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''پھر...... دادو میں کیا کروں؟ مجھے کومل کی فکر ہے۔ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ دادو سے پوچھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ دادو کے لب جنبش کرتے کامران گھبرایا گھبرایا سا اندر کمرے میں داخل ہوا تھا۔

✿......✿......✿

کوئی قیامت سی قیامت تھی جو آ گئی تھی۔ اس کی پوری گرہستی، اس کی عزت، اس کا وقار، اس کا مان سب کچھ سوئی کی نوک پر اٹکے غبارے کی طرح ہو رہا تھا۔ کسی بھی وقت غبارہ پھٹ جاتا اور سب کچھ بکھر جاتا۔ وہ دیوانہ وار اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

''میری بات تو سنیں......'' اس نے فیروز کا بازو تھاما۔

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ...... کہا تھا ناں، کہا تھا ناں میں نے کہ جھوٹ اور دھوکہ بازی نہیں...... تم نے میرے اعتماد کو ضرب دی ہے کومل، تمہارا حسن سے محبت کا اعتراف میں معاف کرسکتا تھا، وہ اعتراف میں پی جاتا مگر تم نے میرے بھروسے کو دھچکا دیا، ریزہ ریزہ کردیا۔'' فیروز نے دھیمی مگر غضب ناک آواز میں کہتے ہوئے اپنا بازو اس کی زد سے چھڑایا۔

''خدارا میری بات سنیں، فیروز مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا ایک موقع تو دیں۔'' وہ رو پڑی۔

''جب صوفیہ کی شادی والے روز مجھے عنایہ نے بتایا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگی ہو تو میں نے اس کی بات کا بھروسا کرلیا تھا کیونکہ میں بھی پہلی ملاقات میں تم سے محبت کر بیٹھا تھا مگر میں نے سوچا کہ پہلے تصدیق و تحقیق کی جائے پھر معاملہ آگے بڑھایا جائے۔ مجھے عام لوگوں کی طرح محبت کی پینگیں بڑھانے کا شوق نہیں تھا۔ میں ہمیشہ اپنے معاملات میں فیئر رہا ہوں اور فیئر ہی معاملات کو پسند کرتا ہوں پھر جب میں نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ تم فیئر ہو۔ نہ تمہارا کسی کے ساتھ افیئر ہے نہ ہی انوالمینٹ، تب میں نے عنایہ کی پہلی والی بات کا یقین کرتے ہوئے تم سے رشتہ کرنے کا عملی قدم اٹھایا مگر پھر عنایہ کی تمہارے اور حسن کے بارے میں مختلف مواقع پر مختلف باتیں، کومل میں نے تب بھی بلا تصدیق اس کی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ مجھے عنایہ پر پہلے ہی شک تھا کہ وہ تم سے کوئی ذاتی پرخاش رکھتی ہے، اسی لیے وہ تمہارے متعلق کچھ نہ کچھ گوہر فشانی کرتی رہتی ہے، میں کسی بات کا تب تک یقین نہیں کرتا، جب تک کہ معاملات کو بالکل اچھی طرح نہ جان لوں، میں نے تب بھی تم سے روبرو بات کی تھی، البتہ حسن کا شادی نہ کرنا مجھے کھٹکتا تھا مگر آج مجھے میرے ہر سوال کا جواب مل گیا ہے۔ تمہاری آنکھوں کی وہ خاص کیفیت جو کبھی کبھی مجھے نظر آتی تھی، اس کی وجہ پتا چل چکی ہے، کومل جلد ہی طلاق نامہ تمہیں مل جائے گا...... اب تمہارا مجھ سے اور میرے گھر سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ اس گھر سے تم جو کچھ لے جانا چاہو لے جاسکتی ہو۔'' فیروز بخت کے خوب صورت لبوں سے انگارے نکل کر اس کا وجود جلا کر بھسم کر رہے تھے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے بھاگتی پورچ تک پہنچی تو وہ اپنی کار میں بیٹھ کر نکل چکا تھا۔ پورچ میں مانی کھڑا ہوا موبائل فون پر اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہا تھا، اس نے حیرت و تشویش سے دونوں کو باری باری دیکھا۔

''کیا بات ہے آپی فیروز بھائی سے جھگڑا ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مانی...... جلدی سے کار کی چابی لاؤ، مجھے گھر جانا ہے۔'' اس نے گھبرا کر مانی کا شانا دبایا۔

''چابی میرے پاس ہے مگر......'' وہ بیچارہ کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔

''سوال نہیں چلو۔'' وہ دوسری طرف سے گھوم کر فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی۔ مانی جلدی سے کار میں بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے گیٹ سے باہر نکالی۔

''اب بتائیں ہوا کیا ہے؟'' اس نے کار سڑک پر دوڑائی۔

''فیروز کو پتا چل گیا ہے...... سب پتا چل گیا ہے۔'' اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کیا پتا چل گیا ہے؟'' وہ نہ سمجھنے والے انداز میں بولا۔

''حسن اور میرے بارے میں۔'' اس نے مختصراً مانی کو بات بتائی۔

''اوہ...... یہ تو گڑبڑ ہوگئی مگر حسن بھائی کو اب کیا سوجھی کہ گڑے مردے اکھاڑنے بیٹھ گئے؟'' مانی حیران اور فکر مند ہوا۔

''فیروز جب کسی بات کی ٹھان لیتے ہیں تو پھر انہیں ان کے فیصلے پر عمل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ مانی اگر انہوں نے واقعی مجھے طلاق دے دی تو میں مرجاؤں گی۔ اتنی ذلت، اتنی رسوائی، خدایا...... میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے ان سے بے وفائی کی ہے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''میرا اللہ جانتا ہے مانی، میں نے شادی کے بعد حسن کو سوچا بھی نہیں...... میرا شوہر ہی میرے لیے سب کچھ تھا۔ میں نے سب کچھ اپنے دل میں قبر بنا کر اس میں دفن کر دیا تھا۔ میرے دامن پر اتنا کالا دھبہ۔'' وہ تڑپ رہی تھی۔

''آپ اتنی گہرائی میں مت جائیں طلاق کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ میں سمجھاؤں گا انہیں، میں جانتا ہوں کہ میری آپی کا دل اور دامن کتنا پاک ہے۔'' اس نے بڑے بھائی کی طرح کومل کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔

''فیروز کی گاڑی قریب تو کہیں نظر نہیں آرہی...... وہ بہت رش ڈرائیو کرتے ہوئے نکلے تھے۔ رش بھی اس قدر ہورہا ہے۔'' وہ تشویش سے ادھر ادھر نظریں دوڑا رہی تھی۔

''وہ رہی ان کی کار...... مانی...... وہ......'' اسے کافی آگے فیروز کی کار نظر آ گئی۔

''اس قدر رش میں کتنی تیز ڈرائیو کررہے ہیں۔ آپی...... آپ خود کو سنبھالیں پلیز۔'' وہ مرد تھا اس لیے اپنے اعصاب پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ کومل جیسی کمزور دل اور کمزور اعصاب کی لڑکی کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہورہا تھا۔ مین روڈ تھا اور وقت بھی رش کا تھا۔ شدید ٹریفک سے کار کو تیز رفتاری سے نکالنا خاصا مشکل کام تھا۔

''آپ گھبرائیں مت، وہ گھر کی طرف ہی جارہے ہیں۔'' مانی ساتھ ساتھ اسے تسلی دے رہا تھا۔

''آپ ایسا کریں کہ انہیں کال کرلیں۔'' مانی نے اپنا موبائل سیل اسے تھمایا۔ مانی کی کار کے آگے ایک بڑا سا ٹرک آ گیا تھا، جس کی وجہ سے فیروز کی کار چھپ گئی تھی۔ کومل نے لرزاں انگلیوں کے ساتھ اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نمبر ڈائل کیے۔ سیل کچھ دیر بجتا رہا پھر کسی نے اسے ریسیو کرلیا۔

''ہیلو۔'' فیروز کی سنجیدہ آواز پر اس کا دل دھڑکا۔

''فون مت بند کیجیے گا۔ میری بات سنیں۔'' کومل نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا مگر فون ڈسکنیکٹ ہوگیا تھا۔ اس نے بیچارگی سے مانی کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دیتے ہوئے دوبارہ فون ٹرائی کرنے کو کہا۔ کومل نے نمبر پھر ملایا۔ اس بار بیل بجتی رہی اور اس سے پہلے کہ وہ دلبرداشتہ ہوکر فون رکھتی، رابطہ ہوگیا۔

''ہیلو فیروز......'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''جی...... دیکھیں...... ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ آپ کون؟'' دوسری طرف سے کسی انجانی مردانہ آواز پر اس کے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔

''کیا...... کون...... کون بات کررہا ہے؟'' اس کے حلق سے چیخ کی صورت آواز نکلی۔

''میں ٹریفک سارجنٹ ہوں۔ آپ جن کی بات کررہی ہیں وہ شدید زخمی ہیں۔ میں......'' دوسری طرف سے نجانے کیا کہا جارہا تھا مگر اسے ہوش کب رہا تھا۔ ابھی کچھ سیکنڈ پہلے تو وہ اس سے بات کررہی تھی اور اب کوئی اسے فیروز کے

ایکسیڈنٹ کی خبر دے رہا تھا...... صرف چند سیکنڈوں میں......وہ شدید جھٹکے کے عالم میں مانی کی صورت دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' مانی نے پریشانی سے اسے دیکھا اور فون سیل اس کی جھولی سے اٹھایا جو کہ اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

''ہیلو...... جی...... جی وہ میرے بہنوئی ہیں...... جی......مر گئے ہیں۔'' مانی کے حواسوں نے یک دم ہی جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پیر بریکس پر پڑے جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ کار پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کے پیچھے آنے والی گاڑی کی زوردار ٹکر سے اس کی گاڑی بے قابو ہو کر آگے ٹرک سے جا ٹکرائی اور نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ٹرک بھی ریورس ہوا تھا۔ دونوں کے منہ سے چیخیں نکلی تھیں پھر کومل کی آنکھیں بند ہونی شروع ہو گئیں۔ ڈوبتے ہوئے ذہن میں صرف ایک فقرے کی بازگشت تھی۔

''مر گئے ہیں۔''

❁......❁......❁

''دادو......'' نعمان کے سفید ہوتے چہرے کو دونوں دادا پوتے نے تشویش ناک نظروں سے دیکھا۔

''کیا بات ہے نعمان؟'' کسی انہونی سے دادو کا دل ڈوبا۔

''ابھی ابھی انجانے نمبر سے خبر آئی ہے کہ فیروز کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے...... وہ نہیں رہا۔'' اس نے لب کاٹتے ہوئے بہ مشکل کہا۔ خبر تھی یا بم دھماکہ، دادو تو بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے، حسن نے سن ہوتے ہوئے ذہن کے ساتھ یہ بری خبر سنی۔

''مائی گاڈ......اور کومل کہاں ہے؟'' اسے یک دم خیال آیا۔

''مانی اور کومل میری کار لے کر نکلے تھے۔ کومل گھر جا رہی تھی مگر......''

''مگر کیا؟'' حسن کے اعصاب چٹخنے لگے۔

''ان کا بھی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' اس نے اطلاع دی۔

''کیا......! وہ ٹھیک تو ہے؟'' حسن نے آگے بڑھ کر نعمان کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

''مانی اور کومل کو ہاسپٹل لے جایا گیا ہے۔ ایکسیڈنٹ تو مائنر تھا مگر فیروز کی ڈیتھ کی خبر نے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچایا ہے اور ڈاکٹر نے مانی کو بتایا تھا کہ وہ پریگنینٹ تھی۔'' نعمان نے سر جھکاتے ہوئے بہت دکھ سے کہا۔

''او میرے اللہ...... تو کیا؟'' حسن نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ نعمان نے نہایت تاسف سے اسے دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔ حسن نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو زور سے رگڑا۔

''بڑا کٹھن وقت آن پڑا ہے دادو، ہمت رکھیں، یہ اچھا ہے کہ ننھی بے ہوش ہے مگر...... گھر میں یہ بری خبر سنانے کے لیے ہم مردوں کو ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ برا وقت آ پڑا ہے۔'' نعمان نے دادو کے شانوں پر ہاتھ کا دباؤ ڈالا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ نعمان نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

''حسن......خود کو سنبھالنا ہوگا یار یہ خبر تمہیں سنانی ہے۔'' نعمان نے کہا تو وہ لب بھینچتا ہوا کھڑا یہ سوچنے لگا کہ خوشی کے اس ماحول میں اتنی بری خبر کیسے سنائے گا۔

❁......❁......❁

لمحوں میں ہنستا بستا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔

امام کا ولیمہ ملتوی کر دیا گیا۔ وہ آہ و بکا ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ صنم ہاسپٹل میں تھی کومل کے پاس، مانی کو بھی معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بہادر مرد تھا، اسی لیے اپنے اوپر گزرنے والی اس قیامت کو جھیل گیا۔ کومل ہنوز بے ہوش تھی۔ امو کو بھی اطلاع دے دی گئی تھی مگر ان سے یہ صدمہ برداشت نہ ہوا تھا۔ اس گھر سے بہ یک وقت دو جنازے نکلے تھے۔ ایک فیروز بخت کا اور دوسرا امو کا...... خوشیاں اس طرح تاریک بھی ہو جاتی ہیں جو کہیں کبھی پڑھا تھا آج آنکھوں سے دیکھ لیا۔

وہ نہایت آزردگی سے شیشے کی دیوار کے پار سفید چادر میں لپٹے اس کے ساکت وجود کو دیکھ رہا تھا۔ آج فیروز بخت کو گزرے چوتھا روز تھا اور اسے یہاں ہاسپٹل میں آئے بھی

چوتھا ہی دن تھا۔ ان چار دنوں میں جیسے اس پر سے قیامت صغرا چالیس مرتبہ گزری تھی۔ فیروز اور امو کو مٹی کی تہوں تلے دفناتے ہوئے اس نے کبھی خواب میں بھی اس تکلیف دہ عمل سے گزرنے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اس نے کفن میں سے جھانکتے ہوئے فیروز بخت کے خوب صورت چہرے کو بے حد تکلیف سے دیکھا تھا۔

یہ چہرہ اس کو عجیب سی ندامت میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ کومل کے پاس ہاسپٹل میں ہی تھا۔ مس کیرج کی وجہ سے اس کا بہت خون ضائع ہوگیا تھا۔ ڈاکٹروں کی کوششوں کی وجہ سے وہ زندہ بچ تو گئی تھی مگر اس کا ذہن ابھی تک فیروز کی موت کے صدمے میں تھا۔ اس کا سکتہ کبھی بھی ٹوٹ سکتا تھا۔ حسن سب کچھ بھلائے ہوئے تھا۔ اس وقت بھی وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ تائی جان نے اسے کومل کے سامنے یا پاس جانے سے منع کر دیا تھا۔

''وہ عدت میں ہے۔'' ان کا عذر سن کر وہ تپ گیا۔

''آدھی مردہ ہے وہ...... زندہ رہے گی تو عدت گزارے گی ناں۔'' وہ کسی کی نہ سن رہا تھا نہ مان رہا تھا۔ دیوانہ بنا ہوا تھا۔ کومل کے گھر والوں پر دہری قیامت گزری تھی۔ دادی تو بستر سے ہی لگ گئی تھیں۔

''نظر کھا گئی بچی کو، کیسا حسین جوڑا تھا دونوں کا۔'' وہ روتی رہتیں۔ عنایہ بھی چپ تھی، اس کے کس بل بھی نکل گئے تھے۔ ایک قیامت تھی جس نے اس کے خود غرض دل کو ہلا دیا تھا۔

''حسن......'' مانوس آواز پر وہ چونکا۔

''محب......'' سامنے محب کو دیکھ کر وہ اس سے لپٹ گیا۔ ضبط کے بندھن ٹوٹے تو اندر کا غبار آنسوؤں کی صورت پلکوں سے بہتا چلا گیا۔

''مجھے بہت بعد میں اطلاع دی تو نے...... بہت افسوس ہوا یار۔'' اس نے کہا۔

''کب آئے تم؟'' حسن نے پوچھا۔

''سیدھا ایئرپورٹ سے آ رہا ہوں۔''

''جمائمہ اور ندا کیسی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ندا کو میں نے آنے سے روک دیا تھا، اچھی ہیں دونوں...... بہت افسوس کر رہی تھیں۔ کومل کیسی ہے؟'' اس نے شیشے کی دیوار کے پار زردیوں میں ڈوبی کومل کو دیکھا۔

''تمہارے سامنے ہے۔ نہ زندوں میں نہ مردوں میں ہے...... میں بہت گلٹی فیل کر رہا ہوں یار...... نہ میں اس روز ندا سے وہ سب کچھ کہتا اور نہ ہی یہ سب ہوتا...... نہ ہی فیروز جاتا نہ ہی کومل اس حال کو پہنچتی...... سب میری غلطی ہے۔'' وہ انگلی اور انگوٹھے سے اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔

''سب قسمت کا کھیل ہے یار۔ اگر فیروز وہ سب نہ سنتا تب بھی اس کی موت کا وقت وہی مقرر تھا۔ یہ حادثہ کومل کی زندگی میں ہونا تھا۔ تم خود کو الزام مت دو۔'' وہ نرمی سے اسے سمجھانے لگا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے بینچ پر بیٹھ گئے تھے۔

''ایکسکیوز می سر۔'' نسوانی آواز پر حسن اور محب نے چونک کر سر اٹھایا۔ جس نرس کی ڈیوٹی کومل کے ساتھ تھی وہ سامنے کھڑی تھی۔

''یس سسٹر۔'' حسن بے اختیار کھڑا ہوا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

''پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلانے جا رہی ہوں۔ آپ ان کے پاس آ جایئے۔'' وہ کہہ کر حسن کا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گئی۔ حسن نے محب کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھوں کے اشارے سے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے اسے اندر جانے کا کہا۔ حسن دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر کی طرف بڑھا۔ کومل چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سفید چادر اس کے پورے وجود کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔

''کومل......'' حسن نے ہمت کر کے اسے پکارا مگر اس کے وجود میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ حسن گھبرا کر آگے بڑھا۔

''کومل۔'' اس نے جھک کر اسے پھر آواز دی۔ اس بار کومل نے اپنی نگاہیں اس کی آواز کی سمت کیں۔ اس قدر خالی تھیں اس کی آنکھیں، حسن کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

''کیسی ہو؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ وہ خاموش رہی۔ بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”کچھ بولو...... کچھ کہو۔“ وہ اس کی چپ پر تڑپ اٹھا۔ کومل بغیر کچھ کہے بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حسن نے کرب سے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

”پانی پیو گی؟“ وہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ بولے۔ کچھ بھی مگر وہاں تو سناٹا تھا، ویرانی تھی، وہ کیا بولتی۔ اتنے میں ڈاکٹر نرس کے ہمراہ آ گیا۔

”آپ پلیز کمرے سے باہر چلے جائیں۔“ نرس نے کہا تو بادل نخواستہ وہ باہر کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا...... سب ٹھیک ہے؟“ محب بے چینی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ خاموش رہا۔ بس کومل کی طرف دیکھتا رہا۔ ڈاکٹر اسٹیتھ اسکوپ لگائے اس پر جھک گیا تھا۔

”گھر پر اطلاع دے دوں؟“ محب نے پوچھا تو اس نے سر اثبات میں ہلایا۔ محب کاریڈور میں آگے بڑھ گیا۔ حسن بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھتا رہا تھا۔

❁......❁......❁

کومل کو چاند منزل جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ اوپر والے کمرے میں اپنی عدت کے دن گزار رہی تھی۔ ڈاکٹرز کی کوششوں سے وہ کوما سے نکل آئی تھی مگر جسمانی کمزوری بہت تھی۔ وہ چپ چاپ عبادت میں لگی رہتی۔ تھک جاتی تو بیڈ پر لیٹ کر نجانے کیا کچھ سوچنے لگتی۔ اس کے پاس اگر کوئی آ جاتا تو وہ خاموش رہتی تھی۔ اگلا بندہ بول بول کر خود ہی تھک کر چلا جاتا۔ چاند منزل کی کومل چہکنا بھول گئی تھی اور چاند منزل کے باسی اس کی آواز سننے کو ترس گئے تھے۔ عدت ختم ہونے میں صرف چھ گھنٹے باقی تھے۔ دادو اپنے کمرے میں آرام دہ کرسی پر نیم راز نجانے کس سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دادی ان کے قریب ہی صوفے پر بیٹھی اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔

”ہنستی بستی لڑکی کو نظر کھا گئی۔ ہنسنا درکنار، مسکرانا بھی بھول گئی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ کچھ حرکت کرتی ہے، بس جب بھی جاؤ بت بنی نظر آتی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ اندر آتے ہوئے حسن کے قدم وہیں جم گئے تھے۔

”کچھ کم تو نہیں ہوا بچی کے ساتھ...... سہاگ اجڑ گیا، کوکھ سونی ہو گئی۔ بسا بسایا گھر تھا، اب ویرانیاں ڈیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ فیروز بیچارے کا تو نشان ہی مٹ گیا۔ اس کی تو نسل ہی ختم ہو گئی۔“ دادو نے آنکھوں کے بھیگے گوشوں کو آہستگی سے صاف کیا۔ حسن نے سر جھکا کر آنسوؤں کو اندر دھکیلا۔

”اس کے ملنے والے یہاں آتے ہیں تعزیت کے لیے، اس کا تو خاندان بھی مختصر ہے۔ گنتی کے چند لوگ ہیں اور وہ بھی ملک سے باہر...... یہاں تو شاید اس کی ایک خالہ ہی ہیں، وہ بھی ایبٹ آباد میں ہوتی ہیں۔ فوج میں ہے ان کے شوہر، سوچتا ہوں، ننھی عدت پوری کر لے تو فیروز کے گھر اور کاروبار کو دیکھے...... اب اسے ہی سب سنبھالنا ہے۔“ دادو نے کہا۔

”بچی کو روگ لگ گیا اور آپ کو کاروبار کی پڑی ہے۔ حد کرتے ہیں۔“ دادی جان ناراضی سے بولیں۔

”روگ نہ لگے، اسی لیے چاہتا ہوں کہ وہ مصروف ہو جائے...... عدت تو آج پوری ہو جائے گی۔ بس دو ایک دن میں ننھی کو گھر سے نکالنا ہے...... اس کے لیے یہ سب بہت ضروری ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”مگر وہ معصوم ہے، انجان ہے، کیسے دیکھ پائے گی سب؟ نہ تجربہ، نہ سمجھ، بچوں کا کھیل ہے کیا اتنا بڑا کاروبار سنبھالنا؟“ انہوں نے کہا۔

”سب سوچ لیا ہے میں نے۔ اکیلا تھوڑا ہی چھوڑیں گے اسے، حسن اس کے ساتھ رہے گا، مقصد یہ ہے کہ ننھی خود کو ضائع نہ کرے، باقی وہ سمجھدار بہت ہے، صرف موقع چاہیے اسے، قدرت نے اسے زخم دیا ہے تو مرہم بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوگا۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولے، حسن ان سے جو کہنے آیا تھا وہ بھول گیا۔ دادو کی باتوں کی بازگشت میں وہ واپس پلٹ گیا تھا۔

❁......❁......❁

محب کچھ روز رک کر واپس چلا گیا تھا۔ حسن نے اس عرصے میں ندا سے فون کر کے معافی مانگتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے شادی کر لے، اپنی خود غرضی کی بھینٹ وہ اسے نہیں چڑھا سکتا، ندا اس کی سچی دوست تھی، وہ واقعی اس سے محبت کرتی تھی، اس بار بھی اس نے حسن کی

بات مان لی تھی۔
کومل کی عدت ختم ہونے کے بعد وہ اس کے پاس اوپر کمرے میں آیا تھا۔ سیاہ لباس اور دوپٹے کی اوٹ میں وہ آخری راتوں کے زرد اداس چاند کا عکس لگ رہی تھی۔ اس نے ادھ کھلے دروازے پر دستک دی۔
"اندر آسکتا ہوں؟" کومل نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ اس وقت بالکنی میں ریلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ حسن کو وہ کسی مصور کا شاہکار لگ رہی تھی۔ اداس غم زدہ چہرہ، بجھی ہوئی آنکھیں۔ چند دنوں میں اس کی صحت بہت گر گئی تھی۔ وہ بہت دبلی ہوگئی تھی۔ صحت مند چہرہ مرجھا گیا تھا۔ دودھیا سرخی مائل رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ وہ اس کو اتنے دنوں بعد دیکھ رہا تھا، اس کے دل کو کچھ ہوا۔
"میں نے ایک بار تمہیں کہا تھا کہ سیاہ رنگ تم پر بہت اچھا لگتا ہے تم نے تو اس رنگ کو مستقل اپنا لیا۔" وہ کہتا ہوا آگے بڑھا، کومل نے رخ واپس باہر کی طرف موڑ لیا۔
"اس کمرے میں کب تک بند رہنے کا ارادہ ہے؟ اب نکلو یہاں سے۔" وہ چند قدم آگے بڑھا۔
"کومل...... مجھ سے بات کرو۔" حسن نے اس کے قریب پہنچ کر کہا، وہ گم صم باہر دیکھتی رہی۔
"کچھ تو بولو۔ کچھ بات کرو، زمانہ گزر گیا تمہاری آواز سنے۔" حسن نے ایک دکھ بھری نگاہ اس پر ڈالی۔
"نیچے چلو، سب کے ساتھ بیٹھو، اس کمرے میں تو میرا دم گھٹ رہا ہے، تم نے نجانے اتنے دن کیسے گزار دیئے۔" اس نے بے حد نرمی سے کہا۔ کومل نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے ہمیشہ کومل کو اپنا سر اٹھانا پڑتا تھا کیونکہ اس کا قد کومل سے لمبا تھا۔ وہ لیمن کلر کی شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس تھا۔ وجیہہ چہرے پر سیاہ مونچھوں کی وجہ سے اس کے چہرے کی کشش میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس کی سیاہ گہری آنکھیں رت جگے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی سیاہی سے اسے فیروز کی آنکھوں کا سنہرا پن یاد آنے لگا تھا۔ وہ اسے فیروز کی یاد دلا رہا تھا۔ عجیب بات تھی، جب وہ فیروز کو دیکھتی تھی تو حسن اسے یاد آتا تھا اب وہ حسن کو دیکھ رہی تھی تو فیروز اس کی یادوں سے باہر نکل نکل کر جھانک رہا تھا۔
"مجھے......" اس کے لبوں نے جنبش کی، حسن چونکا۔
"لگتا ہے کہ فیروز اور حسن آئینے کے دو رخ ہیں۔ جیسے کسی تصویر کے دو پہلو......" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ حسن خاموش رہا مگر اس کے حواس پوری طرح چوکنا تھے۔ کومل اس سے نہیں، جیسے خود سے مخاطب تھی۔
"حسن کو...... اپنی شریک حیات میں جو جو خوبیاں چاہیے تھیں، فیروز کو بھی وہی کچھ اپنی بیوی میں چاہیے تھا۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔
"عجیب بات ہے ناں...... فیروز، حسن، حسن، فیروز جیسے ایک ہی شخص کے دو روپ...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟" وہ خود سے سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی۔ حسن لب بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے کچھ کہتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ پتا نہیں وہ کیا کر دے مگر اس کی کیفیت کو توڑنا ضروری تھا۔
"کومل......" اس نے ہمت کر کے اسے آواز دی۔ کومل نے ساکن پلکوں تلے خاموش نگاہوں سے اسے دیکھا۔
"کوم...... ل...... ہوش میں آؤ۔" اس نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ کومل کے لاشعور نے جھٹکا کھایا پھر اس کا ذہن بیدار ہوا۔
"آپ......" وہ جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی۔ حسن نے اللہ کا شکر ادا کیا۔
"کیوں آئے ہیں آپ؟ میں عدت میں ہوں، جانتے نہیں؟" اس نے حسن کی طرف سے رخ موڑ لیا۔
"تمہاری عدت ختم ہوئے ایک دن گزر گیا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔
"چلے جائیں آپ، مجھے آپ کی صورت بھی نہیں دیکھنی۔" وہ غصے سے بولی۔
"میں نے کیا کیا ہے کومل، مجھ سے کیوں خفا ہو؟" وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔
"کیا کیا ہے؟" کومل ایک جھٹکے سے مڑی۔
"آپ نے میرے ساتھ وہ کیا ہے جو دشمن بھی نہیں

کرتا۔'' وہ چیخ پڑی۔
''اللہ کی قسم کومل...... مجھے نہیں پتا تھا کہ فیروز اس روز میری باتیں سن رہا ہے، میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب ہوجائے گا، میں تو تمہیں غموں سے بچانا چاہتا تھا، مجھے تو تمہاری ہنسی، تمہاری مسکان پیاری تھی، یہ اجڑا ہوا روپ، یہ حالت، میں تو تمہیں اس روپ میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔'' حسن نے بے اختیار کہا۔
''فیروز کو کیسے یقین دلاؤں...... کیسے یقین دلاؤں کہ میں بے وفا نہیں تھی...... وہ تو مجھے بے وفا سمجھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کررو پڑی۔
''جسم کی قید سے رہائی پالینے کے بعد اس کی روح پر ساری حقیقت کھل گئی ہوگی کومل، تم خود کومت سلگاؤ۔'' حسن نے نرمی اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ کومل کا رونا چیخوں میں بدل گیا، وہ روتے ہوئے زمین پر دوزانوں بیٹھتی چلی گئی۔
''میرا بچہ...... فیروز......'' اس کی چیخوں نے چاند منزل کے در و دیوار کو ہلا دیا تھا۔ رونے کی آواز نیچے تک گئی تھی پر کوئی اوپر نہیں آیا تھا سب جانتے تھے کہ اس وقت حسن اس کے کمرے میں ہے اور اس کے دکھ کی دوا کرنے کی کوشش کررہا ہے۔
سب چاہتے تھے کہ وہ پہلے جیسی ہوجائے گو کہ اس کا غم بہت بڑا تھا پر اس غم کے بوجھ کے ساتھ ساری زندگی تو نہیں گزاری جاسکتی تھی۔
''میرا بچہ...... حسن مجھ سے فیروز کی آخری نشانی بھی چھن گئی۔'' وہ سسک رہی تھی۔
''میں فیروز کو یہ خوشی سنا کر منالیتی اس کے پیر پڑ جاتی اور اس نے موقع ہی نہیں دیا وہ تو ہر رشتہ مجھ سے چھین کر اپنے ساتھ لے گیا اموجان کو بھی۔'' اس کے رونے میں شدت آتی جارہی تھی۔ اتنے عرصے میں وہ شاید پہلی بار روئی تھی۔
''یہ اللہ کے کام ہیں کومل...... اس میں ہماری مرضی کہاں چلتی ہے، ہم بے بس ہیں اس کے آگے اور شاید یہ لوگ اتنی ہی عمر لکھوا کر آئے تھے۔'' حسن نے کہا تو وہ اس کو دیکھنے لگی۔

''کتنی آسانی سے آپ نے سب بات اللہ کی مرضی پر ڈال دی آج سے چھ سال پہلے آپ یہیں بیٹھ کر میری محبت کا خون کر گئے تھے اور آج آپ نے مجھ سے سب چھین لیا صرف آپ نے حسن۔'' وہ غصہ سے اس کی طرف اشارہ کرکے بولی۔ حسن اس کو دیکھنے لگا وہ کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی تھی۔ اس کو اجاڑنے میں اس کا ہی تو ہاتھ تھا اور یہ بات وہ خود بھی جانتا تھا اور دادو اور محبّ کے سامنے اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا۔ پر اب جب وہ کہہ رہی تھی تو دل کو دکھ پہنچ رہا تھا۔
''عنایہ نے بے شک میرے جذبات جگائے تھے اور مجھے آپ کی طرف متوجہ کیا تھا پر میری محبت میں کھوٹ نہیں تھا، میں نے پورے دل سے آپ کو چاہا تھا اور اپنا دل آپ کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت آپ مجھے بچی کہہ کر ٹھکرا گئے تھے اور آج چھ سال بعد آکر جب اپنی شادی کی بات کرتے تمام سچ قبول کیا تو انجانے میں ہی سہی میرا گھر برباد کرگئے۔ میری خوشیوں کو نگل گئے آپ حسن۔ آپ قاتل ہیں میرے فیروز کے۔ اموجان کے اور میرے بچے کے۔'' وہ اس کا گریبان پکڑ کر اس کو جھنجوڑ رہی تھی۔
''میں مانتا ہوں کومل کہ میں تمہارا گناہ گار ہوں تم جو چاہو مجھے سزا دو۔'' وہ اس کو بغور دیکھتے بولا۔
''لیکن میرے کیے کی سزا خود کو اس کمرے میں قید کرکے مت دو، میں تمہاری ہر سزا برداشت کرلوں گی تم کہو گی تو یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا اور پھر کبھی واپس نہیں آؤں گا۔ پر یہ برداشت نہیں کروں گا کہ میری وجہ سے تم خود کو سزا دو اور تمہاری وجہ سے چاند منزل کے مکین گھٹ گھٹ کر جئیں۔''
''میری وجہ سے۔'' وہ ناگواری سے بولی۔
''ہاں تمہاری وجہ سے کومل کیونکہ سب تم سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ تمہاری خاموشی سب کو کھارہی ہے۔ تم اس کمرے سے باہر نکل کر دیکھو تو تمہیں اندازہ ہو کہ کھویا صرف تم نے نہیں ہے یہاں رہنے والوں نے بھی بہت کچھ کھویا ہے اور میں نے بھی۔'' وہ قدرے توقف کے لیے خاموش ہوا تو وہ فوراً بولی۔

"آپ نے کیا کھویا؟"

"چھ سال...... چھ سال کھوئے ہیں میں نے جب مجھ پر محبت نے در وا کیے اس وقت تم کسی اور کی ہو چکی تھی اور فیروز بخت نے اپنی محبت سے اپنا تو کرلیا تھا لیکن میں کسی کو اپنا بھی نہیں سکا میرے دل تک کوئی آ ہی نہیں سکا۔ تم تو اب رو رہی ہو اور میں پچھلے چھ سال سے محبت کے لیے ترس رہا ہوں، رو رہا ہوں، کرلا رہا ہوں اور سب کے سامنے مضبوط بنا بھی کھڑا ہوں۔ مرد ہوں ناں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ رخ موڑ گیا اور فوراً آنسو صاف کرکے اس کو دیکھنے لگا۔ وہ گم صم کھڑی اس کو دیکھ رہی تھی۔

"کچھ لوگ اپنی اتنی ہی عمر لکھوا کر آتے ہیں اور پھر کوئی بات ان کی اس دنیا سے جانے کی وجہ بن جاتی ہے۔ میں نہ ہوتا تو کوئی اور یہ بات کہتا یہ بھی ہوسکتا تھا کہ تمہاری شادی مجھ سے ہو جاتی اور پھر میں اس حادثے کا شکار ہو جاتا۔"

"ہونے کو کچھ بھی ہوسکتا تھا یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ آپ واپس ہی نہ آتے۔" وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولی۔

"تو اب واپس چلا جاتا ہوں۔" وہ فوراً بولا۔

"اس سے کیا ہوگا کیا فیروز واپس آ جائیں گے؟" وہ اس کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں پر جب تک میں تمہارے سامنے رہوں گا تمہیں یہ گلٹ تو رہے گا ناں کہ میری وجہ سے تمہاری خوشیاں چھن گئیں۔"

"آپ کے جانے سے بھی یہ احساس رہے گا لیکن تائی جان سے برداشت نہ کر پائیں اس لیے میں ہی یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ فیروز کے گھر وہاں کم سے کم اس کی یادیں تو ہوں گی۔" وہ جانے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔

"اور میں؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا جب ہی لب بھینچ گیا۔

"معاف نہیں کرو گی مجھے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے قدرے توقف کے بعد بولا۔

"کیوں کروں معاف؟"

"اپنی اس محبت کے لیے جو کبھی تم نے مجھ سے کی تھی۔" اس نے ایک آس سے کہا۔

"وہ محبت تو......"

"خدارا یہ مت کہنا کہ وہ مر گئی ورنہ میں بھی فیروز کی طرح......" وہ اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ گئی تھی۔

"تمہیں میری فکر تو ہے۔" وہ آزردگی سے بولا۔ کومل نظریں چرا گئی نجانے کیوں دل ایک دم خوف زدہ ہو گیا تھا۔ شاید پہلے محبت کو کھو چکی تھی۔ دوبارہ کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے یا پھر دل میں اب بھی کہیں اس کی محبت باقی تھی وہ خود نہیں سمجھ پائی تھی۔

"کیا تم نے مجھے معاف کردیا کومل۔" اس نے اسے بغور دیکھ کر پوچھا۔ اس نے صرف سر ہلایا۔ حسن کے کاندھوں سے وزنی بوجھ سرک گیا تھا۔ وہ خود کو ہلکا محسوس کررہا تھا۔

"آؤ نیچے چلتے ہیں سب انتظار کررہے ہیں۔" حسن نے کہہ کر آگے قدم بڑھائے تو وہ اس کے ساتھ چل دی، وہ جانتا تھا کہ جہاں کومل نے اس کو معاف کیا ہے وہیں وہ اس کے دل میں ایک بار پھر اپنی محبت سے جگہ بنالے گا کیونکہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے جلد بازی سے محبت کے معاملات خراب ہی ہوتے ہیں اور چاند منزل کی خوشیاں بھی تو اسی نے ہی واپس لانا تھیں۔

نیچے سب ان دونوں کا انتظار کررہے تھے۔ آخری سیڑھی پر رک کر حسن نے کومل کو دیکھا، وہ بھی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ذرا سا مسکرائی تو حسن کے اندر تک طمانیت اتر گئی تھی۔ وہ کومل تھی نرم گرم جذبوں سی، لاشعوری طور پر جو کچھ ہوا وہ سب ایسا ہی ہونا تھا۔ بہار کی آمد میں دل پھر ایک ہو جائیں گے۔ مٹی پھر نم ہو جائے گی۔ چاند پھر مسکرائے گا۔

قسط نمبر اٹھائیس

گزشتہ قسط کا خلاصہ

فاریہ دادی کے ساتھ رضیہ بی بی سے ملنے آتی ہے تو صبیحہ بیگم رضیہ بی بی کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں اور رضیہ ان دونوں کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہیں اور پھر ان دونوں کی بات چیت سے فاریہ کو مزید کئی رازوں کے بھید مل جاتے ہیں اور سب سے حیران کن بات یہ کہ اس بند کمرے میں جو تصویر ہے وہ فاریہ کا سوتیلی مماں نیلم کی ہوتی ہے اور وہ ایک طوائف ہوتی ہے۔ صبیحہ اور رضیہ کے بحث کے دوران فاریہ یہ بات جان جاتی ہے کہ نیلم حویلی کی سازش کا شکار ہو کر بدکردار ٹھہرائی جاتی ہے جس کی سزا اس کو ملتی ہے اور اس کے ساتھ کئی اور بے گناہ بھی مرے جاتے ہیں جس میں رضیہ کا شوہر اور حماد کی ماں بھی۔ ماریانہ اپنی ماں کو اچانک دیکھ کر بہت خوش ہو جاتی ہے اور گرینی بھی ان کا پرجوش استقبال کرتی ہیں اور ان کو ماریانہ کے رشتہ طے کرنے کا بتا دیتی ہیں اور رات کے کھانے پر فیروز حسن سے ملاقات کروا دیتی جن سے مل کر صوفیہ کو خوشی ہوتی ہے اور شادی کے باقی معاملات طے کر لیے جاتے ہیں۔ گھر آ کر فاریہ دادی سے الجھ پڑتی ہے اور دادی اس سے بحث نہیں کر پاتیں اور خاموش ہو جاتی ہیں اور اکیلے میں دلاور سے کہہ دیتی ہیں کہ جلد فاریہ کو رخصت

کر دیا جائے۔ دوسری طرف قمر جہاں فاریہ کو بتا دیتی ہیں کہ دادی نے دلاور سے کہا ہے کہ اس کا رشتہ جلد از جلد طے کر کے رخصت کر دیا جائے جس پر وہ متنفر ہو جاتی ہے اور قمر جہاں کو ادھوری بات بتا کر حماد سے رابطہ کرنے کا کہہ کر ایک آخری ملاقات رضیہ بی بی سے کرنا بتا دیتی ہے۔

اب آگے پڑھئے

۞......۞......۞

رضیہ بی بی کے چہرے پر غمناک تاثرات تھے۔ وہ قسمت سے ہار کے ساکت بستر پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ جس بد نصیبی سے وہ آج تک بھاگتی رہی تھیں۔ وہ بد نصیبی آج ایک بار پھر کسی کالی بلی کی طرح ان کا راستہ کاٹ گئی تھی۔ ان کا دل بری طرح سے کانپ رہا تھا۔ آج صبیحہ بیگم کو اچانک سامنے دیکھ کر ان کی روح کانپ گئی تھی۔ کیا کیا نہیں بیتا تھا ماضی میں...... وہ سب کسی فلم کی مانند ان کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگا تھا۔

''کرمے...... کیا بات ہے۔'' پریشان کیوں بیٹھا ہے میرا لعل۔'' کرم خان خاموشی سے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ رضیہ سرونٹ کوارٹر میں داخل ہوئیں تو اس کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر چونک کر پوچھنے لگی تھیں۔

''اماں...... چھوٹے صاحب سے اب ڈر لگنے لگا ہے۔'' کرم خان نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔

''ڈر لگنے لگا ہے...... مگر کیوں؟ ایسا کیا ہوا ہے جو تمہیں چھوٹے صاحب سے ڈر لگنے لگا ہے۔'' رضیہ بولی تھیں۔

''چھوٹے صاحب بہت عجیب سا برتاؤ کر رہا ہے۔ بات بات پر غصہ کرتا ہے۔ پہلے نیلم بی بی کا ہر کام میرے سپرد کرتا تھا۔ مگر اب......'' بات ادھوری چھوڑ کر شش و پنج میں تھا کہ آیا یہ بات بتائے یا چپ رہے۔

''مگر اب کیا کرمے...... سیدھی سیدھی بات بول، پہیلیاں نہ بجھوا۔'' رضیہ بی بی اس کے ساتھ بیٹھتی پریشانی سے استفسار کر رہی تھی۔

''اب نیلم بی بی سے بات بھی کروں تو آنکھیں لال کر لیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرا خون پی جائے گا۔'' کرم خان عجب کشمکش میں گھرا ہوا تھا۔

''اللہ نہ کرے کہ چھوٹا صاحب کبھی تیرے خون کا پیاسا ہو۔'' رضیہ بی بی کا دل بری طرح دہل کر رہ گیا تھا۔

''کچھ تو ہے اماں...... چھوٹے صاحب مجھ سے بڑا ناراض ناراض سا رہنے لگا ہے۔''

''کرمے تو کیسی عجیب سی باتیں کر رہا ہے۔ چھوٹا صاحب تو تجھ پر، تیرے ابا پر، بڑا اعتبار کرتا ہے پھر وہ تجھ سے ناراض کیوں ہوگا؟'' رضیہ بی بی الجھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔

''اماں تو خود بتا...... نیلم بی بی جہاں اپنے کپڑے سلنے کو دیتی ہیں وہ جگہ تمام ملازموں میں صرف مجھے معلوم ہے۔ ہمیشہ میں ہی درزی سے ان کے کپڑے لے کر آتا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی میں کپڑے لے کر آیا مگر جب نیلم بی بی تک کپڑے پہنچانے کے لیے ان کے کمرے میں جانے لگا تو چھوٹے صاحب نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔'' کرم خان مضمحل سے انداز میں تفصیل سنانے لگا تھا۔

''او کرمے...... میرے لعل...... تو اتنی سی بات پر دل کیوں خراب کر رہا ہے۔ جانتا تو ہے چھوٹا صاحب ایسا ہی ہے۔ پل میں تولہ، پل میں ماشا...... غصہ تو جیسے اس کے ناک پر دھرا رہتا ہے۔ کہیں بھی، کسی سے بھی لڑ پڑتا ہے۔ مزاج بگڑا ہوا ہوگا اس کا اور تو اس کے سامنے آگیا ہوگا بس اسی لیے غصہ کر گیا تجھ پر۔'' رضیہ بی بی اندازے لگاتی اسے سمجھانے لگی تھیں۔

''نہیں اماں...... بات کچھ اور ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے اماں...... جو مجھے نظر آرہی ہے، مگر تجھے سمجھ میں نہیں آرہی۔'' کرم

خان جھنجلا کر کہتا وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تھا۔
''کرمے...... بات سن...... جا کہاں رہا ہے؟'' رضیہ فکرمندی سی پکارتے ہوئے اس کے پیچھے نکل آئی۔ باہر نکلتے ہی اس کے قدم ایک دم رک گئے۔ کرم خان، خان کے ساتھ کھڑا باتیں کررہا تھا۔
''چل جا اپنے باپ کے پاس...... تیرے بھیجے میں جو بات جڑ پکڑ کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ ہی سمجھا کر باہر نکال سکتا ہے۔'' رضیہ بی بی دونوں باپ بیٹے کو ساتھ دیکھ کر مطمئن سی سر جھٹکتے ہوئے سرونٹ کوارٹر میں آگئی تھیں۔
''اے کاش...... کاش کرمے اس دن میں تیری الجھن، تیرے دل کی بات جان جاتی۔ جس گڑبڑ کی تو بات کررہا تھا وہ گڑبڑ پہچان لیتی۔ سارا دن بخت محل میں وقت گزارنے کے بعد بھی میں یہ نہ جان سکی کہ وہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے اور اگر جان لیتی تو میں تجھے بچالیتی کرمے، خود قربان ہوجاتی مگر تجھ پر آنچ بھی نہ آنے دیتی۔'' رضیہ بی بی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ یوں تو کرمے کا دکھ ان کے دل میں ناسور کی طرح پلتا رہا تھا مگر آج یہ ناسور انہیں بے پناہ اذیت دے رہا تھا۔
''رضیہ بی...... فاریہ بی بی آئی ہیں۔ آپ سے ملنے کا کہہ رہی ہیں۔'' وہ اذیتوں میں گھری بیٹھی تھیں کہ ملازم نے آکر انہیں اطلاع دی۔
''فاریہ آئی ہے...... !اب کیوں آئی ہے وہ؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے ملازم کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔
''معلوم نہیں جی...... کہتیں ہیں کہ آپ سے ملنا ہے۔'' ملازم لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔
''ہونہہ...... بھیج دو اسے میرے کمرے میں۔'' رضیہ بی بی نے تھکے ہوئے سے انداز میں کہا۔
''مجھے تم سے اب خوف محسوس ہونے لگا ہے فاریہ...... ایسا لگتا ہے جیسے تمہارے ہاتھ میں کسی آسیب زدہ کمرے کی چابی آگئی ہے اور تم اس خوفناک آسیب کو جس سے ہم سب اپنی جان بچائے بیٹھے ہیں اسے آزاد کرکے ہی چھوڑو گی۔'' وہ لرزتے دل کے ساتھ دل ہی دل میں فاریہ سے ہمکلام ہوئیں۔
''السلام علیکم !اماں بی۔'' فاریہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔
''وعلیکم السلام...... تم پر، تمہارے باپ کا راز تو فاش ہوگیا ہے۔ اب کیا جاننے کے لیے آئی ہو یہاں۔'' انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں فاریہ کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ فاریہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔
''مجھے اب آپ سے اپنے باپ کے ماضی کے بارے میں نہیں جاننا اماں بی۔ میں اب صرف اپنی ماں کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔'' فاریہ انہیں دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔
''تمہاری ماں سائرہ ایک نہایت شریف اور نیک عورت تھی۔ اس کی ذات سے شاید ہی کسی کو کوئی نقصان پہنچا ہو۔ وہ تو فیض ہی فیض تھی مگر قسمت نے اس کے ساتھ بھی بہت برا کیا بلکہ اس بخت محل میں رہنے والے ہر فرد نے جیسے کوئی عذاب بھگتا ہو۔ وہاں رہنے کا تاوان بھرا ہو۔''
''کیا وہ مجھ سے پیار کرتی تھیں؟'' فاریہ ان کی ساری باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی۔
''ہاں بہت زیادہ...... تم پر تو جان چھڑکتی تھی سائرہ بی بی۔ تم تو کل کائنات تھیں سائرہ بی بی کی...... میں تو سائرہ بی بی کی تم سے محبت کی خود گواہ ہوں۔'' رضیہ بی بی وہ وقت یاد کرتے ہوئے کھوئے ہوئے سے انداز میں بولیں۔
''میری ماں...... مجھ سے بہت پیار کرتی تھی پھر وہ مجھ سے جدا کیسے ہوئی، زندگی کیسے روٹھ گئی ان سے؟'' فاریہ کے لہجے میں رضیہ بی بی کو تڑپ سی محسوس ہوئی۔
''یہ میں نہیں جانتی فاریہ کہ سائرہ بی بی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔'' رضیہ بی بی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے جواب

دیا۔
"کیوں..... آپ کیوں نہیں جانتیں..... آپ وہاں رہتی تھیں پھر کیوں لاعلم ہیں آپ؟" فاریہ نے الجھ کر سوال کیا۔
"میں نے بخت محل چھوڑ دیا تھا اور پھر اس محل سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔" رضیہ بی بی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
"ہونہہ....." فاریہ مایوسی سے ہنکارا بھر کر رہ گئی۔ کچھ ثانیے تک ان دونوں کے درمیان خاموشی رہی پھر فاریہ نے ہی گفتگو کا دوبارہ آغاز کرنے میں پہل کی۔
"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں اماں بی....."
"اب تو حقیقت جان چکی ہو فاریہ..... پھر کیا کہنا چاہتی ہو؟" رضیہ بی بی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"آپ میری شادی حماد سے کرادیں اماں بی....." فاریہ نے ملتجیانہ نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تو رضیہ بی بی حیران سی اسے دیکھتی رہی تھیں۔

❁.....❁.....❁

"یہ گاؤن مجھ پر کیسا لگ رہا ہے ارسل؟" وہ انتہائی خوب صورت سے سفید گاؤن میں ملبوس خود کو دیوار گیر آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اشتیاق سے بھرپور سوال نے اس کے لبوں کا ساتھ چھوڑا ہی تھا کہ آئینے کی سطح پر ارسل کا مسکراتا ہوا عکس جھلملانے لگا۔ وہ وائٹ شرٹ اور بلیو جینز میں ملبوس تھا۔ ماریانہ کے حسین سراپے کو آنکھوں میں بسا کر دل میں اتار لینے کے بعد اس نے چہرے کے تاثرات سے ناپسندیدگی کا اشارہ کیا تھا۔
"نہیں..... یہ گاؤن بھی تمہیں پسند نہیں آرہا ارسل؟" ماریانہ شدید حیرت کے عالم میں پلٹ کر ارسل کو خفگی سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"اونہہ..... یہ گاؤن بھی مجھے تم پر بالکل بھی جچتا نظر نہیں آرہا۔ ایکچوئیلی تمہارے لیے برائیڈل گاؤن تمہاری شان کے مطابق ہونا چاہیے۔ جو بس دیکھتے ہی آنکھوں کو جچ جائے۔" ارسل چند قدم آگے بڑھ کر ماریانہ کے روبرو کھڑا ہوا۔ اس کی مسکراتی نگاہوں میں چھپی شرارت ماریانہ سے مخفی نہیں رہ سکی تھی۔
"اس طرح مت مسکراؤ ارسل..... میں جانتی ہوں تم مجھے تنگ کرنے کے لیے یہ سب کہہ رہے ہو۔" ماریانہ نے اس کی شرارت کو سمجھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔
"نو ڈاؤٹ..... تنگ تو تمہیں کررہا ہوں مگر یہ بات تو بالکل حتمی ہے کہ یہ سفید گاؤن مجھے تم پر بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا۔" ارسل نے اس کے چہرے کے بگڑے ہوئے تاثرات کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔
"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں..... مجھے ان آنکھوں میں صرف شرارت نظر آرہی ہے۔" ماریانہ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
"تمہیں صرف شرارت نظر آرہی ہے ماریانہ.....؟" ارسل متعجب ہوا۔
"جی ہاں..... صرف شرارت....." ماریانہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔
"مجھے یہ جان کر افسوس ہورہا ہے ماریانہ۔" ارسل ایک دم سے افسردہ ہوا۔
"افسوس..... وہ کس بات پر؟" اس بار ماریانہ متعجب ہوئی۔
"تم میری آنکھوں میں اب تک جھانک ہی نہ سکیں..... اگر تم جھانکو تو تمہیں معلوم ہو کہ یہاں محبت کا ایک جہاں

آباد ہے جو صرف ماریانہ خاور حیات کے نام سے منسوب ہے۔'' ارسل نے اس کے مزید نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔ ماریانہ کا چہرہ بے ساختہ گلابی ہوگیا۔

''ارسل...... اس وقت ہم برائیڈل آؤٹ لٹ میں موجود ہیں۔ چار دن بعد ہماری شادی ہے اور ہمیں آج ہی ساری شاپنگ کرنی ہے۔اس لیے تمہاری آنکھوں میں آباد محبت کے جہاں میں سفر کرنے کا ارادہ شادی تک تو ملتوی کرنا پڑے گا۔'' ماریانہ نے ارسل کے رومانوی موڈ کا بیڑہ غرق کرتے ہوئے گھور کر جتایا۔ ارسل اس کی اتنی لمبی تمہید بھرے لیکچر پر بے اختیار ہنس دیا۔

''اب ہنسو مت اور گاؤن پسند کرو میرے لیے۔'' وہ خفگی سے ارسل کا بازو تھام کر وارڈ روب تک لے آئی۔ اسی اثناء میں ماریانہ کا موبائل بج اٹھا۔ ماریانہ اپنے پرس سے موبائل نکال کر دیکھنے لگی۔

''کس کی کال ہے؟'' ارسل نے متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میری ایک دوست ہے، اس کی۔'' ماریانہ نے نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔

''دوست کی...... اسے اچانک کیا کام پڑ گیا تم سے؟'' ارسل متعجب ہوتے استفہامیہ لہجے میں بولا۔

''ہے ایک بہت ہی خاص کام...... تم گاؤن دیکھو'' ماریانہ ذومعنی انداز میں مسکراتے ہوئے اسے وارڈ روب کی جانب متوجہ کرتے ہوئے جانے لگی۔

''اور تم کدھر جارہی ہو؟'' ارسل نے بے اختیار سوال کیا۔

''چینج کرنے؟'' ماریانہ نے مسکرا کر کہا۔ ارسل اثبات میں سر ہلا کر وارڈ روب میں ہینگ ہوئے گاؤن کی جانب متوجہ ہوگیا تھا۔

❁......❁......❁

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو فاریہ؟ تمہاری شادی میں حماد سے کرادوں؟'' رضیہ بی بی حیران سی بولیں۔

''اماں بی میں حماد سے بہت پیار کرتی ہوں۔ میں حماد کے بغیر نہیں جی سکتی۔'' فاریہ جذباتیت سے ان کے قریب ہوتے ہوئے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

''نہیں فاریہ...... یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں۔'' رضیہ بی بی نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

''کیوں ممکن نہیں...... کیونکہ میں دلاور کی بیٹی ہوں اس لیے ناں؟'' فاریہ بے بس لہجے بولی۔

''ہاں تم دلاور کی بیٹی ہو اسی لیے...... یہی ایک واحد قصور ہے تمہارا۔'' رضیہ بی بی بے چارگی سے بولیں۔

''نہیں اماں بی...... میں نہیں ہوں دلاور بخت کی بیٹی۔ نہیں مانتی میں ان کو اپنا باپ...... ان کا کردار، ان کا ماضی، ان کا حال...... کسی بات سے میرا تعلق نہیں۔'' فاریہ ہذیانی انداز میں چلائی۔ رضیہ بی بی اس کے یوں چیخنے پر بری طرح گھبرائیں۔

''آپ بھول جائیں کہ میں دلاور بخت کی بیٹی ہوں۔ میرا کوئی باپ ہے، ہی نہیں...... بخت خاندان سے میرا کوئی تعلق ہے، ہی نہیں۔ آپ سمجھیں میں صرف سائرہ کی بیٹی ہوں۔ نیک و پاکیزہ، فرشتہ صفت عورت سائرہ...... میں اسی کی بیٹی ہوں۔'' وہ نڈھال سے انداز میں ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نیک پرور سائرہ کی بیٹی ہو مگر تمہاری بدبختی یہ ہے کہ تمہاری رگوں میں دلاور بخت کا خون دوڑ رہا ہے اور اس سچائی کو ماننے سے تم لاکھ انکار کرو مگر قدرت اس حقیقت کو کبھی رد نہیں کرسکتی۔ فاریہ میرے بچے تم بھول جاؤ حماد کو...... یقین جانو اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔'' رضیہ بی بی فاریہ کا دکھی چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے

میں بھرتے ہوئے بولیں۔
"کیسے ممکن ہے کہ میں بھول جاؤں حماد کو، کیسے ممکن ہے کہ اس کی زندگی سے چلی جاؤں، صرف اس وجہ سے کہ میرے باپ کی سوتیلی بیٹی...... جس کے وجود سے ہی وہ آج تک لاعلم ہے، وہ اس گھر میں رہ رہی ہے اور میرے اس گھر سے رشتہ جڑنے پر میرے باپ پر یہ حقیقت ظاہر ہوجائے گی۔ صرف اس خوف سے اماں بی میں اور حماد اپنی محبت قربان کردیں...... ہم دونوں ایک دوسرے سے دستبردار ہوجائیں؟" فاریہ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ رضیہ بی بی اس کے اس انداز پر گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔
"ہم کیوں قربانی دیں اماں بی...... ہمارا قصور کیا ہے آخر؟" وہ جذباتی انداز میں سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے گھٹنے کے بل ان کے سامنے بیٹھ گئی۔
"قصور تمہارا نہیں مگر قسمت کا ہے بیٹی...... اگر دلاور کو علم ہوگیا کہ اس گھر میں اس کی اور نیلم کی نشانی ہے تو......" رضیہ بی بی نے فاریہ کو پریشانی کے عالم میں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"نشانی ہے تو...... تو کیا ہوگا اماں بی؟ پاپا اس نشانی کو اپنے سینے سے لگالیں گے۔ آخر وہ ان کی محبوبہ، ان کی نیلم کی نشانی جو ہے۔" فاریہ نے سرعت سے بات کاٹتے ہوئے طنزیہ انداز میں رضیہ بی بی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"نیلم بھلے اس کی محبت تھی...... مگر اس پر بے وفائی کا الزام لگا تھا۔ دلاور اس سے نفرت کرنے لگا تھا، اتنی نفرت کہ اس نے اس کی جان لے لی۔" رضیہ بی بی کی آنکھوں میں وہ لمحہ آ گیا۔ جب انہوں نے ٹیلیویژن پر نیلم کی مردہ تصویر دیکھی تھی۔ وہ پل یاد کر کے انہیں اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔
"اچھا...... اور بے وفائی کا الزام کس کے ساتھ لگا تھا؟ آپ کے بیٹے کے ساتھ ناں اماں بی؟" فاریہ نے کاٹ دار لہجے میں طنزیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ فاریہ کا لب ولہجہ دودھاری تلوار کی مانند تھا۔ رضیہ بی بی کے تن بدن میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ وہ فاریہ کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکیں۔ ساکت نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔
"کہیں شبنم آپ کے بیٹے اور نیلم کے کرتوتوں کا نتیجہ تو نہیں...... جسے اپنے بیٹے کی آخری نشانی کے طور پر آپ سینے سے لگائے پھر رہی ہیں؟" رضیہ بی بی کی خاموشی پر فاریہ زہر خند لہجے میں بولی۔
"نہیں...... یہ جھوٹ اور بہتان ہے۔ نیلم اور میرے بیٹے کے درمیان ایسا کوئی تعلق نہ تھا۔ میرا بیٹا بڑی عزت کیا کرتا تھا نیلم بی بی کی۔ یہ تو بخت خاندان کے ذہن کا فتور ہے جوان معصوموں پر الزام لگا کر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔" رضیہ بی بی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ مگر لہجہ مستحکم تھا۔
"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں ناں اماں بی مگر حقیقت تو مجھے بھی کچھ اور نظر آرہی ہے۔ جس طرح آپ شبنم کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھیں ہیں اور صرف اسے بچانے کے چکر میں آپ مجھے اور حماد کو ایک دوسرے سے جدا کرنا چاہتی ہیں۔ یہ ساری باتیں تو کچھ اور ہی اشارے دے رہی ہیں اماں بی۔" فاریہ نے ان کی بات کو رد کیا۔
"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو فاریہ؟" رضیہ بی بی چیخیں۔
"سب کچھ واضح ہے اماں بی...... آپ اس خوف کا شکار ہیں کہ میرے پاپا کو اگر شبنم کی موجودگی کا پتا چل گیا تو وہ یا تو اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے یا پھر اسے کوئی نہ کوئی نقصان پہنچائیں گے اور آپ صرف شبنم کو بچانے کی خاطر یہ چاہتی ہیں کہ میں اور حماد اپنی محبت کو قربان کردیں اور میں یہی سوچ رہی ہوں کہ آخر شبنم سے آپ کو اتنی محبت کیوں ہے؟ ایسی محبت کہ اس کی رگوں میں آپ کا ہی خون دوڑ رہا ہو۔" فاریہ کے لفظوں نے رضیہ بی بی کو ایک لمحے میں کٹہرے میں لاکھڑا کیا۔

"شبنم میرے پاس نیلم کی امانت ہے اور میں اپنی آخری سانس تک اس کی امانت کی حفاظت کروں گی اور جہاں تک بات ہے تمہارے اور حماد کی تو یہ جان لو کہ تم دونوں کا ملاپ کسی صورت ممکن نہیں اور میں نہیں چاہتی کہ اپنے باپ کا کیا دھرا تم دونوں بھگتاؤ۔" رضیہ بی بی اس بار سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔ ان کی آنکھوں میں فاریہ کے لیے اگر کوئی جذبہ تھا تو وہ تاسف تھا۔ وہ اسے کنویں میں گرنے سے بچانا چاہتی تھیں مگر وہ جیسے اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار بیٹھی تھی۔ انہیں اس نازک سی لڑکی پر غصہ بھی آرہا تھا اور ہمدردی بھی محسوس ہورہی تھی۔

"میرے باپ نے جو کیا سو کیا مگر میں آپ کے بیٹے پر اپنی محبت قربان نہیں کروں گی۔ آپ کے پاس اب دو راستے ہیں اماں بی...... آپ کو میری اور حماد کی شادی کروانی ہوگی اور اگر آپ نے ہماری شادی کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کی تو......" فاریہ نے سنگ دلی سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو تم کیا کروگی؟" رضیہ بی بی کی سوالیہ نگاہیں فاریہ پر جمی ہوئی تھیں۔

"تو میں حماد کو سب کچھ سچ سچ بتادوں گی کہ شبنم آپ کے بیٹے کی ناجائز اولاد ہے اور یہ تو آپ بھی سمجھ سکتی ہیں کہ یہ حقیقت جاننے کے بعد اس گھر سے آپ کا دانہ پانی اسی وقت اٹھ جائے گا۔ برسوں کی بنائی ہوئی عزت لمحوں میں ملیا میٹ ہوجائے گی۔ فیصلہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میری حماد سے شادی کروانے میں مدد کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ پر اور شبنم پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔" فاریہ ان کو دھمکا کے چلی گئی۔

"اوہ میرے اللہ...... یہ لڑکی...... یہ لڑکی تو لگتا ہے ہم سب کی زندگیوں میں قیامت برپا کر کے رہے گی۔" رضیہ بی بی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

❁......❁......❁

"کہاں چلی گئی تھی تم ماریانہ؟" وہ کافی دیر بعد واپس لوٹی تو ارسل خفگی سے منہ پھلائے کھڑا تھا۔

"بس ایک بہت ضروری کام تھا۔ وہ نبٹانے گئی تھی۔" ماریانہ نے مسکرا کر دیکھتے ہوئے ارسل کو جواب دیا۔

"اور یہ کون سا ضروری کام تھا؟" ارسل نے تفتیشی انداز میں اسے خفگی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔ تھوڑی دیر انتظار کرو اور مجھے یہ بتاؤ...... تم نے میرے لیے کوئی گاؤن پسند کیا یا نہیں؟" وہ اسے بازو سے تھام کر وارڈروب کی جانب متوجہ کرتے ہوئے شوخی سے مسکرا کر بولی۔

"پسند کرلیا۔" ارسل نے مسکرا کر ماریانہ کو دیکھا۔

"واقعی...... کہاں ہے دیکھاؤ؟" ماریانہ بے صبری سی استفسار کرتے ہوئے وارڈروب گاؤنز دیکھنے لگی۔

"یہاں نہیں ہے۔" ارسل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہاں نہیں ہے...... پھر کہاں ہے؟" ماریانہ حیران ہوتے پلٹی۔

"یہ جاننے کے لیے تمہیں میرے ساتھ آنا ہوگا۔" ارسل نے ماریانہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ماریانہ، ارسل کے ہمراہ آؤٹ لٹ کے ایک حصے سے نکل کر دوسرے حصے کی جانب بڑھنے لگی۔

"مجھے یہاں کوئی ایک بھی ڈریس تمہارے لیے پسند نہیں آیا تھا اور پھر میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس طرف آنکلا۔" وہ دوسرے حصے میں ایک شوکیس کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ماریانہ کی خواب ناک نگاہیں ارسل کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں اس پل ہزار رنگ جھلملا رہے تھے۔ ارسل کے قدم اس شوکیس کے نزدیک جا کر رک گئے۔ ماریانہ کے قدم بھی تھم گئے تھے۔

"یہ گاؤن دیکھو...... ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے لیے ہی بنا ہے۔" ارسل نے شوکیس میں موجود گاؤن کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''یہ گرے فلورل گاؤن......!'' ماریانہ دم بخودسی اس خوب صورت سے گرے گاؤن کو دیکھتی رہ گئی۔ ہلکے سرمئی رنگ کے لانگ ٹیل اور گنز انیٹ گاؤن جس کے دامن گلابی اور کاسنی رنگ کے پھولوں سے بھرا ہوا تھے۔ وہ واقعی اس آؤٹ لٹ کا سب سے حسین ترین گاؤن تھا۔ ماریانہ مبہوت سی اس گاؤن کو دیکھتی رہ گئی۔
''کیسا لگا تمہیں میرا انتخاب؟'' ارسل نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''بالکل پریوں کے لباس جیسا...... اسے دیکھ کر مجھے یہ احساس ہو رہا ہے اور جب پہنوں گی تو میں خود کو پری ہی محسوس کروں گی۔'' ماریانہ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولی۔
''تم پری ہی تو ہو ماریانہ...... میری زندگی تو بس ایک عجیب سی داستان ہے اور اس داستان میں خوب صورت رنگ ہیں وہ تمہارے دم سے ہیں۔ تم نے اپنے جادو کی چھڑی گھمائی اور میں مسکرا اٹھا، میری زندگی مسکرادی...... تمہارے لیے تو پریوں کے لباس جیسا ہی گاؤن ہونا چاہیے تھا ناں۔'' ارسل نے کہا۔ ماریانہ کو وہ پل اپنی زندگی کا سب سے حسین پل محسوس ہوا۔ پہلی بار اسے ادراک ہوا کہ محبت کا خمار جب کسی کے وجود سے لپٹتا ہے تو انگ انگ اس سرخوشی میں ڈوبتا جاتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کے لیے اس لیے اہم نہیں تھی کہ وہ بے حد حسین تھی۔ وہ اس لیے اہم تھی کہ اس کے محبوب کی زندگی کی ہر خوشی، ہر مسکراہٹ اس کی محتاج تھی۔ وہ ارسل کی چاہ تھی، وہ اس کی محبت تھی، وہ اس کے جینے کی وجہ تھی، وہ اس کے لیے آکسیجن کا درجہ رکھتی تھی۔ اس نے ایک تفاخر کے عالم میں ارسل کو دیکھا۔ وہ اس کے بے حد قریب تھا۔ اتنا قریب کہ اس کی سانسیں اسے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی محبت ماریانہ کو مسحور کیے دے رہی تھی۔
''آج میں نے جانا ہے کہ محب تم جیسا ہو تو محبت کا جذبہ آب حیات بن جاتا ہے۔'' ماریانہ نے مسروری انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے گزرتے دن کے ساتھ زندگی کم نہیں ہو رہی بلکہ بڑھ رہی ہیں...... تم نہیں جانتے ارسل تم میری زندگی کا حاصل بن گئے ہو۔ میرے جینے کی وجہ بن گئے ہو۔ تمہاری ذات سے اب میری ذات کی تکمیل ممکن ہے۔'' ماریانہ جذب کے عالم میں کہہ رہی تھی۔
''جناب من میں جس نگر کا مسافر ہوں اس سلطنت کی ملکہ تم ہو۔ تم ہو تو میں ہوں۔ میں ہوں تو تم ہو۔ ارسل اور ماریانہ یہ دو داستانیں ہیں جو اب عنقریب ایک ہونے کو ہیں۔'' ارسل نے محبت میں سرشار لہجے میں کہا۔
''یہ ایک ہونا آفیشلی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دل اب ایک ہو گئے ہیں۔'' ماریانہ نے تائیدی انداز میں مسکراتے ہوئے ارسل کو دیکھ کر کہا۔
''جانتا ہوں...... تم یہ گاؤن چیک کر کے دیکھ لو تاکہ میں اس لباس کو اپنی پری کے لیے فائنل کرلوں۔'' ارسل نے لباس کو دیکھ کر کہا۔ ماریانہ نے ایک ادا سے سرخم کیا اور گاؤن کو شوکیس سے نکلوانے لگی۔

❁......❁......❁

''دلاور...... کہاں ہو میری جان؟'' صبیحہ پورے گھر میں دلاور کو ڈھونڈتے ہوئے بوکھلائی بوکھلائی سی پھر رہی تھی۔
''رشیدہ تم نے دلاور کو دیکھا؟ میں نہانے گئی تھی۔ وہ میرے کمرے میں ہی بیٹھا کھیل رہا تھا اور اب وہ کہیں بھی نہیں ہے۔'' صبیحہ بیگم نے پریشانی کے عالم میں کچن میں کام کرتی ملازمہ سے استفسار کیا تھا۔
''نہیں بی بی جی...... میں نے تو نہیں دیکھا۔ آپ اسے کمرے میں لے گئی تھیں۔ بس اتنا پتا ہے۔ اس کے بعد تو اس کو دیکھا ہی نہیں۔'' ملازمہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پریشانی سے بولی تھی۔

''ہاں مگر وہ کمرے میں نہیں ہے۔ ابھی تو اس نے چلنا سیکھا ہے۔ پھر کمرے سے نکل کر کہاں جاسکتا ہے۔ میں نے پورا گھر چھان مارا وہ کہیں نہیں ہے۔'' صبیحہ بیگم پریشانی کے عالم میں بڑبڑاتی ہوئی ایک بار پھر سے پورے گھر میں دلاور کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ ملازمہ گھبراہٹ کے عالم میں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

''کہیں بھی نہیں ہے میرا بچہ...... ایسا کیسے ہوسکتا ہے...... اتنا چھوٹا سے بچہ اچانک گھر سے غائب کیسے ہوسکتا ہے؟'' صبیحہ بیگم سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ملازمہ بھی اسے بیٹھتا دیکھ کر بیٹھنے لگی۔

''تم کیوں بیٹھ رہی ہو رشیدہ...... میں اگر غسل خانے میں تھی تو بچے کا خیال رکھنا تمہارا فرض تھا۔ تم کیوں غافل رہیں؟ جاؤ ڈھونڈو میرے بیٹے کو ورنہ تمہیں پولیس کے حوالے کروادوں گی۔'' صبیحہ بیگم غصے سے ملازمہ کو ڈپٹتے ہوئے بولی تو ملازمہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میری جان...... تم کہاں چلے گئے دلاور؟'' صبیحہ بیگم کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ دل بری طرح کانپ رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے ان کی روح کو جلانے لگے۔ دفعتاً ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ صبیحہ بیگم نے لمحہ بھر ٹیلی فون کو دیکھا اور جٹ سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا تھا۔

''ہیلو عاصم......'' صبیحہ بیگم نے بھیگے لہجے میں عاصم کو پکارا۔

''صبیحہ کیا ہوا...... تم رو کیوں رہی ہو؟'' عاصم نے گھبرا کر پوچھا تھا۔

''عاصم...... عاصم ہمارا بچہ دلاور نہیں مل رہا۔'' صبیحہ نے روتے ہوئے کہا تھا۔

''دلاور نہیں مل رہا...... کیا مطلب اس بات کا؟'' عاصم بے اختیار پریشان ہوا تھا۔

''عاصم میں باتھ روم میں تھی تب دلاور کمرے میں کھیل رہا تھا۔ میں باتھ روم سے نکلی تو وہاں نہیں تھا۔'' صبیحہ بیگم نے عاصم کو تفصیل بتائی تھی۔

''صبیحہ، دلاور اگر کمرے میں نہیں تو اسے گھر کے دوسرے حصوں میں دیکھو۔ کھیلتے کھیلتے کہیں چلا گیا ہوگا۔ نیا نیا چلنا سیکھا ہے۔ تمہیں معلوم تو ہے آج کل کونوں کھدروں میں گھس کر کھیل رہا ہوتا ہے وہ۔'' عاصم نے اسے تسلی سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''عاصم میں نے ہر جگہ تلاش کرلیا۔ دلاور کہیں بھی نہیں ہے۔ وہ گھر پر ہے ہی نہیں۔ عاصم مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں......'' صبیحہ بیگم اتنا کہہ کر ہچکیوں سے رونے لگی تھیں۔

''کس بات کا ڈر ہے تمہیں صبیحہ...... کھل کر بتاؤ؟'' اس بار عاصم بھی گھبرا گیا تھا۔

''کہیں یاور بخت...... یاور بخت نے تو میرے بچے کو اغوا نہیں کرلیا۔'' صبیحہ بیگم کا ڈر عاصم کی حواسوں پر بم گرا گیا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو صبیحہ...... دن دھاڑے کوئی کیسے ہمارے گھر سے ہمارے بیٹے کو اغواء کراسکتا ہے؟'' عاصم پریشانی سے بولا تھا۔

''میں نہیں جانتی کچھ بھی عاصم...... مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ عاصم گھر پر نہیں ہے۔ وہ کہاں گیا، کون لے گیا میں کچھ نہیں جانتی۔''

''اچھا تم سنبھالو خود کو۔ میں گھر آرہا ہوں۔'' عاصم نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ صبیحہ بیگم ریسیور، کریڈل پر رکھ کر ایک بار پھر دلاور کو آوازیں دینے لگی تھیں۔

❁......❁......❁

''ارے پیڈرو تم؟'' ارسل ماریانہ کے ساتھ شاپنگ کر کے مال سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ سامنے سے پیڈرو کو آتا دیکھ کر چونکتے ہوئے بولا۔
''دراصل میں یہاں ایک خاص میٹنگ کے سلسلے میں آیا تھا۔'' پیڈرو نے ماریانہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
''اہم میٹنگ کے سلسلے میں...... مگر میں نے تو آج کوئی میٹنگ ارینج نہیں کی تھی تمہارے لیے۔'' ارسل نے ناسمجھی سے کہا۔
''میٹنگ آپ نے نہیں کی تھی سینور...... مگر سینورا ماریانہ نے تو کی تھی۔'' پیڈرو نے ماریانہ کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے اشارہ کیا۔
''ہونہہ...... تو یہ سب تمہارا پلان ہے۔'' ارسل نے ماریانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''ہولا ماریانہ......'' اسی اثناء میں سٹیلا، ماریانہ کو پکارتے ہوئے وہاں آ پہنچی۔
''ہولا سٹیل...... ارسل یہ ہے میری دوست سٹیلا اور پیڈرو اور سٹیلا دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔'' ماریانہ نے تفصیل بتاتے ہوئے ارسل کو دیکھا۔
''اوہ...... تو یہ بات ہے۔ تو پھر ماریانہ ہمیں پیڈرو اور سٹیلا کے درمیان کباب میں ہڈی نہیں بننا چاہیے۔ ہم پھر چلتے ہیں اور پیڈرو تم اور سٹیلا ایک دوسرے سے ملاقات کرو۔'' ارسل نے مسکراتے ہوئے پیڈرو اور سٹیلا کو دیکھ کر کہا۔
''ارسل...... پیڈرو اور سٹیلا آج ہمارے ساتھ لنچ پر اپنی شادی پلان کریں گے۔'' ماریانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اچھا زبردست...... یعنی یہ پہلی ملاقات نہیں...... کئی ملاقاتوں کا شاخسانہ ہے۔'' ارسل نے ہنستے ہوئے پیڈرو اور سٹیلا کو دیکھا۔
''ارسل...... آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ ماریانہ اور پیڈرو آپ کی بہت تعریفیں کرتے ہیں۔'' سٹیلا نے خوش اخلاقی سے ارسل کو سراہا۔
''مجھے بھی خوشی ہوئی آپ سے مل کر...... میرے خیال سے اب لنچ کہاں کرنا ہے یہ فیصلہ کرنا چاہیے۔'' ارسل نے تینوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''کونچا بیچ...... کیا خیال ہے آپ سب کا؟'' ماریانہ نے مسکراتے ہوئے سوالیہ انداز میں سب کو دیکھا۔
''خیال برا نہیں ہے...... کیوں سٹیل؟'' پیڈرو نے سٹیلا سے بھی جواب جاننا چاہا۔
''لیکن میرا خیال ہے اس بار کونچا نہیں......'' ارسل نے پرسوچ انداز میں کہہ کر ان تینوں کے چہروں کی جانب دیکھا۔
''پھر کہاں؟'' وہ تینوں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔
''کیفے ڈی کاسا۔'' ارسل نے مسکرا کر کہا۔ ماریانہ کی آنکھیں ایک دم سے چمک اٹھیں۔
''اولا...... کیفے ڈی کاسا...... بہترین انتخاب ہے۔ تمہیں پتا ہے پیڈرو میں نے اور ارسل نے اپنا پہلا لنچ وہیں کیا تھا۔'' وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے پارکنگ ایریا کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

❁......❁......❁

مَنَم محوِ خیالِ اُو، نمی دانم کجا رفتم
شُدَم غرقِ وصالِ اُو، نمی دانم کجا رفتم
(میں اس کے خیال میں محو ہوں اور نہیں معلوم کہ کہاں جا رہا ہوں

بس اسی کے وصال میں غرق ہوں اور نہیں جانتا کہ کہاں جا رہا ہوں)

غلام روئے اُو بُو دَم، اسیر بُوئے اُو بُو دَم
غبارِ کوئے اُو بُو دَم، نمی دانم کجا رفتم
(میں اس کے چہرے کا غلام ہوں، اس کی خوشبو کا اسیر ہوں،
اس کے کوچے کا غبار ہوں اور میں نہیں جانتا کہ کہاں جا رہا ہوں)

بہ آں مہ آشنا گشتم، ز جان و دل فدا گشتم
فنا گشتم فنا گشتم، نمی دانم فنا کجا رفتم
(اس ماہ رُو کا آشنا ہو کر گھومتا ہوں، جان و دل فدا کیے ہوئے گھومتا ہوں
خود کو فنا کیے ہوئے گھومتا ہوں اور نہیں جانتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں)

شدم چوں مبتلائے اُو، نہادم سر بہ پائے اُو
شدم محو لقائے اُو، نمی دانم کجا رفتم
(میں اس کے عشق میں ایسے مبتلا ہوں کہ اس کے پاؤں پر سر رکھے ہوں
اور ہمہ وقت اس کے دیدار میں محو ہوں اور میں نہیں جانتا کہ کہاں جا رہا ہوں)

قلندر بو علی ہستم، بنام دوست سر مستم
دل اندر عشق اُو ہستم، نمی دانم کجا رفتم
(میں بُو علی قلندر ہوں اور دوست کے نام پر سرمست ہوں
اور میرے دل میں بس اسی کا عشق ہے اور میں نہیں جانتا کہ کہاں جا رہا ہوں)

❁……❁……❁

وہ آڑی ترچھی سی بستر پر دراز تھی۔ اس کی گھنی سیاہ زلفیں بستر سے جھولتی ہوئی فرش کو چھو رہی تھیں۔ اس کے پاؤں میں بندھی نازک سی پازیب کے ننھے منے گھنگھرو اس کے پیروں کی حرکت کے باعث سروں میں گنگنا رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی وا تھی اور کھڑکی سے جھانکتی کرنیں اس کی چاندی کی پازیب کو دھیرے سے چومتی تھیں اور یہ سنہرا بوسہ اس کے پیروں سے لپٹتا ہوا ہولے ہولے اس کے وجود کے ہر انگ کو چھو کر سنہرا کرتا جاتا۔ سنہرا رنگ……اور وہ……گندم کی سونے کی ڈالی……کرنوں کی شرارت اور دھوپ کی حدت اسے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تو ایک جھٹکے سے منہ دائیں بازو میں چھپا کر کروٹ بدل گئی۔ آنکھوں پر ہنوز سیاہ گھنی جھالروں کا پردہ تھا۔ مگر گلاب کی پنکھڑی سے لب متبسم تھے۔ وہ جیسے کسی حسین خواب میں کھوئی ہوئی تھی۔ تب ہی اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''حماد……'' وہ بے اختیار ایک جھٹکے سے بستر سے اٹھی۔ دل کی تمنالیوں کے گداز گوشوں کو چھو گئی۔

''شبنم بیٹا ابھی تک سو رہی ہو؟'' دروازے سے گرینی کی آواز نے اسے خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لا پٹخا۔

''بیٹا جلدی تیاری پکڑو……ارسل اور ماریانہ کے آتے ہی ہمیں نکل جانا ہے۔'' گرینی نے تاکید کی۔

''شادی کی تقریب میں وقت پر پہنچنا بہت ضروری ہے۔ مہمانوں کو انتظار کروانا مناسب بات نہیں۔ بیٹا جلدی تیار ہو جانا۔'' گرینی اسے ہدایت دے کر چلی گئیں اور شبنم جوں کی توں بیٹھی رہی۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی پراسراری مسکراہٹ تھی۔

''آپ صحیح کہہ رہی ہیں گرینی...... شادی کے معاملات میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے اور کسی معجزے کا انتظار کرنے کے بجائے، خود تدبیریں کرنی چاہیے۔ حماد آج میں جو کچھ کرنے والی ہوں...... اس کے بعد تمہارا فاریہ کو حاصل کرنے کا خواب خود بخود چکنا چور ہو جائے گا۔ فاریہ تم سے اتنی دور ہو جائے گی جتنا کہ یہ آسمان اور میں تم سے اتنی قریب ہو جاؤں گی...... جیسے کہ تمہاری سانس۔'' شبنم تصور میں حماد سے ہمکلام ہوتی مسکرانے لگی۔ اس کی نگاہوں میں فاریہ کا غصے سے لال ہوتا چہرہ گھوم رہا تھا اور لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ چسپاں تھی۔

محلوں میں اسیر رہتے ہیں
فاتح کم، بدنصیب رہتے ہیں
جاہ وحشمت کی مثالیں زندہ
رقم کرنے والے زیرِ زمین رہتے ہیں
خواب جو جھانکا کرتے ہیں آنکھوں سے
ریشمی زنجیر میں قید، سنہری جالیوں میں رہتے ہیں
دل بغاوت پر اتر آیا ہے اے محافظ
تیرے خنجر اب تلک کیوں، نیام میں رہتے ہیں

❁......❁......❁

بخت محل کا باغیچہ ایک طویل مدت بعد قمر جہاں کی محنت وتوجہ کے باعث ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ قمر جہاں نے شاہ بلوط کی لکڑی کا آبنوسی جھولا بھی اس باغیچے میں منگوا کر ایک طرف رکھا تھا۔ وہ خود بھی جب گائیکی کے موڈ میں ہوتی باغیچے کے اس حصے میں آ کر اس جھولے کے سہارے جھولتی، بانسری کی دھن بجانے میں اسے مہارت حاصل تھی اور اس کی دلکش دھن کے ساتھ وہ اپنی مترنم آواز میں سُر سے سُر ملاتی تو پیڑوں پر بیٹھیں چڑیائیں بھی جھوم جاتیں۔ آج اس جھولے پر قمر جہاں تو نہیں بخت محل کی شہزادی بیٹھی تھی۔ بکھرے بال، ستا ہوا چہرہ، آنکھوں میں پھیلی کاجل کی بھیگی سیاہی بھی جیسے اس کی دلی کیفیت پر ماتم کناں تھی۔ باپ کا خوفناک روپ ابھی ذرا سا ہی دیکھا تھا اور دل میں نفرت سی بھر گئی تھی۔ یہ نفرت دل کو جلا کر جیسے راکھ کیے دے رہی تھی اور ایسے میں اس کا دل جس محبوب ہستی کی ذات کا خواہاں تھا، یہ دنیا اسے اس کا ہونے سے، اس کے پاس جانے سے روک رہی تھی۔ اسے حماد سے دور کرنے کی سازشیں کر رہی تھی۔

''مگر میں ان سازشوں کو کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ کچھ بھی ہو جائے۔ میں حماد کو خود سے دور نہیں ہونے دوں گی۔ ہماری محبت کسی کے گناہوں کے بھینٹ چڑھے گی حماد...... یہ میرا تم سے وعدہ ہے اور اس وعدے کو نبھانے کے لیے مجھے کسی بھی حد تک جانا پڑا تو میں جاؤں گی۔'' وہ دل ہی دل میں حماد سے مخاطب ہوئی۔

''مجھے پتا تھا کہ تم یہیں ملوگی۔ آج کل باغیچے کے اس گوشے کو تم نے اپنا مسکن جو بنا رکھا ہے۔'' قمر جہاں نرمی سے مسکراتے ہوئے فاریہ سے بولیں۔ فاریہ چونک کر قمر کو دیکھنے لگی۔

''اس محل کا یہ واحد حصہ ہے جہاں مجھے سکون ملتا ہے۔ ورنہ اس گھر کی در و دیوار تو جیسے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔'' فاریہ نفرت آمیز لہجے میں بولی۔ اس کی بات پر قمر جہاں کچھ ثانیے تک ساکت نظروں سے اس کو دیکھتی رہی تھیں۔

''یہ اتنا بڑا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور یہ چھوٹا سا گوشہ تمہیں سکون دیتا ہے۔ یہ گوشہ بھی تو اس گھر کا ہی حصہ ہے۔ پھر سکون کیوں ملتا ہے تمہیں یہاں آ کر؟'' کچھ لمحوں کے توقف کے بعد قمر جہاں نے جھولے پر فاریہ کے ساتھ

بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔
''وجہ تم ہو قمر جہاں...... تم نے بہت پیار سے، بہت خلوص سے اس گوشے کو آباد کیا ہے۔ اس لیے یہاں اچھا لگتا ہے۔ تمہاری ذات کا اپنا پن، مجھے یہاں ہر سو محسوس ہوتا ہے۔'' فاریہ، قمر جہاں کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
''بہت بدل گئی ہو فاریہ...... نہ جانے کیا حقیقت جان لی ہے تم نے ان درو دیوار کی۔ یوں لگتا ہے جیسے تمہارے اندر ایک خلا سا بھر گیا ہے۔ تمہاری آنکھوں کی جوت مرجھا گئی ہے، تمہارے لہجے کی تازگی کھو گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا تمہیں ہو کیا گیا ہے۔'' قمر جہاں اسے سر تا پیر دیکھتے فکر مندی سے بولیں۔
''آگہی عذاب ہے جاناں...... تم نے کبھی سنا نہیں یہ مقولہ؟'' وہ کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے بولی۔
''اور کسی کا تو نہیں پتا مگر اس بخت محل کی سچائی سے جو بھی آگاہ ہوا ہے۔ وہ تمہاری طرح زندگی سے بیزار ہوتا چلا گیا ہے۔'' قمر جہاں ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بخت محل کی پرشکوہ عمارت کو دیکھتے ہوئے بولیں۔
''میں ابھی اپنی زندگی سے بے زار نہیں ہوئی ہوں قمر جہاں...... میری زندگی کا روشن باب ابھی میرا منتظر ہے۔ حماد...... میری محبت، میری چاہت...... وہ ہی میرا اب سب کچھ ہے۔'' فاریہ کھوئے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ قمر جہاں چپ سی اسے دیکھتی رہیں۔
''ایسے کیا دیکھ رہی ہو قمر جہاں؟'' فاریہ نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا۔
''کچھ نہیں...... بس ایسے ہی...... تمہیں دلاور اور بی جی نے بلایا ہے۔ ان کا پیغام دینے ہی یہاں آئی تھی۔'' قمر جہاں نے اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ فاریہ کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
''تو...... چلتے ہیں پھر۔'' فاریہ جھولے سے اترے ہوئے بولی۔ قمر جہاں بھی سر ہلاتے ہوئے جھولے سے اتر گئی۔ وہ دونوں ایک ساتھ قدم سے قدم ملاتے ہوئے بخت محل کی جانب بڑھ گئی۔

❁......❁......❁

''یہ کیسے ممکن ہے صبیحہ...... گھر میں، اپنے کمرے میں کھیلتا ہوا بچہ اچانک کیسے غائب ہوسکتا ہے؟'' عاصم انتہائی پریشانی کے عالم میں اضطراری کیفیت میں گرفتار صبیحہ کے سامنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے بولا۔
''میں نہیں جانتی عاصم...... میں کچھ بھی نہیں جانتی عاصم مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ دلاور کے غائب ہونے میں یاور بخت کا ہی ہاتھ ہے۔'' صبیحہ بیگم نے روتے ہوئے کہا تھا۔
''کیا تمہیں یقین ہے کہ ہمارے بیٹے کے یوں گھر سے اچانک غائب ہونے پر یاور بخت کا ہی ہاتھ ہے؟'' عاصم نے صبیحہ بیگم کو سنجیدگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔
''اس نے مجھے دھمکی دی تھی عاصم...... اس نے کہا تھا کہ وہ میرے بیٹے کو میری نظروں سے دور کردے گا۔ وہ مجھے اپنے پاس لوٹنے پر مجبور کردے گا اور دیکھو اس نے ہمارے بچے کو کردیا ناں ہم سے دور۔'' صبیحہ بیگم سسکیوں کے درمیان بولی تھیں۔
''اگر ایسی بات ہے تو پھر چلو میرے ساتھ۔'' عاصم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بستر سے اٹھاتے ہوئے کہا۔
''کہاں...... ہم کہاں جارہے ہیں؟'' صبیحہ بیگم بستر سے اٹھتے ہوئے عاصم کو حیرت سے دیکھتے ہوئے استفسار کرنے لگی تھیں۔
''ہم پولیس اسٹیشن جارہے ہیں صبیحہ، یاور بخت کے خلاف پرچا کٹوانے۔'' عاصم نے سخت لہجے میں کہا تھا۔
''اگر میرے بیٹے کو میرے گھر سے اٹھوانے میں یاور بخت کا ہاتھ ہے تو دلاور کی قسم صبیحہ...... میں اسے زندہ نہیں

چھوڑوں گا۔'' عاصم شدید غصے کے عالم میں صبیحہ بیگم کو ساتھ لیے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

❁.......❁.......❁

''آپ لوگوں نے بلایا تھا مجھے؟'' فاریہ کمرے میں داخل ہوئی تو دلاور بخت اور صبیحہ بیگم کو ساتھ بیٹھا دیکھ کر سپاٹ لہجے میں استفسار کی۔

''ہاں ادھر آؤ...... بیٹھو میرے پاس۔'' دلاور نے اسے نرمی سے اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔ فاریہ خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''فاریہ بیٹا...... تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔'' صبیحہ بیگم نے فاریہ کے اترے ہوئے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کہیں...... میں سن رہی ہوں۔'' فاریہ نے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے کہ......'' صبیحہ بیگم کا اپنی جان سے عزیز پوتی کو یوں بکھرے حال میں دیکھ کر دل کٹنے لگا تھا۔ وہ اس کے دل کا حال جانتی تھیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ حماد سے محبت کرنا فاریہ کی کوئی غلطی نہیں مگر ستم یہ تھا کہ وہ یہ جان گئیں تھیں کہ حماد سے شادی درحقیقت فاریہ کی بربادی ہے اور فاریہ کو اپنی نظروں کے سامنے برباد ہوتا وہ کسی صورت بھی نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی زبردستی شادی کروانا چاہ رہی تھیں۔

''اوہو بی جی...... آپ اتنا جھجک کیوں رہی ہیں؟ جو کہنا ہے وہ سیدھا سیدھا کہہ دیں فاریہ سے۔'' دلاور نے جھنجھلا کر بی جی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ دلاور کی بات پر فاریہ نے صبیحہ بیگم کو خفگی بھری نظروں سے بغور دیکھا۔

''تم باپ ہو...... میرے خیال سے تمہارا بتانا زیادہ مناسب رہے گا۔'' صبیحہ بیگم نے فاریہ سے نظریں چراتے ہوئے دلاور سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں بتا دیتا ہوں۔'' دلاور نے صبیحہ بیگم کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''فاریہ بیٹا آج سے دس دن بعد میں نے تمہاری شادی کی تاریخ طے کر دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ تم میری لاڈلی ہی نہیں فرماں بردار بیٹی بھی ہو اور میرے اس فیصلے سے بے حد خوش بھی ہو گی۔'' دلاور نے مسکرا کر فاریہ کو دیکھا مگر فاریہ لب بھینچے ساکت سی بیٹھی رہی۔ دلاور بخت کا ماتھا ٹھنکا۔

''تم خوش ہوناں فاریہ؟'' اس نے اس کے چہرے کے تنے ہوئے تاثرات دیکھ کر سخت لہجے میں پوچھا۔

''ہونہہ...... خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔'' فاریہ نے اپنے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ سجا کر دلاور کو دیکھا۔

''ہونہہ...... تمہیں خوش ہونا بھی چاہیے...... دن بہت کم رہ گئے ہیں۔ تم آج سے ہی اپنی شادی کی تیاری کا آغاز کر دو۔'' دلاور کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھا۔

''ٹھیک ہے پاپا...... میں آج ہی سے اپنی شادی کی تیاری کا آغاز کر دوں گی۔'' فاریہ مخاطب بھلے دلاور سے تھی مگر اس کی نگاہیں صبیحہ بیگم کے خاموش چہرے پر جمی تھیں۔ فاریہ کی آواز میں ایک چبھن سی در آئی تھی۔ صبیحہ بیگم کو وہ چبھن اپنے دل میں اترتی محسوس ہوئی۔ کوئی نہ کوئی بات تھی فاریہ کی آنکھوں میں، اس کے لہجے میں جو صبیحہ بیگم کو اندر ہی اندر کچھ غلط ہونے کا احساس دلا گئی۔ وہ شش و پنج میں مبتلا سی فاریہ کو دیکھنے لگیں۔

''میں اب جا سکتی ہوں؟'' فاریہ نے باری باری دونوں کو دیکھتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

''ہونہہ...... جا سکتی ہو۔'' دلاور نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ فاریہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

''لگتا ہے عقل ٹھکانے آ گئی ہے۔ تب ہی اتنی شرافت سے شادی کے لیے مان گئی۔'' دلاور بخت استہزائیہ

مسکراہٹ لبوں پر سجائے صبیحہ بیگم سے مخاطب ہوا۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔'' صبیحہ بیگم آہستگی سے بولیں۔

''بی جی...... فاریہ کی شادی کی تمام تیاری آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ جس طرح سے بھی یہ تیاری کروائیں۔ آپ کو مکمل اختیار حاصل ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر صبیحہ بیگم کے کمرے سے چلا گیا۔

''اف دلاور بخت تم نہ جانے کب حالات کے بگڑتے تیور بھانپ سکو گے۔ تم نے اپنی بیٹی کو اب تک صحیح سے نہیں پہچانا۔ اس کی رگوں میں بھی تمہارا خون ہے۔ تمہاری طرح ضدی ہے وہ۔ تم نے اس کے اندر اٹھتی بغاوت کی آگ کی تپش محسوس نہیں کی مگر میں نے یہ تپش محسوس کرلی ہے اور مجھے ڈر لگ رہا ہے، فاریہ کی بغاوت سے۔ اگر وہ باغی ہوگئی تو پھر نہ جانے کیا ہوگا۔'' صبیحہ بیگم کے دل میں خدشات نے سر اٹھایا تھا۔

❁......❁......❁

فاریہ اپنے کمرے میں آکر انتہائی اضطراب میں حماد کو کال ملانے لگی۔

''اف حماد...... پلیز میری کال ریسیو کرو۔'' وہ مضمحل سے انداز میں دوبارہ کال ملانے لگی۔

''ہیلو فاریہ......'' بالآخر چوتھی، پانچویں ٹرائی میں حماد نے کال ریسیو کرلی تھی۔

''حماد...... حماد مجھے تم سے بہت اہم بات کرنی ہے۔'' اس کی آواز سنتے ہی فاریہ بے تابی سے بولی۔

''ہاں کہو فاریہ...... میں سن رہا ہوں۔'' حماد سنگھار میز کے سامنے کھڑا، ٹائی باندھ رہا تھا۔ کانوں میں بلیوٹوتھ لگائے وہ مصروف سے انداز میں بولا۔

''حماد...... یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ پاپا میری دس دن بعد شادی کرنے والے ہیں اور میں کچھ نہیں کر پارہی ہوں حماد۔'' وہ روہانسی ہوئی۔

''دس دن میں شادی...... یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو فاریہ؟'' حماد بری طرح بوکھلایا۔ ٹائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔

''وہی جو تم سن رہے ہو حماد...... پاپا نے ابھی مجھے بتایا ہے شادی کا اور تم...... تم کب تک وہاں اسپین میں رہو گے۔ کیا میری شادی ہوجانے کا انتظار کررہے ہو؟'' فاریہ جھنجھلائے ہوئے انداز میں اس پر برس پڑی۔

''فاریہ آج بھیا جانی کی شادی ہے۔ بس یہ شادی ہوتے ہی میں پاکستان آرہا ہوں اور میں وہاں آتے ہی تمہارے پاپا سے ملاقات کروں گا۔ انہیں ہماری شادی کے لیے کنوینس کروں گا۔'' حماد پریشان ہوا مگر اسے تسلی دیتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

''نہیں حماد ملاقات کرنے اور کنوینس کرنے کا وقت نکل گیا اب اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تمہیں اب میرے لیے انتہائی قدم اٹھانا ہوگا۔'' فاریہ نے کہا۔

''انتہائی قدم...... کیا مطلب فاریہ؟'' حماد ناسمجھی سے بولا۔

''مطلب...... تم کال پر مطلب ہی پوچھتے رہو۔ میری شادی ہورہی ہے اس سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ناں حماد۔ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔'' فاریہ اس سے بدگمان ہوتے ہوئے بھیگے لہجے میں بولی۔

''تم سے محبت نہیں ہے تو پھر کس سے ہے؟ یار پاگلوں کی طرح دن رات تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتا ہوں اور تم میری محبت پر شک کررہی ہو فاریہ؟'' حماد بھی بری طرح

جھنجھلا اٹھا۔
''تو اور کیا کروں حماد...... تم مجھ سے اتنی دور ہو اور یہاں میری شادی طے ہوگئی ہے۔ نہ میں تم سے مل سکتی ہوں، نہ تم مجھ سے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کروں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمہارے بغیر میں جی نہیں پاؤں گی، مر جاؤں گی حماد۔'' فاریہ روہانسی ہوگئی۔
''کیا میں جی پاؤں گا تمہارے بغیر...... تم دور ہوگئی مجھ سے تو مر نہیں جاؤں گا میں؟'' حماد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر فاریہ کے پاس آپہنچے اور اس کے آنسو صاف کرے، ہمیشہ کے لیے اسے اپنا لے۔
''پھر کچھ کرو حماد...... میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔'' فاریہ نے روتے ہوئے کہا۔
''میں بھی صرف...... شبنم۔'' حماد کہتے ہوئے ایک دم چونک کر بولا۔
''شبنم...... یہ شبنم ہمارے بیچ میں کہاں سے آگئی حماد؟'' فاریہ بری طرح سے چونکی۔
''تم یہاں کیا کر رہی ہو شبنم؟'' حماد کا کرخت لہجہ فاریہ کی سماعت کو ہی نہیں حواسوں کو بھی کچھ غلط ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔
''میں یہاں کیا کر رہی ہوں...... میں تمہیں دیکھنے کے لیے آئی ہوں اور تمہیں اپنی تیاری دکھانے کے لیے آئی ہوں۔'' شبنم کا بہکا بہکا لہجہ حماد کو ہی نہیں، کال پر موجود فاریہ کو بھی بری طرح سلگا گیا۔
''اسے کمرے سے باہر نکالو حماد۔'' فاریہ سے برداشت نہ ہوا، وہ کال پر ہی بری طرح چلائی مگر کال کٹ گئی تھی۔
''یہ شبنم...... آخر چاہتی کیا ہے؟ اس کا تو میں دماغ ٹھیک کر کے ہی رہوں گی۔ لگتا ہے اماں بی سے پھر ملاقات کرنا ہوگی۔'' وہ انتہائی طیش کے عالم میں اپنے کمرے سے باہر نکل گئی۔
''ڈرائیور گاڑی نکالو۔'' وہ غصے سے چلاتے ہوئی ڈرائیور کے نزدیک آئی۔
''چھوٹی بی بی جی...... آپ اکیلی باہر نہیں جاسکتیں۔'' ڈرائیور نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔
''اکیلی باہر نہیں جاسکتی...... کیا مطلب اس بات کا؟'' فاریہ نے ڈرائیور کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''چھوٹی بی بی جی...... بڑے صاحب نے آج سے آپ کے باہر آنے جانے پر سختی سے پابندی لگا دی ہے۔'' ڈرائیور نے بخت محل کی بلند و پرشکوہ عمارت کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
فاریہ کی نظریں ڈرائیور کی نظروں کے تعاقب میں بے اختیار بخت محل کی عمارت پر جا ٹھہری۔ دلاور اپنے کمرے کے ٹیرس میں کھڑا اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دلاور کی نگاہیں اور ان سے جھلکتا غصہ فاریہ کو اتنے فاصلے سے بھی اپنے وجود سے لپٹتا محسوس ہوا۔ فاریہ کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔

(ان شاءاللہ باقی آئندہ شمارے میں)

تمہاری ادا کا جواب نہیں

حمیرا افضال

میری فطرت تھی اپنی ہر خوشی کا بڑھ چڑھ کر اظہار کرنے کی۔ میرے دل میں ہی کوئی بات محفوظ رہتی تھی۔ جونہی اچھی خبر کی ہوا کان میں پڑی دماغ شائے شائے اور پیٹ گڑگڑ کی آوازوں میں بولنا شروع کر دیتا اور میں پیٹ کا درد کم کرنے نکل جاتی ہوں۔ محلے کی سہیلیوں کو بتاتی ہوئی اسکول کی دوستوں تک کو سلام کر آتی۔ ہر بھلی بری خبر کو میں مرچ مسالہ لگا کر دوسروں کو سناتی ہوں۔ بچپن میں اماں جب بھی میرا من پسند حلوہ بناتیں، ابا جب جب من چاہا کھلونا خرید کر لاتے، دادی نیا سویٹر بنتیں یا خالہ پھوپو سے بن مانگے خرچی مل جاتی تو میرا دل چین نہ پاتا جب تک ان باتوں کی خوشبو چند سہیلیاں نہ سونگھ لیتیں۔ دادی کبھی پیار سے بیٹا بیٹا کہہ کر میری ان حرکتوں کی ممانعت کرتیں تو کبھی کمبخت بول کریوں کو سنے بیٹھ جاتیں۔

''شبانہ سیانی بن، نہ کیا کر یہ نمائشیں۔ اپنی خوشیوں کا جھنڈا ہر چھت پر لہرانے سے خوشیاں سونے سے پیتل بن جاتیں ہیں۔ کالی نظر کی مار بڑی سخت پڑتی ہے احمق لڑکی۔'' اس لمحے تو دادی کی باتوں کو سمجھنا مشکل تھا۔ خیر ایسے ہی بچپن گزر گیا اور اللہ جنت نصیب کرے دادی جان بھی۔

بچپن کی کلیوں کی جگہ جوانی کے پھولوں نے کھلنا شروع کیا تو زمانے کا رنگ ڈھنگ بھی بدل گیا۔ ابا کے تبادلے صرف اپنی دہلیز ہی نہیں پرانی سہیلیوں کی چوکھٹ بھی چھوٹ گئی۔ اب تو نیا شہر تھا، نئی رونقوں کے مزے چٹخارے اور نئی دوستیاں، دل اور دماغ فائزہ اور شمع سے ہی میل کھاتے تھے۔

میرے شوق میں بھی اب تبدیل آ گئی تھی مگر اب

بچپن کی وہ عادت اب پختہ ہوکر فطرت بن گئی تھی۔ موبائل کا دور تھا نہ فاصلوں کی مجبوری تھی نہ کچھ بتانے میں دشواری۔ چیزیں خرید کر جھٹ سے تصویر لی اور بے دھڑک فائزہ اور شمع کو بھیج کر تعریف وصول کی اترانا اب بھی میرا دلچسپ مشغلہ تھا۔ میں نے نہ کبھی اپنی حرکتوں پہ غور کیا تھا نہ ان کے بارے میں سوچ تھا۔

بی اے کے بعد فائزہ اور شمع نے یوں ہاتھوں میں مہندی رچائی کہ دوستی کا دامن ہی چھوٹ گیا۔ اب تو ہر خوشی ادھوری تھی، نہ باتیں سننے والا کوئی تھا نہ سراہنے والا۔

''تیری زبان تو برف ہی ہوگئی ہے اور شکل دیکھ اپنی جیسے مردنی چھائی ہے۔'' اماں نے اس دن مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور پھر فکر میں بھی مبتلا ہوگئی تھیں اور میری چپ کو انہوں نے توڑنے کے لیے میری شادی کا فیصلہ کیا۔

فاخر کے میری زندگی میں آنے سے میری خوش بختی کی ٹوکری میں ایک اور پھول کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اتنی محبت، اتنا خیال، محبت زیورات کی طرح میری کلائیوں، گردن اور ماتھے سے چمٹی ہوئی تھی۔ دل مچلتا تھا کہ کوئی سہیلی ہو جس کے آگے روز و شب کے حسین لمحات کی پٹاری کھولوں، الماریوں کی شان بڑھاتے ان تحائف کا تذکرہ کروں جو روز فاخر کی جانب سے بنا موقعے اور سبب کے مجھے ملتے رہتے تھے۔ نہ کوئی ہم راز بہن تھی نہ ہم مزاج کزن۔ کبھی کبھی اماں کو فاخر کی اچھائیاں گنواتی تو وہ فوراً میری بلائیں لیتیں اور اس کے بعد نصیحت کرتیں۔

''شبانہ یہ شیخی والی عادت اب چھوڑ دے اور ہر کسی کے آگے خوشگوار زندگی کا اشتہار نہ لگانے بیٹھ جانا۔ بظاہر خیر خواہوں کے دل پہ بھی جلن کے سانپ رینگتے ہیں جھلی۔'' اماں کی نصیحت مجھے ہمیشہ بری لگتی۔ ان کی مصلحت سمجھنے کے لیے میرے دماغ نے کبھی حامی نہ بھری تھی اور آخر اس دن میری دلی حسرتوں کو چین آ ہی گیا جب فاخر کے دوست کے ولیمے میں اتفاقاً میری ملاقات اپنی بچھڑی ہوئی سہیلی شمع سے ہوئی۔ میں نے ایک ایک کر کے کئی سکووں کے حملے کر ڈالے اور وہ بے چاری مسکین سی صورت بنا کر بس صفائیاں دیتی رہ گئی۔ ہماری دوستی پھر سے بحال ہوچکی تھی اب ہم روز کئی کئی گھنٹے فون پر باتیں کرتے۔ میرے پاس پوشیدہ باتوں کا ایک خزانہ تھا جو کب سے باہر نکلنے کے لیے بے تاب تھا۔

شمع کی سننے کی حس اچھی تھی۔ میں روز اسے اپنے پیار، محبت، ٹھاٹ باٹ اور عیش و آرام کی داستان مزے لے لے کر سناتی اور وہ میری خوش نصیبی پر رشک کرتی۔ میں نے شادی کے بعد آنے والی ایک ایک خوشی کی پوٹلی اس کے سامنے کھول کہ رکھ دی تھی۔ منگنی کے بعد کیا کیا تحائف ملے، شادی کس شان سے ہوئی، کہاں ہنی مون پہ گئی۔ یہ سب باتیں میں نے اسے دوسری فون کال پر بتادی تھیں۔ ایک دن خلاف توقع فاخر نے نظر اندازی کی عینک اتار کر مجھے رسانیت سے سمجھایا۔

''شبانہ بے صبر ہوکر اپنی سہیلی پہ اپنی خوشیوں کا اتنا بوجھ مت ڈالو کہ اس کی خوشیاں اس کی محرومیوں کے ملبے تلے دب جائیں۔ یہ نہ ہو کہ تمہارے شوہر کی اچھائیاں نگلتے نگلتے وہ اپنے شوہر کی خوبیاں تھوک دے۔ تم بخوبی واقف ہو کہ تمہاری حیثیت کا مینار اس سے اونچا ہے تو تمہیں نہیں لگتا کہ تمہاری شان و شوکت کی چکا چوند میں اسے اپنی سہولتیں کیڑے مکوڑوں کی طرح دکھتی ہوں گئیں۔'' میں کم فہمی کی ڈگر پر تھی یہ دانش مندوں والی باتیں میرے پلے ذرہ نہ پڑیں۔ الٹا میں یہ کہہ کر تھوڑی ہٹ دھرمی اور بدتمیزی پر اتر آئی۔

''فاخر جب اسے مسئلہ نہیں ہے تو آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ اس کی باتوں سے کبھی کوئی دکھ نہیں جھلکا اس کا مطلب تو یہی ہے کہ وہ بھی اپنے گھر میں آسودہ ہے۔'' اس رات کی باتیں میرے لاپرواذ ہن کی بھول بھلیوں میں کھو گئیں مگر فاخر کے ذہن کی گلیوں میں گردش کرتی رہی تھیں۔ ایک روز میرے دل میں جانے کیا سمائی کہ میں نے الماری سے کھنگال کھنگال کر نئے پرانے تحفے اور زیورات نکالے اور بستر پر سجا دیے۔ میں

ماہر فوٹوگرافر کی طرح ایک ایک چیز کی تصویر کھینچ کر شمع کو سمجھنے میں مشغول تھی کہ اسی لمحے فاخر کمرے میں داخل ہوئے اور شدید غصہ میں یوں چیخے کہ میں سہم گئی۔ انہوں نے چیزیں اٹھا کر زمین پہ پٹخ دیں۔

ہمیشہ پیار محبت اور احترام سے پیش آنے والے فاخر نے مجھے وہ چوٹ دی کہ میں درد کی اتھاہ گہرائیوں میں جا گری۔ خوشیوں سے کھیلتے وجود میں پہلی بار تکلیف نے سرائیت کی تھی۔ نہ دل نے اجازت دی نہ ہاتھوں میں سکت تھی کہ میں اگلے روز شمع کو فون کرتی۔ گرمیوں کا آگ برساتا دن تھا اور میں ٹھنڈے جسم کے ساتھ پورے گھر میں بے کل پھرتی رہی۔ شام کو پہلی بار شمع نے خود فون کیا تھا۔ اس سے پہلے میں کچھ کہتی وہ یوں پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے کوئی اس کا اپنا مر گیا ہو۔

”میں اب اپنے شوہر کے ساتھ بالکل نہیں رہوں گی شبانہ، نہ ان میں خیال رکھنے کا سلیقہ ہے نہ پیار جتانے کا، انہوں نے میرے جوان بدن میں بڑھاپا بھر دیا ہے، میرے دامن میں ان کی اچھائیوں کے فقط چند سکے ہیں اور خامیوں کے لاتعداد سنگ۔ اب اور ظرف کے لبادے نہیں اوڑھے جاتے۔ بخیل محبت اور دن بادن ترقی کرتی غربت نے تن کیا روح تک کو گھائل کر دیا ہے۔ اب اور نہیں اٹھا سکتی اس کھوکھلے رشتے کا بار، ایک چٹان کے ساتھ سر ٹکرا ٹکرا کر مزید نہیں جی سکتی میں۔“ وہ منہ زور آندھی کی طرح اپنی محرومیوں کی ساری دھول میری جانب اچھالتی رہی اور یہی مٹی ندامت کی صورت تہہ در تہہ میرے وجود سے لپٹتی گئی۔

میں اس کی دہائی دیتی آواز کے دائرے سے نکلی تو آگہی نے میرے گرد گول گول چکر کاٹ کر مجھے نوچنا شروع کر دیا۔ میری بے عقلی، لاعلمی، ہٹ دھرمی کسی نے اٹھان نہ بھری۔ میں اپنے گناہ کے اعتراف کی کھائی میں گر گئی، میں مبہوت سی اپنی جگہ چپک کر رہ گئی تھی۔ بے سکونی کی چھریاں میرے وجود کو کھرچ رہی تھیں، پچھتاوا سوچ کی ڈور کو کبھی جوڑ کبھی کاٹ رہا تھا۔ شمع نے میرے

پاس آنے کا کہا اور فون بند کردیا تھا۔ دادی کی باتیں اور فاخرواماں کا سمجھانا اب مجھے سمجھ آرہا تھا۔ میرا تو کچھ نہیں گیا پر میری سہلی کا گھر ٹوٹ رہا تھا اور اب مجھے ہی اس کو بچانا تھا۔

اطلاعی گھنٹی چلائی تو اندر کا شور کچھ تھما۔ وہ آ گئی تھی۔ میں روبوٹ کی سی کیفیت میں دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کے نڈھال وجود اور بے رنگ چہرے کو دیکھ کر مجھے مزید شرمندگی نے گھیرا۔ میں محبت سے اس کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے میں لے آئی جہاں رات کی توڑ پھوڑ کے ثبوت بکھرے پڑے تھے۔ وہ بدحواس سی کبھی مجھے اور کبھی کمرے کی ابتر حالت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی ٹٹولتی نظروں میں اپنی پریشانی کی جگہ اب میری فکر نمایاں تھی۔

''شبانہ یہ سب کیا ہے، تمہارے چہرے پہ یہ زخم کیسے اور ماتھے پہ یہ سفید پٹی؟'' اس کے متفکرانہ سوالات پر میرے آنسو غیرارادی طور پہ چھلک پڑے۔

''شمع رات ہمارے بیچ سخت لڑائی ہوئی ہے اور فاخر نے مجھے بہت مارا بھی۔'' میرے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟ میں تو تمہارے شوہر کو ایک مثالی مرد سمجھتی رہی اور تم نے بھی تو ہمیشہ اسے دیوتا کے روپ میں پیش کیا۔'' وہ حیران ہوئی اور بے یقینی کی چوٹی سے گرنے لگی تھی۔

''وہ بہت اچھے ہیں شمع مگر کچھ خامیاں تو ہر مرد میں ہوتی ہیں۔'' میں نے شرمسار ہوتے ہوئے فاخر کا دفاع کیا۔

''بھاڑ میں جائیں ایسی اچھائیاں جن کے بعد انسان ایسی حیوانیت پر اتر آئے اور ہوتی ہوں گی وہ عورتیں جو مرد کی خامیوں پر پردہ ڈالتی ہوں گی مگر یہ جہالت، درندگی، بے حرمتی ہے۔'' اس نے دانت پیس کر کہا۔

''انسانیت تو تمہارے شوہر میں بھی نہیں ہے بقول تمہارے تم تو اسے چھوڑنے والی ہو۔'' میں نے بھی اسے نیچا دکھایا۔

''ہرگز نہیں، کبھی نہیں چھوڑوں گی انہیں۔ سب شکایتیں ایک طرف مگر انہوں نے کبھی جانوروں کی طرح مجھے ایسے نہیں مارا۔ میں مانتی ہوں وہ آئیڈیل شوہر نہیں پر احساس سے عاری اتنے سنگدل انسان بھی نہیں۔ میں کبھی انہیں چھوڑنے کا غلط قدم نہیں اٹھاؤں گی۔'' وہ اپنے شوہر کی وکالت کرتے اپنے ہی فیصلے کو رد کرتی ہوئی چلی گئی۔

میں نے فرش پر ٹوٹی ہوئی چیزوں سے اپنے اندر کچھ جڑتا ہوا محسوس کیا۔ میں نے جھکا ہوا سر اٹھایا تو سامنے فاخر کو کھڑا پایا۔ فاخر کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ میری اور شمع کے درمیان ہونے والی گفتگو سن چکے ہیں۔ انہوں نے میرے گالوں اور ماتھے کے زخموں کو مسکراتے ہوئے محبت سے چھوا۔ میری ان ساری چوٹوں کو قرار آ گیا جو رات ان کے لفظوں سے میرے ضمیر کو لگی تھیں کیونکہ وہ میرے جھوٹ موٹ کے زخموں کی حقیقت سمجھ گئے تھے۔ مجھے اپنی سہلی کے گھر کو بچانے کے لیے یہ ڈراما تو کرنا ہی تھا کیونکہ اس راہ پر بھی تو میں ہی اسے لائی تھی۔ انجانے میں ہی سہی میں اس کے ساتھ بہت غلط کرتی رہی تھی اور اپنی غلطیوں کا احساس ہوتے ہی ان کی اصلاح بھی تو مجھے خود ہی کرنا تھی۔

''تمہاری اس ادا کا جواب نہیں۔'' فاخر نے پیار سے کہہ کر مجھے خود سے قریب کرلیا تھا۔

آفتاب

ماریہ پارس خان

"عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔" وہ نمانی بھی اس الجھے ہوئے کھیل میں سکہ پھینک بیٹھی تھی۔

پشت در پشت غریب کی اولاد اور دوسری طرف سات کیا چودہ پشتوں سے زمیندار، منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہونے والا راجپوتوں کا اکلوتا چشم و چراغ۔

"آفتاب۔" ہاں وہ آفتاب ہی تو تھا، پورے علاقے کا سلطان خوب صورت اتنا کے لوگ بلائیں لیتے نہ تھکتے تھے، آنکھوں سے وار کرتا تھا جس چیز پر ہاتھ رکھ دیتا وہ بلا مزاحمت اس کی ہوتی۔ کس میں حوصلہ تھا کے نظر بھر کے اسے دیکھ سکے لیکن وہ جرأت کر بیٹھی تھی بلکہ غلطی کر بیٹھی تھی اسے آنکھوں میں اتارنے کی۔ وہ نظروں سے وار کرنے والا تھا اور وہ گرفتار ہوگئی ایک انجانے سحر میں، اب دن ہو یا رات ہر طرف صرف ایک ہی ایک "آنکھوں کا نور...... آفتاب......"

۞......۞......۞

"تتلی۔" شادی کے پورے دس سال بعد پیدا ہونے والی غلام دین کی اکلوتی دھی رانی، نام تو کائنات تھا مگر اس سرخ سپید ننھی پری کو دیکھ کر غلام دین کے منہ سے بے اختیار نکلا "میری تتلی" اور وہیں سے اس کا نام ہی پڑ گیا تتلی، گول مٹول گل گوتھنی، گلابی پھولے ہوئے گال اور بٹن جیسی شہد رنگ آنکھیں...... دیکھنے والا بے اختیار گود میں اٹھا کر چوم لیتا۔ اماں اس کے سنہرے بالوں کی دو چوٹیاں بنا کر آنکھوں میں سرمہ لگا دیتی اور پھر سارا دن اسے دیکھ دیکھ کر صدقے واری جاتی

"میری گڈی...... میری تتلی......"

باپ سارا دن کھیتوں میں کام کرتا، تپتی دوپہر میں ایک گھسا ہوا ٹوٹیرے کا صافہ سر پہ باندھ کر جب سورج سوا نیزے پر آتا اور بھوک سے برا حال ہو رہا ہوتا تو نظر بے اختیار پگڈنڈی کی طرف اٹھتی۔ دور سے کھانا لاتی تتلی کو دیکھ کر جیسے آنکھوں کی روشنی لوٹ آتی، قریب آتے ہی اسے فرط محبت سے سینے سے لگا لیتا۔

"میری تتلی...... میری حیاتی...... ساری تھکن، بھوک پیاس

ختم ہوجاتی۔'' پھر دونوں باپ بیٹی کسی درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ کر کھانا کھاتے، غلام دین پیار سے نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں رکھتا تو وہ بھی باپ کو دیکھ کر ویسا ہی کرتی...... ننھے ننھے ہاتھ سے باپ کے منہ میں نوالہ توڑ کر رکھتی تو وہ کھانے کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی چوم لیتا۔

کھانے سے فارغ ہوکر وہ وہیں اکیلی اسٹاپو کھیلنے لگتی یا درخت سے بندھا جھولا جھولتی رہتی اور غلام دین پھر سے کام پر لگ جاتا، شام ہوتے ہی دونوں گھر کا رخ کرتے اور اگلے دن سے پھر وہی روٹین شروع ہوجاتی۔

ایسے ہی کھیتوں میں گھومتے پھرتے اس کا بچپن گزر گیا اور جوانی کی دہلیز پار کرگئی، پڑھی صرف پانچ جماعتیں تھی اس سے آگے کیسے جاتی، غریب کی اولاد اتنا ہی پڑھتی ہے...... مہینے کے انتیس دن وہ باپ کے ساتھ کھیتوں میں کام کرواتی اچھلتی کودتی پھرتی...... صرف ایک دن غلام دین اسے کھیتوں میں آنے سے منع کرتا کیونکہ اس دن راجپوتوں کا پورا خاندان کھیتوں کی سیر کو نکلتا تھا۔ اس دن وہ گھر میں رہ کر ماں کا ہاتھ بٹاتی، شام کو غلام دین واپس لوٹتا تو زبان پر چھوٹے سائیں کے قصے ہوتے۔

''چھوٹا سائیں شہر سے پڑھ کر آیا ہے، یہ وڈی گاڑی میں بیٹھ کر، کالی پینٹ پہن کر ایک دم بابو لگتا ہے بابو۔'' اور صحن میں ہاتھ والے نلکے کے پاس بیٹھی تتلی کے دل میں انجانی سی خواہش ابھرتی سائیں کو دیکھنے کی...... بچپن سے سنتی آرہی تھی کہ راجپوتوں کا بیٹا بہت سوہنا ہے۔ شہر میں پڑھتا ہے۔

لیکن دیکھا آج تک نہیں تھا۔ وہ مہینے میں ایک دن گاؤں آتا اور بہت شوق سے کھیتوں کی سیر کو نکلتا تھا، اسی روز شام کو بابا گھر آکر اس کے قصے سناتے، اس کی خوبصورتی کی مثالیں دیتے اور وہ ساری رات اس کے نقش بننے میں لگی رہتی۔

''سائیں ایسا دکھتا ہوگا، ایسے بولتا ہوگا، ایسے ہنستا ہوگا......''

ان ہی خوابوں کو بنتے بنتے وہ انجانے میں محبت کی میٹھی برسات میں بھیگتی گئی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ سائیں کو دیکھنے کی خواہش مزید ابھرتی گئی...... سارا مہینہ وہ سوچتی رہتی کہ اس دفعہ تو اماں کو کوئی نہ کوئی بہانہ لگا کر کھیتوں میں جائے گی اور چھوٹے سائیں کو ضرور دیکھ آئے گی اور پھر ہر دفعہ اس دن کے آنے پر ہمت نہ کر پاتی لیکن آخر کب تک...... ایک نہ ایک دن تو بغاوت ہونی ہی تھی...... عشق جب سر چڑھ کر بولتا ہے تو بغاوت تو ہوتی ہی ہے اور جب بغاوت کی تو پھر روگ تو لگتا ہی ہے، سزا تو ملتی ہی ہے۔

❁......❁......❁

دن کافی نکھرا نکھرا سا تھا۔ کئی دنوں سے بادل اور برسات کے بعد آج دھوپ اچھی چمک رہی تھی۔ لوگوں نے بستر چھوڑ کر صحن اور چھتوں کا رخ کیا اور پچھلے کئی دنوں سے رکے ہوئے کام نپٹائے جانے لگے...... تتلی نے بھی اماں کے ساتھ مل کر پورے ہفتے سے جمع شدہ کپڑے دھو کر الگنی پر پھیلانا شروع کیے، بابا آج صبح ہی صبح کھیتوں کو نکل گئے تھے اور جاتے ہوئے اسے پیچھے آنے سے بھی منع کر گئے تھے یعنی آج سائیں گاؤں آئے ہوئے ہیں۔ تتلی کے دل میں عجیب بے چینی سی ہونے لگی......

سارے کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کپڑے بدلے، بالوں میں اماں سے تیل لگوا کر چوٹی بنوائی اور پھر چنے منے سے شیشے میں اپنے چہرے کے نقوش کو تکنے لگی۔ بلاشبہ سوہنی تو وہ بلا کی تھی اور اس بات کا اس کو بخوبی اندازہ تھا...... کچھ دیر یونہی آئینہ تکنے کے بعد نجانے کیا سوچ کر وہ اٹھی اور چپل پاؤں میں اڑسی، ڈوپٹہ اوڑھا اور ایک نظر ساتھ والی چارپائی پہ لیٹی اماں پر ڈالی جو ڈوپٹہ منہ پر ڈالی اونگھ رہی تھیں۔ وہ چپکے سے دروازہ پار کر گئی...... تیز تیز قدم اٹھاتی، چھپتی چھپاتی وہ کھیتوں میں پہنچ گئی، ڈر تھا کوئی دیکھ نہ لے...... دور سے ہی وڈی سی گڈی پوری شان سے کھڑی دکھائی دی دل کو عجیب سی خوشی ہوئی کہ سائیاں بھی ادھر ہی کہیں آس پاس ہوں گے، وہ اپنے سائیں کو دیکھنے والی تھی خوش کیسے نہ ہوتی اور پھر کچھ ہی فاصلے پر سائیں کھڑا نظر آگیا کالی پینٹ میں ملبوس اس کی طرف پشت کیے ہوئے، اگلے ہی لمحے وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور یہی وہ لمحہ تھا جب اس کے دل میں پنپنے والا عشق اس کے روبرو تھا۔

''دیدار یار...... دیدار آفتاب......''

آنکھیں چندھیا ئیں، پانیوں سے بھریں لیکن وہ ٹھنڈی ہوگئی، جی جان سے نیاری ہوگئی...... کچھ فاصلے پر کھڑے آفتاب نے نظروں کی تپش محسوس کی تو حیران ہوکر آس پاس نگاہ دوڑائی اور اس پر آکر ٹھہر سی گئی...... وہ بھی آفتاب تھا اجالے پر چھا جانے والا، تسلط جما دینے والا اور وہ اجالے جیسی تھی نکھری صبح کی مانند پھر وہ کیوں نہ نثار ہوتا، کیسے نہ چھا جاتا۔

سب سے نظر بچا کر وہ اس کے قریب آگیا، درخت کی اوٹ میں وہ ہنوز اسے یک ٹک دیکھنے میں مصروف تھی اس کے کھنکارنے پر جھینپ گئی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' عجیب تحکمانہ اور حکمرانہ سا لہجہ وہ سہم سی گئی۔

''ج..... جی کائنات، کائنات نام ہے میرا۔''

''واہ نائس نیم۔'' آفتاب نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے ناسمجھی کی کیفیت میں نگاہ اٹھا کر دیکھا اور اسے اپنی جانب متوجہ پا کر نظریں جھکالیں۔

''نام پیارا ہے تمہارا..... بالکل تمہاری طرح۔'' وہ تعریف سن کر جھینپی..... جھکی نظریں، گلابی ہونٹ، شرگیں لہجہ، آفتاب کو متحیر کر گیا۔

''اچھا سائیں میں چلتی ہوں ابا دیکھ لے گا۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں بھاگ گئی، آفتاب اسے روکتے روکتے رہ گیا پھر ہاتھ جھٹک کر مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔

وہ جتنا گھبراتی ہوئی گئی تھی اتنا شرماتی، لجاتی، واپس آئی۔ مسکراہٹ تھی کہ رکنے نہ پارہی تھی، گھر میں قدم رکھتے ہی اماں نے آلیا۔

''ارے کہاں گئی تھی؟''

''وہ اماں میں کیتلی کی طرف گئی تھی..... وہ سورہی تھی اس لیے جگایا نہیں اور چپ کر کے چلی آئی۔'' اپنی بات پوری کر کے وہ کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اماں نے اچنبھے سے اسے جاتے دیکھا اور پھر شہادت کی انگلی نچلے ہونٹ پر حیرت سے رکھتے ہوئے آنکھیں گھمائیں۔

''ہائیں..... اسے کیا ہوا۔'' دوسری طرف وہ اکیلی کمرے میں بیٹھی مسکرارہی تھی۔ سائیں کا دیدار جو کرلیا تھا بلکہ بات بھی کرلی تھی۔

وہ آفتاب تھا جس کے حسن کی ایک دنیا دیوانی تھی تو بھلا وہ کیونکر نہ نیازمند ہوتی..... وہ ہوگئی متاثر بلکہ جی جان سے نثار اور پھر ساری رات آنکھوں میں ایک ہی چہرہ، لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ ''آفتاب'' وہ دیوانی ہوگئی، لمحوں میں داسی بن گئی اس حسن کے دیوتا آفتاب کی۔

بے چین صرف وہ ہی نہیں تھی، بے چین اسے بھی کر رہی تھی۔ شہد رنگ آنکھیں اور پھر اگلے ہی دن وہ کھیتوں میں پہنچ گیا۔ غلام دین کو بلاوا بھیج کر کسی کام سے گاؤں سے باہر بھیج دیا اور خود تتلی کے پاس..... وہ شرمائی اور گھبرائی بھی لیکن پھر آفتاب کے محبت بھرے انداز دیکھ کر مطمئن اور نثار ہوگئی..... وہ تو پہلے ہی داسی بن چکی تھی اس نے باتوں باتوں میں مزید جیت لیا اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ملاقات ہر روز ہوتی۔

''تتلی اور آفتاب'' قصے گاؤں والوں کی زبان پہ آگئے..... بے خبر تھے تو صرف دو نفوس۔

''سکینہ اور غلام دین۔''

❁.....❁.....❁

کہتے ہیں..... جب ذہنوں میں سازش اور بغاوت پنپنے لگے تو انہونی ضرور ہوتی ہے اور پھر انہونی ہوگئی اس رات سکینہ اور غلام دین بے سدھ سو رہے تھے وہ اٹھی، چادر لپیٹی اور دبے پاؤں گھر کے پچھواڑے کی طرف بنی کچی مٹی کی چھوٹی سی دیوار کے پاس آگئی۔ جسے وہ بچپن سے پھلانگتی آرہی تھی آج بھلا کیسے نہ پھلانگتی، سائیں کا بلاوا آیا تھا، اس کے من مرشد کا..... محبوب کو ملنے کی جستجو..... رات کا سناٹا، ہو کا عالم، بھونکتے کتے کچھ بھی اس کا تو راستہ نہیں روک سکا، کچھ بھی نہیں وہ بڑھتی گئی فاصلے کو قدموں تلے روندتی اور پھر انہونی ہوگئی۔

''حلال کے لبادے میں لپیٹ کر گناہ کیا گیا۔''

❁.....❁.....❁

صبح صادق وہ اپنے بستر میں موجود تھی۔ اماں نے نماز کے لیے اٹھایا نہیں اٹھی..... ابا نے مسجد سے واپس آ کر دیکھا تیز بخار میں جل رہی تھی وہ جلدی سے حکیم کو بلا لایا..... ماں نے دوا کھلائی، باپ سرہانے بیٹھا پیار سے اس کے بال سہلاتا رہا۔

''رات تو چنگی بھلی تھی، سویرے سویرے پتا نہیں کیا ہوگیا؟'' ہر بات سے بے خبر وہ اس کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے، دو دن وہ بستر سے لگی رہی، اماں ابا سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ رنگ پیلا پڑ گیا تھا، بدن میں جان نہیں تھی، نہ ہلنے کی سکت..... تیسرے دن اکتا کر اٹھ ہی گئی، چپل پاؤں میں اڑسی اور دروازے کا رخ کیا۔

''کہاں جارہی ہے دھی رانی؟'' سکینہ نے اسے باہر کی طرف جاتے دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔

''ابا کے پاس جارہی ہوں کھیتوں میں، دل گھبرانے لگا ہے گھر میں رہ رہ کر۔'' اتنے دن سے سائیں کو دیکھا نہیں تھا۔ دل نے تو گھبرانا ہی تھا۔ وہ کھیتوں میں آگئی درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھی پہروں راہ تکتی رہی، آنکھیں جم گئیں، پر سائیں نا آیا..... پھر یہ روز کا معمول بن گیا، وہ گھنٹوں ایک ہی جگہ نظریں جمائے بیٹھی انتظار کرتی رہتی بعد میں کسی سے پتا چلا کہ سائیں تو شہر جاچکا ہے۔ اب تھا تو صرف انتظار جو آنکھوں میں ٹھہر سا گیا تھا۔

وہ کرتی بھی تو کیا۔
آفتاب سے آنکھ لڑائی تھی اشک بار تو ہونی تھی، روشنی تو ختم ہونی ہی تھی اور جب آنکھوں میں انتظار ٹھہر جائے تو رنگ پیلا پڑ ہی جاتا ہے، یوں جیسے صدیوں کا مریض...... وہ بھی بن گئی مریض عشق...... مرید عشق...... عشق اور مشک آخر کب تک چھپائے جاسکتے ہیں۔ وہ بھی نہ چھپا سکی...... اماں اس کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر گھلتی رہتی...... کلیوں جیسی دھی رانی دنوں میں کملا کر رہ گئی تھی۔

❁......❁......❁

عجیب اداس سی شام تھی۔ ہر طرف حبس کا عالم...... پرندے اپنے گھونسلوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ کبھی کوئی کسی درخت کی شاخ پر بیٹھے بولتا تو ایک وحشت ناک سی آواز فضا میں گونجنے لگتی یوں جیسے صور پھونکا گیا ہو اور پھر فنا کی شروعات۔
اماں جائے نماز پر بیٹھی عجیب بے بسی کے عالم میں خلاؤں میں تک رہی تھی، چہرے پر پریشانی واضح جھلک رہی تھی...... وہ اپنا نحیف سا وجود گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی...... اماں نے اسے دروازے کی طرف جاتا دیکھ کر آج پھر فکر مندی سے وہی سوال کیا۔
"ارے کہاں جا رہی ہے دھی رانی؟" اس کے بڑھتے ہوئے قدم رکے۔ مڑ کر ایک نظر اماں کی طرف دیکھا۔
"دل گھبرا رہا ہے اماں...... کھیتوں میں جارہی ہوں ابا کے پاس۔" جواب آج پھر وہی تھا۔
اماں نے روکنا چاہا پر خاموش رہیں اور وہ دہلیز پار کر گئی...... رخ کھیتوں کی بجائے راجپوتوں کی حویلی کی طرف تھا۔ صبح ہی ابا نے بتایا تھا کہ چھوٹے سائیں گاؤں آئے ہوئے ہیں اور وہ نکل پڑی ایک آس ایک امید کے تحت جو آفتاب نے اسے دلائی تھی۔
"دیکھنا منالوں گی اپنے سائیں کو، کچھ بھی کر کے...... پاؤں پڑ جاؤں گی...... منا کر رہوں گی......" ازلوں سے بھولی عورت خوش فہمی کا دامن تھامے راجپوتوں کی حویلی میں پہنچ گئی۔ اوطاق میں محفل بجی تھی۔ چھوٹے سائیں بڑی شان سے بیٹھے لوگوں کے مسائل حل کر رہے تھے...... وہ بھی پہنچ گئی، فریاد لے کر۔
"کون ہو بی بی...... کیا چاہیے؟" سائیں کی رعب دار مغرورانہ آواز کانوں سے ٹکرائی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگئی۔ ایک جملے نے واضح کردیا زمین اور آسمان کا فرق...... حسین وہ بھی تھی ملکاؤں جیسی، کائنات حسیں وہ بھی آسمان پر جگمگاتا ہوا آفتاب لیکن فرق واضح تھا، وہ اونچائی پر پوری شان سے شملہ سجائے اور وہ گھٹنوں کے بل نظریں جھکائے زمیں پر۔
"وہ سائیں میں......" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں ہی اٹک گئی اور ایک حسین زرق برق وجود اک شان بے نیازی سے چلتا ہوا آ کر آفتاب کے پہلو میں بیٹھ گیا۔
"آفتاب اس کو جلدی فارغ کریں پھر مجھے آپ کے ساتھ کھیتوں کی سیر کو نکلنا ہے۔" اس نے ایک حقارت بھری نظر تتلی پہ ڈالتے ہوئے آفتاب سے کہا...... سامنے بیٹھی تتلی کے اندر ایک چھناکے کی آواز سے کچھ ٹوٹا اور پھر تباہی کے جھکڑ۔
"تو کیا سائیں نے مجھ سے نکاح صرف ایک رات کے لیے ہی کیا تھا...... بے یقینی سی بے یقینی...... وہ دھیرے سے اٹھی اور الٹے قدموں واپس پلٹ گئی، اب کچھ کہنے کی ضرورت تھی نہ فائدہ یہ وہ اچھی طرح سے جان گئی تھی، چال میں لڑکھڑاہٹ دور بیٹھے آفتاب نے واضح محسوس کی اور نظر چرا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ مرے مرے قدم اٹھاتی حویلی سے باہر آگئی...... ٹھیک ہی کہتی تھی اماں وڈے لوگ وڈے ہی ہوتے ہیں ان کی نظر میں ہم کمی کمین قدموں کی خاک سے زیادہ کچھ نہیں، اگر کبھی مٹی میں اگا پھول انہیں پسند آجائے تو فوراً توڑ کر اس کی ساری خوشبو سانسوں میں اتار لیتے ہیں پھر قدموں تلے روند کر آگے بڑھ جاتے ہیں اور وہ پھول خاک میں لتھڑا اپنی بے بسی پر ماتم کرتے ہوئے مرجھا جاتا ہے۔
وہ بھی مرجھا رہی تھی، عشق آفتاب سے کیا تھا جو سارا دن کائنات پر تسلط جما کر غروب ہو جاتا ہے، کالی اندھیری رات چھوڑ کر اور اگلے دن اک نئی تر و تازہ صبح کے ساتھ پوری آب و تاب سے چمکتا دمکتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ اس کا آفتاب بھی غروب ہو چکا تھا اس کے دامن میں سیاہی بھر کر اب اس قرب سے نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ اپنے وجود میں پلتے آفتاب کی نشانی سمیت گاؤں میں پرانے اندھے کنویں کی آغوش میں پناہ گزیں بن گئیں اور دوسری طرف آفتاب ایک نئی صبح کے ساتھ طلوع ہو چکا تھا۔

دل کو کس کا ملال تھا

نادیہ احمد

تمہارے وصل کو وعدوں میں رکھ دیا میں نے
کہ جیسے پھول کتابوں میں رکھ دیا میں نے
چراغ پہلے منڈیروں پہ میں نے رکھے ہیں
پھر انتظار چراغوں میں رکھ دیا میں نے

سورج ڈھلتے ہی مزار کے چبوترے پہ قطار در قطار رکھے دیے، ستاروں کی طرح جھلملانے لگے تھے۔ایک ایک کر کے سب کی خواہشوں کی لو روشن ہونے لگی اور آن کی آن میں وہ دیوار جگمگا اٹھی تھی۔بالکل اس آس کی طرح جو وہاں آئے ہر شخص کو ایسے کسی آستانے تک آنے پہ مجبور کر دیتی ہے۔کسی اتفاق سے معجزے سے تعبیر کر دیتی ہے۔عائشہ کو بیٹھے بیٹھے یک دم یونہی خیال آیا کہ دلوں میں امید کی بجھتی لو نجانے ایسی جگھوں پہ ہی کیوں روشن ہوتی ہے۔سب کچھ جانتے بوجھتے، عقل اور شعور رکھنے کے باوجود فقط ایک ناامیدی انسان کو کتنی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور کر دیتی ہے۔پتھر کو خدا اور قبروں کو معبد سمجھ لیا جاتا ہے۔شاید ہم سب ہی زندگی میں اس مقام سے گزرتے ہیں جہاں ہمیں ہماری ٹوٹتی ہوئی آس اور ڈوبتی ہوئی ناؤ کو بچانے کے لیے ناخدا کی ضرورت پڑتی ہے۔ہم وقتی آسرا چاہتے ہیں۔جھوٹی تسلی سے دل کو بہلاتے ہیں مگر اس کا معاملہ الگ تھا۔اس کی آس ٹوٹی نہیں تھی بلکہ امید ہی ختم ہو چکی تھی۔آسرے کی تمنا وہ کرتا ہے جسے تسلی درکار ہو جبکہ عائشہ کے اندر سے اب ہر تمنا ختم ہو گئی تھی۔دنیا کی امید نے فقط جھوٹی تسلی دی تھی، اندھیرے بانٹے تھے۔اس کی زندگی بھی گل و گلزار ہو گئی تھی۔امید ہی تو تھی کہ اذان کبھی اس کا ہاتھ نہیں چھوڑے گا اور وہ محبت کو نفرت پہ فوقیت دے گا مگر اس نے تو ایک ہی پل میں سب بھلا دیا۔اپنا ہر وعدہ، وہ ساری قسمیں۔یعنی سب دعوے جھوٹے اور زبانی

تھے۔ وقت پڑنے پہ جہاں انہیں پرکھنے کا مقام آیا تو محبت بری طرح ہار گئی تھی لیکن اگر محبت ہار گئی تھی تو کیوں اس کی یاد آج بھی جان کا روگ تھی؟

عائشہ آج بھی کیوں اذان کے انتظار میں تھی۔ یادوں کا سیلاب کیوں ہر پل اسے ماضی کی جانب بہالے جاتا تھا۔ پر کیا ماضی بھلانا اتنا آسان ہوتا ہے؟ کیا فقط فیصلہ کرلینے سے ماضی سے چھٹکارہ ممکن ہے؟

اگر ایسا ہوجاتا تو شاید ہر انسان پرسکون ہوتا اور پھر ہوسکتا ہے اس مزار میں جلتے دئیوں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر ہوتی۔ ہم میں سے اکثر کی تمنا لاحاصل رہتی ہے۔ امید آنے والے کل کی ہوتی ہے مگر درد ماضی کا دامن سے بندھا ہوتا ہے۔ نجانے کیوں پر عائشہ کا ذہن بڑا ہی بے ترتیب ہورہا تھا۔ طبیعت بوجھل اور بے چین تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ آج اچانک اس کے اندر یہ تبدیلی کیوں ہورہی ہے مگر یہ سچ تھا کہ آج وہ بار بار اپنے ذہن میں پرانی باتوں کو دہرا رہی تھی۔ دل ہی دل میں اذان سے لاتعداد شکوے کررہی تھی۔ اس سے بے شمار شکایتیں، غرض وہ تمام باتیں جو چنگاری کی صورت اس کے اندر دبی تھیں اور وہ چنگاری جو آج اتنے مہینوں سے سرد تھی یک دم بھڑکنے لگی تھی۔ ایسا کیوں ہوا تھا وہ سمجھنے سے قاصر تھی مگر جو بھی تھا، یہ پل اس کی اذیت میں اضافہ ہی کررہے تھے۔ نہ تو شکایت سننے والا موجود تھا نہ ہی شکوہ کرکے دل کا بوجھ ہلکا ہوسکتا تھا تو پھر جب اس آگ کی چنگاریوں سے خود اپنی ہی ذات سلگ رہی ہو تو اذیت کیسے نہ بڑھتی؟

وہ اب بھی نظریں انہی دئیوں پہ جمائے صحن کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مزار حسب معمول آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا۔ دیئے اب بھی ٹمٹمار ہے تھے۔ موسم میں خنکی در آئی تھی اور آج ہوا بھی سرد تھی۔ شاید پچھلے دنوں ہوئی بے تحاشا بارش کا اثر تھا اور کچھ ہوا بھی تیز چل رہی تھی۔ یک دم ہوا کے تیز جھونکوں نے دئیوں کی لو سے اٹھکیلیاں شروع کردیں اور پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایک کرکے بہت سے دیئے بجھ گئے۔ ہوا اور آگ کا یہ کھیل ہرگز کوئی نیا تماشا نہ تھا بلکہ وہ گزرے کئی مہینوں میں بہت بار یہ منظر دیکھ چکی تھی مگر آج وہ پہلے جیسی لاتعلق اور لاپروا نہیں رہی تھی۔ اپنی نظروں کے سامنے بجھتے دئیوں کو دیکھ کر یک دم ہی وہ بے چین سی ہوکر چبوترے کی طرف بڑھی، ایک جلتے دیئے کو اٹھا کر اس نے جلدی جلدی بجھے ہوئے دیئے جلانے شروع کردیئے مگر ہوا بھی جیسے سرکش ہوچکی تھی۔ عائشہ دیئے جلا رہی تھی اور ہوا کا جھونکا انہیں بجھا دیتا مگر وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھی پھر فرصت بھی بہت تھی، لہٰذا یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ جب تک دئیوں کا تیل ختم نہیں ہوگیا عائشہ انہیں جلانے کی کوشش کرتی رہی۔

اپنی امید تو بجھ چکی تھی کسی اور کی آس کا دیا تو روشن رہنا چاہیے تھا۔ روشن سائیں کھانا لے کر آیا تو وہ چبوترے پہ کھڑی آخری دیئے کی مدہم ہوتی لو کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے اسے ہوا سے بچانے کی کوشش کررہی تھی۔ عائشہ کی پشت ان کی طرف تھی، ان کی موجودگی کا احساس ہوا تو پلٹ کر دیکھا، آج حسب معمول روشن سائیں کے چہرے پہ اسے دیکھ کر مسکراہٹ نہیں آئی تھی بلکہ وہ کچھ تھکا تھکا یا شاید دکھ اور مایوسی کی کیفیت میں تھا۔ عائشہ انہیں دیکھتی رہی مگر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ کھانے کی پلیٹ وہاں رکھ کر بناء کچھ کہے واپس لوٹ گیا اور جاتے ہوئے مزار کے آہنی دروازے کو تالا لگا گیا۔ عائشہ کو شدید حیرت ہوئی کیونکہ اتنے مہینوں میں ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ عائشہ جواب نہ بھی دیتی تب بھی وہ ہمیشہ اس سے کوئی ناں کوئی بات ضرور کرتا تھا۔ چند منٹ ہی مگر وہ وہاں ضرور بیٹھتا اور ایک بات اسے یاددہانی بھی ضرور کرواتا تھا کہ وہ یہاں سے چلی جائے، کہیں حویلی تک خبر چلی گئی تو مصیبت بن جائے گی۔ عائشہ کا اس رویے پہ چونکنا فطری تھا بہرحال وہ فقط تجسس ہی کرسکتی تھی جو کہ وقتی تھا۔

دئیوں میں تیل ختم ہوچکا تھا اور وہ آخری لو بھی دھیمی ہوکر بجھ گئی تھی۔ عائشہ نے ایک نگاہ چبوترے کو دیکھا اور پھر گہرا سانس لیتی واپس پلٹ گئی تھی۔

❁.....❁.....❁

وہ جو عشق تھا وہ جنون تھا
یہ جو ہجر ہے، یہ نصیب ہے

یہاں کس کا چہرہ پڑھا کروں
یہاں کون اتنا قریب ہے
میں کسے کہوں کہ ساتھ چل
یہاں سب کے سر پہ صلیب ہے

اب تو یہ تاریک زندان ہی اس کا مقدر تھا۔ جہاں نہ صبح کی کرن کو اجالا بکھیرنے کی اجازت تھی اور نہ ہی ڈوبتے سورج کی سنہری چادر اوڑھے شام اپنی چھب دکھلا سکتی تھی۔ یہاں ہر وقت ایک سا ماحول تھا۔ گھٹن زدہ تاریکی میں چالیس واٹ کے بلب کی زرد روشنی جو اجالا کم وحشت زیادہ طاری کرتی تھی اور جس کی آنکھوں کو چبھتی روشنی ہر وقت ذہن کو بوجھل رکھتی۔ جب تک کیس چل رہا تھا اسے جیل میں بہتر جگہ رکھا گیا تھا لیکن سزا کے بعد سے اسے جس کوٹھری میں رکھا گیا تھا وہ جگہ از خود سزا جیسی ہی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ تختہ دار اس وحشت زدہ نیم تاریک سیل سے بہتر ہوگا۔

''ملاقات آئی ہے تمہاری۔'' سیل کا دروازہ کھولے سپاہی نے اکھڑے ہوئے انداز میں آ کر اطلاع دی۔

''میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ جو بھی آیا ہے اس سے کہو واپس چلا جائے۔'' اس نے بناء دیکھے سنجیدگی سے کہا۔ وہ جانتا تھا اس کا وکیل اور گھر والے اس کی سزا کے خلاف اپیل کا کیس تیار کر رہے ہیں اور اسی سلسلے میں روزانہ اس سے ملنے آ رہے ہیں جبکہ وہ انہیں منع کر چکا تھا کہ اسے سزا کے خلاف اپیل نہیں کرنی۔

''تو یہ بات تم خود اسے جا کر کہہ دو، یہاں بیٹھ کر مجھ پہ حکم مت چلاؤ۔'' سپاہی نے ایک بار پھر اسی انداز میں بات کی۔ وہ پہلے ہی اس کے اکڑ مزاج سے تنگ تھا۔ جس میں کوئی مجرمانہ پن تو تھا نہیں ہاں مگر اکڑ بہت تھی۔ اذان پہ جیسے اس کی باتوں کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہنوز اسی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''ارے اٹھو بھی۔'' اس کی ڈھٹائی پہ نالاں سپاہی نے غصے سے آگے بڑھ کر لات مارتے حکمیہ انداز میں کہا۔

''پتا نہیں کون ہے بیچاری اور اللہ جانے کتنی لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہے۔ نواب صاحب کہہ رہا ہے ملنا نہیں ہے۔'' اس کی بڑبڑاہٹ پہ چونک کر پہلی بار اذان نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے اب بھی کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بناء کچھ کہے باہر نکل گیا تھا۔

❁......❁......❁

''سامعیہ بھابی آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ جگہ ہرگز ایسی نہیں کہ ہمارے گھر کی عورتیں یہاں آئیں۔ میں نے بی بی جان کو بھی منع کیا ہے اور آپ.....'' اس وقت وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتا تھا اور وہ سب اس سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔ وہ انہیں اپنی وجہ سے تکلیف میں دیکھ کر ہرگز خوش نہیں تھا۔ زندگی سے بیزار تھا کہ اب زندگی کی خواہش ہی نہیں تھی لیکن اس کی وجہ سے جو اس کے اپنے درد سہہ رہے تھے ان کا دکھ اسے اذیت دے رہا تھا۔ اسی لیے وہ ان سے ملنے سے گریزاں تھا مگر اس کی بات کوئی مانتا ہی کب تھا۔ وہ اپیل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا وکیل بضد تھا۔ وقت مٹھی سے ریت بن کر نکل رہا تھا اور ان کے لیے آنے والا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ آج صبح بھی وکیل اس سے یہی مغز ماری اور بحث کے بعد ناکام واپس گیا تھا اور اب اچانک سامعیہ اس سے ملنے آ گئی تھی۔ یقیناً اسے بھی بی بی جان نے ہی بھیجا تھا۔

''آپ سے ایک بار ملنا ضروری تھا اذان بھائی۔ ویسے بھی میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔'' اس نے بات کاٹتے دھیمے اور رنجیدہ لہجے میں کہا۔

''معافی کس بات کی؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔ وہ تو اس کے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور ہی سمجھا تھا لیکن سامعیہ کے چہرے پہ لکھی درد کی تحریر کچھ اور عندیہ سنا رہی تھی۔

''قصور تو بہت ہیں لیکن میں اس وقت صرف اس گناہ کی معافی مانگنے آئی ہوں جو فقط میری ذات سے منسوب ہے، جو میرے ضمیر پہ بوجھ ہے اور بدقسمتی سے میں اس بوجھ کو ہلکا نہیں کر سکتی۔ اس لیے نہیں کہ میں سچ کہنے سے ڈرتی ہوں بلکہ اس لیے کہ میرا یہ سچ آپ کی جان پھر بھی نہیں بچا سکتا۔'' اس نے تاسف سے اذان کو دیکھا۔ وہ بناء کہے بھی جیسے اس کا مفہوم سمجھ گیا تھا اس لیے فقط ایک گہرا سانس لیتے نظریں جھکا لیں۔

''ہم جس معاشرے کا حصہ ہیں یہاں سچ کو ثابت کرنا

سب سے مشکل کام ہے۔ جھوٹ تو سب آسانی سے مان لیتے ہیں مگر سچ؟ سچائی پہ تو کوئی یقین ہی نہیں کرتا۔ آپ نے بھی تو عائشہ کی سچائی کا یقین نہیں کیا تھا۔" وہ جتا گئی۔

"بھابی......" اس نے تڑپ کر کچھ کہنا چاہا مگر پھر لب بھینچ گیا۔

"اذان بھائی میں جانتی ہوں آپ بے گناہ ہیں اور شاید یہ بھی اندازہ ہے کہ اصل مجرم کون ہے مگر یہ ثابت کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" سامعیہ جو کہنے وہاں آئی تھی اس پہ نہ صرف پشیمان تھی بلکہ کافی حد تک بے بس بھی تھی۔ وہ شرجیل کے اس جرم کو چھپانے پہ مجبوری تھی کیونکہ اپنا گھر آڑے آرہا تھا۔

"مگر میرے پاس تو ثبوت بھی ہیں، خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے بھی اور شرجیل کا گناہ بھی......" سامعیہ نے بے یقینی سے اذان کو دیکھا۔ اذان کا انکشاف بہت ہی حیران کن تھا اور اس سے بڑھ کر حیرانی یہ تھی کہ وہ ان شواہد کو اپنے حق میں استعمال نہیں کر رہا تھا۔

"اذان بھائی۔ اگر آپ سچائی جانتے ہیں تو اپنا دفاع کیوں نہیں کر رہے، کیوں اس جھوٹے الزام کو اوون کر رہے ہیں۔ کس کے لیے اپنی جان گنوانا چاہتے ہیں؟" اس نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

"کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ شاید یہی وہ طریقہ ہے جس سے میں اپنے گناہ کا ازالہ کر سکتا ہوں۔" اذان نے دھیمے اور بے بس انداز میں کہا۔

"کون سا گناہ؟" وہ سمجھی نہیں۔

"محبت میں بدگمانی کیا کسی گناہ سے کم ہے؟" وہ زخمی لہجے میں مسکرایا۔

"میرے ایک لمحے کے جنون نے میرے سب قول و قرار چکنا چور کر دیئے۔ یہاں تک کہ میں اسے تحفظ دینے کے اپنے وعدے سے بھی مکر گیا۔ کہاں جائے گی وہ، کس حال میں ہوگی۔ ان سب باتوں کے بارے میں، میں نے ایک بار بھی نہیں سوچا۔ ہمیشہ کی طرح صرف اپنی ذات کو اہمیت دی۔ اپنی تکلیف کو محسوس کیا۔ آپ کو لگتا ہے کہ یہ گناہ قابلِ معافی ہے؟ غصہ و بدگمانی وقت کے ساتھ پشیمانی بن کر تڑپا رہی ہے۔ جس کے ساتھ جینے کی آرزو تھی جب اسی کو زندگی سے بے دخل کر دیا تو زندگی کی تمنا ہی بے معنی ہوئی۔"

"آپ عائشہ کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔ وہ یہیں ہوگی، کہاں جائے گی۔" سامعیہ نے سمجھانے کی کوشش کی۔ کچھ بھی تھا مگر وہ اب عائشہ کے لیے اور بھی فکر مند ہو چکی تھی۔

"ڈھونڈنا ہی تو نہیں چاہتا اسے اب میں۔ اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" اس نے لب بھینچے شرمندگی سے جواب دیا۔

"اذان بھائی......" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اذان نے بے ساختہ ٹوک دیا۔

"بھابی آپ میری وجہ سے پریشان مت ہوں۔ میں زندگی میں پہلی بار خود کو پرسکون محسوس کر رہا ہوں۔ میری وجہ سے آپ دوبارہ شرجیل سے مت بگاڑیں۔ بہت تکلیف کے بعد آپ کی زندگی میں سب کچھ نارمل ہوا ہے۔" اس کی اپنی زندگی تو بکھر چکی تھی اور وجہ بھی وہ خود ہی تھا مگر وہ سامعیہ کا گھر آج بھی ٹوٹتا نہیں دیکھ سکتا تھا پھر اب تو اس کا بچہ بھی اس دنیا میں آچکا تھا۔

"یہی تو غلط فہمی تھی مجھے کہ سب نارمل ہو گیا ہے۔ آئینے میں اگر ایک دراڑ آجائے، تو وہ کبھی پہلے جیسا عکس نہیں دے پاتا۔ رشتوں میں آئی دراڑیں بھی کبھی نہیں بھر سکتیں۔" وہ بے بسی سے مسکرائی۔

"کمال ہے آپ ایک طرف مجھے امید دے رہی ہیں اور دوسری طرف خود اپنے تعلق سے مایوس ہو چکی ہیں۔" اس نے حیرت سے جتایا۔

"آپ کا اور عائشہ کا معاملہ کچھ اور ہے۔ آپ دونوں میں جو غلط فہمی ہے وہ ختم ہو سکتی ہے۔ آپ نے اسے دھوکا نہیں دیا۔ آپ نے محبت کے فریب میں الجھا کر اسے بیوقوف نہیں بنایا۔ میں تو ایک بار پھر شرجیل کی محبت کے دھوکے میں آکر ان پہ بھروسا کر بیٹھی ہوں۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ انسان دھوکے کے ساتھ کب تک زندگی بسر کر سکتا ہے۔" وہ نہیں جانتی تھی یہ کھیل کب تک چلے گا۔ شرجیل کے چہرے سے یہ

نقاب کب اترے گا اور کب وہ اپنی اصل صورت میں سامنے آ کر سامعیہ کے پیروں تلے سے زمین نکال دے جبکہ اس بار وہ ذہنی طور پہ تیار تھی۔

''اذان بھائی میری آپ سے ایک ریکوئسٹ ہے۔ اگر آپ کے اختیار میں کچھ ہے، کوئی بھی ایسا ثبوت ہے جس سے آپ کی جان بچ سکتی ہے تو پلیز۔ اپنا نہیں تو سنبل آنٹی اور بی بی جان کا خیال کیجئے۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے وہ دونوں کس قدر تکلیف میں ہیں۔'' اس نے التجا کی۔

''وہ تو صرف تکلیف میں ہیں اور میں جو احساس جرم کے بوجھ تلے دبا ہوں۔ میں کیسے نکلوں گا اس بوجھ اور اذیت سے۔'' وہ جانتا تھا اس نے ساری عمر اپنوں کو فقط دکھ دیئے ہیں۔ وہ کبھی ان کی خوشی کی وجہ نہیں تھا اور بدقسمتی سے آج بھی انہیں دکھ ہی پہنچا رہا تھا۔

''کیا آپ نہیں چاہتے عائشہ محفوظ رہے؟ شرجیل آج نہیں تو کل اسے تلاش کرلیں گے۔ آپ کے بعد کون ہوگا اسے بچانے والا؟'' سامعیہ نے احساس دلایا۔

''اذان بھائی.....'' وہ اب سامعیہ سے پیٹھ پھیرے کھڑا تھا۔ لاتعلق و بے نیاز۔ جیسے اس کی بات سن کر بھی ان سنی کردی ہو۔ اب اس سے آگے وہ کیا کہتی جب اذان کچھ سننا اور سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ سامعیہ وہاں سے مایوس لوٹ گئی تھی۔

❁.....❁.....❁

فجر کی اذان فضا میں گونج رہی تھیں۔ پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگی تھی۔ مہینوں سے وہ پوری نیند نہیں سوئی تھی۔ بس یونہی کبھی بیٹھے بیٹھے دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ لیتی مگر اس نیند میں بھی حواس چوکنے ہوتے۔ اردگرد کا احساس ہمیشہ رہتا، چادر سے منہ نکالے اس نے دروازے کو دیکھا جہاں اب بھی تالہ لگا تھا۔ روشن سائیں اب تک نہیں آیا تھا۔ وہ سستی سے اٹھی کیونکہ کل رات کھانے کے بعد اس نے مزار کا صحن صاف نہیں کیا تھا۔ ورنہ تو روز رات کو ہی جھاڑو لگا دیتی تھی لیکن رات کو ہمت ہی نہیں ہوئی۔ شاید اسے بخار تھا۔ اذان کے بعد اب اقامت ہو رہی تھی جب وہ جھاڑو لگا کر فارغ ہوئی مگر روشن سائیں اب بھی نہیں آیا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے نظر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تو صبح کی سفیدی رات کی چادر سے سر نکالنے لگی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ روشن سائیں اتنی دیر تک وہاں نہ آئے۔ وہ ہمیشہ اس کی فکر کرتا تھا اور ایسا ممکن نہ تھا کہ عائشہ اس پل اس سے بے نیاز رہ پاتی۔ وہ جانتی تھی احاطے کے اندر سے بھی اس کے کمرے میں جایا جاسکتا تھا، اس کے لیے مزار کا دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ اس کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بند دروازے پہ دستک دے کر وہ اس کے کھلنے کا انتظار کرتی رہی۔ چند لمحوں بعد روشن سائیں دروازہ کھولے باہر آگیا۔ کل رات کی طرح اس وقت بھی اس کے چہرے پہ سنجیدگی تھی یا شاید دکھ تھا جو اس پل اس کی جھریوں سے جھانک رہا تھا۔

''کیا بات ہے بابا، آج نماز پڑھنے نہیں آئے؟'' اس نے فکرمندی سے پوچھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید روشن سائیں اپنی حیرت کا اظہار کرتا کیونکہ یہ پہلی بار تھا جو وہ خود سے اس سے بات کررہی تھی۔ ورنہ تو برائے نام اور گول مول جواب بھی دیتی تو اسے غنیمت لگتا تھا۔

''بس طبیعت کچھ بوجھل ہورہی تھی، اس لیے کمرے میں ہی نماز پڑھ لی۔ خیر تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ اندر آجاؤ۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا ساتھ ہی اسے اندر آنے کا کہہ کر خود بھی جلدی سے پلٹ گیا۔ کچھ سوچتے ہوئے عائشہ اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔

''چولہے پہ چائے رکھی ہے، شکر ہے ابلی نہیں۔'' وہ چولہے کی آنچ ہلکی کرتے تشکر سے بولا۔

''کیا بخار ہورہا ہے؟'' عائشہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''ارے نہیں بخار نہیں ہے۔ بس کہا ناں طبیعت کچھ بوجھل ہورہی ہے۔'' اس نے یک دم سر نفی میں ہلاتے دھیمے اور پرسوچ سے انداز میں کہا۔ چائے پیالیوں میں نکالی، وہ کمرے میں بچھی چٹائی پہ آلتی پالتی مارے بیٹھ گیا۔ مجبوراً عائشہ کو بھی بیٹھنا پڑا۔

''وہ حویلی والے ہیں ناں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بڑا خیال رکھتے ہیں غریبوں کا۔ اتنا صدقہ خیرات کرتے ہیں، کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا انہوں نے اپنے گھر سے۔'' گرم

چائے کا گھونٹ بھرتے وہ دکھی لہجے میں بولا۔ عائشہ کی چائے کا پیالہ اس نے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''کیا ہوا انہیں کوئی پریشانی ہے کیا؟'' حویلی والوں کا ذکر اکثر وہ عائشہ سے کرتا جس میں نوے فیصد گفتگو ان کی فیاضی اور تعریف پہ مبنی ہوتی تھی۔ عائشہ جانتی تھی وہ ان کا کتنا دم بھرتا ہے اور شاید اسی لیے وہ ان کی وجہ سے اتنا پریشان ہے کیونکہ وہ اس کا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ اسے کوئی تجسس تھا نہ ٹوہ، یہ سوال تو اس نے روشن سائیں کا دل ہلکا کرنے کی خاطر کیا تھا جو کسی غیر کی تکلیف پہ کل رات سے اتنا بے چین تھا۔ عائشہ صرف اس کی دلجوئی چاہتی تھی ورنہ اسے حویلی والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''پریشانی تو بہت چھوٹا لفظ ہے بیٹا، مجھے تو لگتا ہے قیامت ٹوٹ پڑی ہے ان پہ۔'' وہ بڑے بوجھل اور دل گرفتہ انداز میں بولا۔

''بڑی بیگم صاحبہ ہیں ناں۔ ہاجرہ بیگم.....'' اس نے دکھی لہجے میں کہنا شروع کیا۔ عائشہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''ہارٹ اٹیک آیا ہے انہیں۔'' روشن سائیں کی تاسف میں ڈوبی آواز پہ عائشہ نے ایک پل کو نگاہ اٹھائیں اور غیر محسوس سے انداز میں سر کو جھٹکتے اپنا چائے کا پیالہ اٹھایا۔ اتنا تو اندازہ تھا اسے کہ وہ جن کا ذکر کر رہا ہے خاصی ضعیف خاتون ہیں اور اس عمر میں ہارٹ اٹیک کا ہونا عام بات تھی۔ کم سے کم عائشہ کے لیے جس نے اپنی ماں کو کینسر جیسے موذی مرض سے گھلتے فقط چند ماہ میں کھو دیا تھا۔

''پہلے جوان بیٹے کی موت کا غم اور اب پوتے کو پھانسی کی سزا۔ آشیانہ والوں پہ تو برسوں بعد غم کا ایک نیا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔'' وہ اب اپنی ہی رو میں بیٹھا دکھی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اپنی چادر کی اوٹ میں چائے کا پیالہ تھامے اس کا ہاتھ بری طرح کانپا۔

''آشیانہ؟'' اس نے نظریں اٹھائے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں حویلی کا نام ''آشیانہ'' ہی تو ہے۔'' یہ انکشاف نہیں تھا بلکہ بجلی گری تھی اس پہ۔ چائے کا پیالہ ہاتھ سے نہ رکھتی تو یقیناً گر کر ٹوٹ جاتا۔

''اور وہ حویلی کس کی ہے بابا؟'' اس نے یک دم بے چینی سے پوچھا اور اس کے جواب سے پہلے جیسے خود ہی تصدیق کی تھی۔

''اذان علی کی؟'' روشن سائیں نے بے اختیار سر ہلایا۔ عائشہ کو لگا اس حجرے کی چھت اس کے سر پہ آ گری ہے۔ یعنی اتنے مہینوں سے وہ اذان کی زمینوں پہ تھی، اس کے گھر سے آئے رزق سے پیٹ بھر رہی تھی، اسی کی بنائی چھت کے نیچے رہ رہی تھی۔ اس سے دور ہو کر بھی اس کی پناہ میں تھی۔ اس کی خواہش پہ اسے چھوڑ چکی تھی مگر آج بھی اس کی حد سے باہر نہیں جا سکی لیکن اس سے بڑا انکشاف جو روشن سائیں اسے اذان کے متعلق بتا چکا تھا۔

''ہاں..... کیا تم جانتی ہو اسے؟'' اس نے چونک کر سوال کیا۔

''نہیں شاید نام سنا تھا کسی سے۔'' اس نے بہ مشکل اپنی آواز کی کپکپاہٹ پہ قابو پاتے بات مکمل کی۔

''ڈرائیور آیا تھا کل نیاز دینے آشیانہ سے۔ وہی بتا رہا تھا مجھے۔ کروڑوں کی جائیداد ہے لیکن سزا سے نہیں بچا سکتے۔ بس اسی غم میں بڑی بیگم صاحبہ نے بستر پکڑ لیا ہے۔ اب تو شہر کے بڑے اسپتال لے گئے ہیں انہیں۔'' روشن سائیں اب اسے مزید تفصیلات بتانے لگا اور عائشہ کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا پتا پوتے سے پہلے دادی دنیا چھوڑ دے۔'' اس نے دھیمے اور دکھی انداز میں تاسف سے کہتے پاس رکھا اخبار عائشہ کی طرف بڑھایا۔

''اخبار میں چھپا ہے دیکھو۔'' عائشہ نے ایک دم اخبار پکڑے جلدی جلدی صفحے پہ نگاہ دوڑاتے اس خبر کو تلاش کر کے پڑھنا شروع کیا۔ کافی بڑی اور تفصیلی خبر تھی جسے سنسنی خیز بنانے کے لیے حسب منشاء مرچ مصالحہ بھی لگایا گیا تھا۔ وہ یک دم ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کہاں جا رہی ہو بیٹا؟ تم نے چائے تو پی ہی نہیں۔'' روشن سائیں نے پیچھے سے پکارا۔

''بیچاری یہ بھی میری طرح دکھی ہو گئی۔'' دکھی لہجے میں

کہتے اس نے اپنا چائے کا پیالہ ہونٹوں سے لگالیا۔

❁......❁......❁

وہ پچھلی کئی راتوں سے بے چین تھی۔ سچ کیا تھا سامعیہ اب یہ جان چکی تھی۔ شرجیل جتنا غیر جانبدار اور لاتعلق دکھائی دے رہا تھا اور اس کے بدلے ہوئے انداز سے سامعیہ نے جو دھوکا کھایا تھا، اس کا پردہ بھی کسی حد تک سامعیہ کی آنکھوں سے ہٹ گیا تھا۔ پھر اذان سے مل کر تو اس کے شبہات اور بھی قوی ہو چکے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ قتل شرجیل نے نہ کیا ہو مگر اس کی شمولیت تو یقیناً تھی اس میں اور سامعیہ کو پتا نہیں کیوں اب شک تھا کہ وہ عائشہ کے متعلق بھی ضرور جانتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عائشہ اس کے پاس ہو اور وہ ایک بار پھر سامعیہ کو دھوکا دے رہا ہو۔

”تم سوئی نہیں اب تک سمی؟“ شرجیل کی آنکھ کھلی اور سامعیہ بیڈ کراؤن پہ سر ٹکائے اپنے ذہن کی گتھیاں سلجھا رہی تھی۔ کئی دنوں کی پریشانی ایک طرف اور اب رات کو بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

”نیند نہیں آرہی۔“ اس نے شرجیل کو دیکھتے آہستہ سے کہا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“ شرجیل نے بیڈ سائیڈ پہ رکھے موبائل فون کو اٹھا کر وقت دیکھتے سوال کیا۔

”ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے بس ذہن کچھ الجھا ہوا ہے۔“ اس نے دھیمے اور الجھے لہجے میں کہا۔

”کون سا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کررہی ہو جو ذہن اتنا الجھا ہوا ہے۔“ وہ ہلکا سا مسکرا کر اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔ سامعیہ کی سمت کروٹ لیے وہ اب اسی کو دیکھ رہا تھا۔

”میں سوچ رہی تھی عائشہ کہاں ہوگی اس وقت؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اسے اذان بھائی کی سزا کے بارے میں نہ معلوم ہو۔“ شرجیل کے چہرے کی مسکراہٹ میں شگاف پڑا اور یک دم ہی وہ سنجیدہ ہوا۔ دوسری طرف سامعیہ کا چہرہ تو سنجیدہ ہی تھا۔ وہ دونوں چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے اور پھر شرجیل نے سر جھٹکتے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

”یہ نہ تمہارا مسئلہ ہے نہ میرا، پھر کیوں تم اس وقت اس ٹاپک میں اپنا سر کھپا رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔ یہ پہلی بار تھا کہ سامعیہ نے اس سے عائشہ اور اذان کا ذکر کیا تھا ورنہ جب سے ان میں دوبارہ مفاہمت ہوئی تھی سامعیہ نے اس سے کبھی عائشہ یا اذان کی کوئی بات نہیں کی تھی، یہاں تک کہ عائشہ کی گمشدگی، اذان کی قید اور راہینہ کے قتل جیسے بڑے مسئلہ پہ بھی اس نے شرجیل سے کچھ نہیں کہا تھا اور اس کی وجہ خود شرجیل تھا جس نے اسے صاف منع کردیا تھا کہ وہ کبھی اس سے عائشہ کے حوالے سے بات نہیں کرے گی۔

”ہوسکتا ہے کہ یہ میرا مسئلہ نہ ہو لیکن کیا یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے؟“ اس نے دھیمے مگر جتاتے سے انداز میں کہا۔ شرجیل کے ماتھے پہ بل نمایاں ہوئے۔

”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ اس نے یک دم ہی سر اٹھا کر سامعیہ کو دیکھا۔ اس کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

”اتنا مشکل سوال تو نہیں کیا میں نے جو آپ بھی میری ہی طرح الجھ گئے ہیں۔“ اس کا لہجہ اب بھی وہی تھا۔ دھیما مگر جتاتا ہوا۔ وہ اب بھی شرجیل کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور شرجیل کو ان آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ کر خوف محسوس ہوا تھا۔ تو کیا وہ سچ جان چکی تھی یا پھر یونہی اندازے سے اندھیرے میں تیر چلا رہی تھی۔

”میں ایسے بے تکے اور فضول سوالات کے بارے میں سوچنا بھی وقت کا ضیاع سمجھتا ہوں اور تم کیوں ان دونوں کا ذکر کررہی ہو میرے سامنے؟“ وہ یک دم خفگی سے بولا۔ ”یاد ہے میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ جب میں ماضی کو فراموش کرکے تمہارے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزار رہا ہوں تو کیوں تم گزری باتوں کو حوالہ بنا کر مجھے طعنہ دے رہی ہو سمی؟“ وہ اب اسے جذبات کے کھیل میں الجھا رہا تھا۔

”طعنہ نہیں دے رہی۔ بس ایسے ہی ایک خیال آیا تھا میرے دل میں کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ عائشہ اتنے مہینوں سے لاپتا ہو اور آپ اس سے بے خبر ہوں۔ کیونکہ ماضی میں اتنا کچھ ہو چکا ہے، آپ کا اس کے لیے وہ جنون اور تڑپ۔ وہ سب اگر میں نے نہ دیکھا ہوتا تو شاید میرے دل میں بھی یہ سوال نہ

اٹھتا لیکن......"

"سمی میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے عائشہ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔" اس نے بے اختیار سامعیہ کی بات کاٹتے پریقین لہجے میں کہا۔ وہ واقعی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ حالانکہ پچھلے کئی ماہ سے وہ مسلسل اس کی تلاش میں تھا لیکن اب تک فقط مایوسی ہوئی تھی اس کے باوجود وہ ابھی تک ناامید نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ عائشہ کو ڈھونڈ لے گا۔

"اور کیا یہی قسم کھا کر آپ مجھے یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ کی راہینہ اور اذان بھائی والے کیس میں کوئی انوالومنٹ نہیں ہے۔" سامعیہ کا یہ سوال شرجیل کو گنگ کر گیا۔ چند لمحے تک تو وہ اسے کوئی جواب ہی نہیں دے پایا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا اس بات سے، تمہیں لگتا ہے راہینہ کا قتل میں نے کیا ہے؟" اس نے چڑ کر کہا۔

"مجھے اتنا تو یقین ہے کہ اسے اذان بھائی نے نہیں مارا۔" وہ پورے یقین سے بولی۔

"اس جنونی شخص کی خاطر تم مجھ پہ اتنا بڑا الزام لگا رہی ہو۔ آخر رشتہ کیا ہے تمہارا اس آدمی سے جس کی خاطر ہر بار تم میرے خلاف کھڑی ہو جاتی ہو۔" تیز اور غصیلے انداز میں کہتا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، وہ اسے اپنے لہجے کی تندی سے ڈرانا چاہتا تھا مگر سامعیہ ذہنی طور پہ پوری طرح تیار تھی۔

"رشتہ تو صرف آپ سے ہے، جو میری لاکھ کوششوں کے باوجود آج بھی بے یقینی کے بھنور میں ہے۔" وہ زخمی لہجے میں مسکرائی۔

"اسے اس نہج پہ بھی تم ہی لائی ہو۔ ورنہ میں نے تو ہمیشہ تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ تم نے عائشہ اور اذان کے لیے مجھے دھوکا دیا۔ ان دونوں کی شادی کروادی تا کہ عائشہ کو اذان کی سپورٹ مل جائے۔ تمہاری وجہ سے وہ میرے ہاتھ سے نکل گئی سمی صرف تمہاری وجہ سے۔" وہ رک دم غصے میں آ گیا اور اس وقت اپنے جذبات پہ قابو رکھنا بھی اس کی مجبوری نہیں تھی۔

"اس کا مطلب آپ کو آج تک اس بات کا ملال ہے کہ آپ عائشہ کے ساتھ وہ زیادتی نہیں کر سکے جو کرنا چاہتے تھے۔ اسے وہ تکلیف نہیں پہنچا سکے جس کی آپ نے ہر ممکن کوشش کی تھی۔" اس نے حیرت سے سوال کیا اور اس پل یہ حیرت کم تکلیف زیادہ تھی۔ یعنی یہ اس کا وہم تھا کہ شرجیل کے دل و دماغ سے عائشہ نکل چکی ہے۔ وہ اسے بھلا کر، اپنی ہار تسلیم کر کے سامعیہ کی طرف پلٹا ہے مگر وہ تو کہیں بھی نہیں گئی تھی۔ آج بھی ان دونوں کے درمیان کھڑی تھی۔

"صرف کوشش نہیں کی تھی میں نے بلکہ پوری پلاننگ کی تھی اور تمہاری وجہ سے میری پوری پلاننگ ضائع ہو گئی۔" وہ لب بھینچے غصے سے بولا۔

"راہینہ کا قتل بھی آپ ہی کی پلاننگ تھی ناں شرجیل؟" سامعیہ نے بیڈ کے نیچے رکھا وہ خون آلود لباس نکال کر دکھاتے سوال کیا۔ یہ اس کی غلطی تھی کہ اسے ان کپڑوں کو جلانا یاد نہیں رہا اور اپنی اس حماقت پہ اس نے خود کو کوسا بھی اس کے باوجود وہ بے خوف تھا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ ان کپڑوں پہ لگے خون کے نشان میرے خلاف بہت بڑا ثبوت ہیں؟" اس کے انداز میں چیلنج تھا۔

"نہیں...... یہ ثبوت تو ناکافی ہے۔ ان کپڑوں سے کچھ بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ اذان بھائی کی بے گناہی ثابت ہو سکتی ہے اور نہ آپ کا جرم۔ ہاں مگر ایک بات ضرور ثابت ہو گئی۔ آپ کی محبت کے دعوے کل کی طرح آج بھی جھوٹے ہیں۔" وہ جانتی تھی کہ یہ کپڑے کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ شاید اذان کے کیس کا رخ بدل جائے مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ قتل کو ثابت کرنے کے لیے اذان کے خلاف اس سے زیادہ منظم اور بہتر شواہد موجود تھے جس کی بناء پہ اسے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ اس کا درد تو کچھ اور تھا جس کا اظہار کیے بناء وہ رہ نہیں پائی۔ یہ بات جان کر بھی اس نے شرجیل کے خلاف نہ جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہ دوسری بار اپنا گھر خراب نہیں کرنا چاہتی تھی مگر دل تو شرجیل کے انکشاف نے توڑ دیا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا ان کے درمیان، وہ اسے صرف بہلا رہا تھا اور سامعیہ پہلے کی طرح اس بہلاوے کو محبت سمجھ بیٹھی

تھی۔

"تم جیسی عورت سے بھی بھلا شرجیل جیسے مرد کو محبت ہوسکتی ہے۔ جو اپنے شوہر سے بڑھ کر دوسروں کی خیر خواہ ہو، دوسروں کے لیے اپنا ہی گھر خراب کرتی رہی اسے تو......"

"شرجیل ہمارا گھر کسی دوسرے کی نہیں، آپ کی وجہ سے بکھرا تھا۔ آپ گئے تھے دوسری عورت کے پیچھے اور وہ بھی محبت نہیں بلکہ اپنی ہوس مٹانے۔ ایک بار اسے سہارا دینے کی بات کی ہوتی تو میں دل پہ پتھر رکھ کر آپ کو اس سے دوسری شادی کی اجازت دے دیتی لیکن آپ تو اسے برباد کرنا چاہتے تھے۔" وہ اپنا جرم اس کے سر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ یہ وہ درد تھا جسے سامعیہ صرف اس لیے بھولنا چاہتی تھی کہ اسے یاد کرنے سے خود اسے اذیت ملتی تھی۔ یہ فقط عورت کا ظرف ہوتا ہے کہ وہ مرد کی بیوفائی بھلا کر اسے دوسرا موقع دیتی ہے ورنہ مرد میں اتنا ظرف نہیں۔ وہ مر کر بھی عورت کو دوبارہ قبول نہیں کرتا مگر اپنے لیے ہر حد پار کر لیتا ہے، سب گنجائشیں نکال لیتا ہے۔

"اور تم نے مجھے برباد کر دیا۔ ارادہ تو میرا تمہیں بھی ان دونوں کی طرح سخت سزا دینے کا تھا لیکن کیا کروں کہ اب تم میرے بچے کی ماں ہو اس لیے تمہیں برداشت کرنا میری مجبوری ہے۔" سامعیہ پہ آج شاید اپنی زندگی کے بدترین انکشافات کا دن تھا۔ رات کی سیاہی میں اس نے دانت پیستے سامعیہ کا ایک اور بھرم توڑ دیا تھا۔

"تو مت کریں برداشت۔ چھوڑ دیں مجھے کیونکہ آپ کی تو مجبوری ہے لیکن میرے لیے یہ ناممکن ہوگیا ہے کہ میں آپ جیسے گھٹیا، غلیظ اور مجرمانہ ذہن رکھنے والے انسان کے ساتھ زندگی گزاروں۔" اس کے لفظوں کی بازگشت، شرجیل کے تھپڑ کی گونج میں دب گئی تھی۔ سامعیہ کا گال سرخ تھا اور اس کے ہونٹ سے خون رسنے لگا تھا۔

"بس......" اس نے جتاتے ہوئے شرجیل کو دیکھا، وہ سامنے بیٹھا غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

"میں جانتی ہوں آپ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ آپ جیسے مردوں کی مردانگی کا زعم ایک عورت پہ ہاتھ اٹھا کر ہی پورا ہوتا ہے۔ چیخنا، چلانا، ہاتھ اٹھانا۔ یہ میں بھی کر سکتی ہوں۔ بلکہ میں تو شاید اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہوں لیکن مجھے آپ کے برابر آنا ہی نہیں۔ آپ کے لیول پہ آگئی تو اپنی ہی نظروں سے گر جاؤں گی میں۔" آنسو بے اختیار ہوتے ہیں اور جب تکلیف برداشت سے بڑھ کر ہو تو یہ آنکھوں کے بند توڑ ہی دیتے ہیں لیکن وہ ڈری سہمی بالکل نہیں تھی اور اب کی بار تو ٹوٹی بھی نہیں تھی۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ بیڈ سے اٹھی اور پاس رکھے کوٹ کی طرف جھک کر اپنے بچے کو گود میں اٹھاتے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"کہاں جا رہی ہو اسے لے کر؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"اس وقت تو دوسرے کمرے میں۔ آپ کے وجود ہی نہیں، اب تو آپ کی صورت سے بھی گھن آرہی ہے۔" سامعیہ نے پلٹ کر نفرت سے کہا۔ اس کے لیے یہ رات یہاں گزارنا مجبوری تھی مگر وہ طے کر چکی تھی کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چلی جائے گی۔

شرجیل لب بھینچے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ یہ بھی پریشانی تھی کہ سامعیہ یہ راز کھول کر اس کے لیے کوئی نئی مصیبت کھڑی نہ کر دے۔ اس لیے اس کا منہ بند کرنا بے حد ضروری تھا۔ یک دم وہ بیڈ سے اٹھا اور اپنی دراز سے گھر کی چابیاں نکال کر تیزی سے سامعیہ کے پیچھے کمرے سے نکلا۔ سامعیہ ساتھ والے کمرے میں بچے کے ساتھ جا کر لیٹ گئی تھی۔ وہ باہر کھڑا اس کی سسکیوں کی آواز سنتا رہا اور پھر لب بھینچے اس نے کمرے کے دروازے کو باہر سے لاک کر دیا۔

اذان کی پھانسی میں بس دو ہفتے باقی تھے اور شرجیل اس وقت کوئی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا سامعیہ کی جذباتیت اذان کے گلے سے پھانسی کا پھندہ نکال کر اس کے گلے میں ڈال سکتی ہے۔

❁......❁......❁

روشن سائیں کے سامنے وہ اپنی پریشانی کا اظہار کر سکتی تھی اور نہ ہی اس درد پہ رو سکتی تھی ہاں مگر اکیلے میں تو کھل کر آنسو بہا سکتی تھی۔ سو آج کئی مہینوں بعد پوری رات اس نے

صرف یہی کام کیا تھا۔ آنسو کبھی اپنی بے بسی پہ بہتے تھے تو کبھی ناکام محبت پہ۔ وہ ایک نام آج بھی اس کی ذات سے جڑا تھا اور یہ سچائی اگر بدل بھی جاتی تو جو تعلق دل سے وابستہ تھا اسے کیسے فراموش کرتی؟ کچھ بھی تھا اس وقت اس کے دل میں صرف ایک ہی تمنا تھی کہ کسی بھی طرح وہ اذان سے ملے اور یہ خواہش آتے ہی اس سے جڑی ہر شکایت کہیں دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ اذان ایک انتہائی تکلیف دہ وقت سے گزر رہا ہے۔ اس وقت اگر وہ اذان سے نہ مل پائی تو شاید۔ اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ جس نے جینے کی وجہ دے کر اس کی امید بھی چھین لی تھی، اسے موت کی دہلیز کی جانب بڑھتے دیکھنا تو دور، یہ سوچ کر ہی عائشہ کا سانس رکنے لگا تھا۔

''لیکن وہ وہاں جائے گی کیسے؟'' جب یہاں آئی تھی تو جھولی میں فقط ملال کے چند سکے تھے۔ ہاتھ اس وقت بھی خالی تھے اور آج بھی ان ہتھیلیوں میں بدنصیبی کی لکیروں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ تو پھر وہ کیسے اس سے ملنے جائے گی؟

روشن سائیں سے کہہ کر وہ اپنے جانے کا انتظام کروا سکتی تھی مگر اس کو کچھ بھی بتانے کا مطلب تھا اپنے راز میں شریک کرنا، پھر کیا پتا وہ یہ بات اذان کے گھر والوں تک پہنچا دے۔ عائشہ کو تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اذان اس سے ملنا چاہے گا یا نہیں۔ کیا پتا وہ آج بھی اس کی صورت نہ دیکھنا چاہتا ہو؟ وہ ایک نئی مشکل میں آ گھری تھی۔ یک دم اس کی نظر اپنی سیاہ چادر پہ پڑی۔ چادر کا کونہ فرش پہ پھیلا تھا اور ہمیشہ کی طرح آج بھی اس پہ بہت پیسے پڑے تھے۔ یہ تقریباً روزانہ کا معمول تھا کہ لوگ آتے جاتے اسے بھکاری سمجھ کر اس کی چادر پہ خیرات کے پیسے رکھ دیتے تھے، اکثر تو چھوٹے بچے اٹھا کر بھاگ جاتے، جو بچ جاتے عائشہ رات کو انہیں مزار پہ رکھے چندے کے ڈبے میں ڈال دیتی۔ اسے ان پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنا کچھ پا کر بھی دامن خالی تھا، ان چند سو روپوں سے اس کی بھلا کون سی ضرورت پوری ہو سکتی تھی؟ لیکن آج یہ پیسے اس کی بہت بڑی ضرورت پوری کر سکتے تھے۔ اس نے جلدی سے وہ پیسے اٹھا کر گنے۔ صرف پانچ سو روپے اور چند سکے۔

''ان سے تو سفر کا خرچ بھی نہیں نکلے گا۔'' اس نے لب بھینچے مایوسی سے سوچا۔ جب یہاں آئی تھی تو کئی دن پیدل چلی تھی۔ اس وقت تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ مقام کون سا ہے۔ خیر اس پل تو اپنے حواسوں میں بھی نہیں تھی۔ زندہ تھی کیونکہ زندگی لکھی تھی، ورنہ تو کب کی مر چکی ہوتی لیکن ابھی تو اسے جلد از جلد اذان کے پاس پہنچنا تھا۔ پتا نہیں کیوں مگر وہ صرف ایک بار اس سے ملنا چاہتی تھی۔ نجانے پھر کبھی قسمت یہ موقع دے یا نہ دے مگر، صرف ایک بار وہ اذان سے ملنا ضرور چاہتی تھی مگر یہ پیسے۔ ہر بار کی طرح آج بھی پیسے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اتنی رقم نہیں تھی جو اس وقت اس کی ضرورت پوری کر پائے لیکن وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔ جو طے کر لیتی تو پھر جب تک کر نا گزرتی چین سے نہیں بیٹھتی تھی۔

سورج کے نکلنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ عائشہ نے اپنی سیاہ چادر کو اچھی طرح اوڑھا، ہاتھ میں پیسے دبائے اور دروازے کی طرف بڑھی۔ آہنی سلاخوں سے بنے چھوٹے سے دروازے پہ اٹکا تالا زنگ کے باعث کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود آج تک اسے کسی نے بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اس تمام عرصے میں کبھی اسے کھولنے یا توڑنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ عائشہ نے دو تین بار تالے کو لوہے کی سلاخ سے مارا اور ذرا سی زور آزمائی سے تالا کھل گیا۔ دروازہ کھول کر وہ مزار کے احاطے سے باہر نکلی اور واپس دروازہ بند کر کے تالا دوبارہ پھنسا دیا تھا۔ اپنا چہرہ چھپائے وہ تیزی سے بس اڈے کی طرف چل پڑی تھی۔

❁......❁......❁

وہ جب تک جیل میں تھا، ملاقات کے لیے اسے مخصوص کمرے میں لایا جاتا تھا جہاں وہ آمنے سامنے بیٹھ کر بات چیت کر سکتا تھا مگر اس سیل میں آنے کے بعد سزا یافتہ قیدیوں کی طرح اسے بھی کسی سے ملاقات کی اجازت صرف جیل نما کمرے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑے کر کے ہی دی جا رہی تھی۔ اب بھی اذان کو اسی کمرے کے پچھلے دروازے سے

اندر لایا گیا تھا جبکہ اس وقت بھی وہ پولیس اہلکار نگرانی کے لیے موجود تھا جو اسے اطلاع دینے آیا تھا۔ حالانکہ وہ ملنے سے انکار کرچکا تھا اور اس کا کسی بھی صورت آج اپنے گھر والوں یا وکیل سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر پھر اس اہلکار کی بات پہ چونکتے اسے مجبوری و تجسس میں وہاں آنا پڑا تھا۔ جو حلیہ وحالات اس اہلکار نے اس سے ملاقات کے لیے آنے والی عورت کے بتائے تھے، وہ کم سے کم اس کی فیملی میں سے تو نہیں ہوسکتی تھی۔ نام بھی نہیں بتایا تھا کہ پوچھنے پہ شناخت ہوجاتی اس لیے اب صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ خود جا کر ملتا اور اس آنے والے کی اصلیت جان پاتا۔ وہ وہاں پہنچا تو وہ سیاہ چادر اوڑھے ان سلاخوں کے پار پیٹھ موڑے کھڑی تھی۔ چادر کا رنگ سیاہ ہے یہ بھی فقط اس کا اندازہ ہی تھا ورنہ تو وہ چادر اتنی بوسیدہ اور بے رنگ تھی کہ یقین سے کہنا بھی مشکل تھا۔ ایک دو چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی نظر آرہے تھے جس سے اوڑھنے والے کی ابتر حالت کا اندازہ بخوبی ہوسکتا تھا۔ اس کے باوجود کہ وہ شدید تجسس میں تھا، وہاں کھڑے اس نے اسے مخاطب نہیں کیا، چند لمحوں بعد اسے جیسے خود ہی احساس ہوگیا تھا اس کی موجودگی کا، شاید اسی لیے اس نے پلٹ کر دیکھا اور پھر وہ لمحوں میں فریز ہوئے تھے۔

اذان کے چہرے پہ تو فقط اس کی بڑھی ہوئی شیو اور آنکھوں کے گرد آئے سیاہ ہلکوں کا اضافہ تھا پھر بھی عائشہ پہلی نظر میں اس کو پہچان نہیں پائی تھی لیکن اذان کو تو صرف ایک پل لگا تھا اسے پہچاننے میں۔ حالانکہ اس کا چہرہ اب بھی چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور صرف عائشہ کی آنکھیں تھیں جن سے جھلکتی ویرانی چیخ چیخ کر درد کے نوحے سنا رہی تھی۔ گو اس کے چہرے کی بے چینی بتا رہی تھی کہ وہ اسے پہچان چکا ہے شاید اسی لیے عائشہ نے نظریں جھکائے چہرے سے نقاب ہٹایا تھا کہ جو جانتا ہے اس سے چھپنے کا کیا فائدہ۔ اس کی آنکھوں کی طرح وہ چہرہ بھی اتنا ہی ویران اور پتھریلا دکھائی دے رہا تھا۔ تھکن سے چور، نڈھال۔ ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا پولیس اہلکار نے اس کے متعلق کہ بڑی طویل مسافت طے کرکے یہاں تک پہنچی ہے۔ وہ اس کے پیروں کے آبلے تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر اس کے چہرے پہ رقم سفر کی داستان تو پڑھ سکتا تھا۔ اس نے ایک لفظ نہیں کہا پھر بھی اس کی آنکھوں میں بس ایک نظر جھانکنے پر بھی ان میں تحریر شکوہ پڑھ چکا تھا۔

اب یہ بے بسی تھی یا ملال، یکا یک اپنے بیچ سلاخوں کی دیوار پہ اذان کے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوئی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھے مگر خاموش۔ اس کی نظریں عائشہ کے چہرے پہ ٹکی تھیں اور عائشہ نظریں جھکائے اس کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت کہنے کو دونوں کے پاس کچھ نہیں تھا کیونکہ جو کچھ کہنا تھا اس کے لیے یہ ملاقات بے حد مختصر تھی۔

دور کھڑے پولیس اہلکار کی آواز پہ ان دونوں نے ہی سر اٹھائے چونک کر اس کو دیکھا۔ وہ انہیں وقت ختم ہونے کا احساس دلا رہا تھا اور شدید بیزار کھڑا تھا۔

"اکیلی آئی ہو؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا اور کیا اذیت تھی جو اس پل عائشہ کی آنکھوں میں نظر آئی تھی۔ اپنی سوجی ہوئی بے رونق آنکھوں سے ایک ٹک اذان کو دیکھتی رہی اور پھر پلکیں جھکائے اثبات سر ہلایا۔ چند پل پھر خاموش گزرے جیسے وہ اپنے اندر ہمت اکٹھی کررہا تھا۔ وقت نے جو فاصلہ ان دونوں کے درمیان پیدا کردیے تھے، جو تناؤ اس کی بدگمانی سے اس رشتے میں آیا تھا اس کے بعد تو ایسا لگ رہا تھا وہ فقط آہنی سلاخوں کے پار نہیں سرکنڈوں کے گھنے جنگل کے کناروں پہ کھڑے ہیں۔

"وہ کیسا ہے؟" ان چند لفظوں کو زبان سے کہنے میں اسے صدیاں لگی تھیں اور عائشہ کے اندر شعلے سلگنے لگے تھے۔ یعنی اسے معلوم تھا۔ جو عائشہ اسے بتا نہیں پائی تھی وہ جانتا تھا۔

"وہ تو نہیں ہے۔ مر گیا تھا وہ اسی رات۔" عائشہ نے پلکیں اٹھائے اذان کو دیکھتے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی امیدوں کے راج ہنس ایک دم پگھلنے لگے اور ان کی جگہ ملال کے آنسوؤں نے لے لی تھی۔

"مجھے معاف کردو عائشہ۔ مجھے اگر پتا ہوتا تو......" عائشہ نے پہلی بار اسے اپنے سامنے روتے دیکھا تھا۔ ہاتھوں کو جوڑے وہ بھیگی آواز میں اس سے معافی مانگ رہا تھا۔

"بتانے کا موقع ہی نہیں دیا آپ نے۔" اس نے

پتھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔اس غم پہ تو وہ پہلے ہی بہت رو چکی تھی۔ کئی مہینے لگے تھے اسے اپنی تکلیف کو بھلانے میں جو اسے اس شخص نے دی تھی جسے وہ اپنا محافظ سمجھتی تھی۔ آج اگر وہ یہاں آئی تھی تو صرف اس لیے کہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی یا پھر اسے لگا تھا کہ وقت نے مرہم بن کر ان زخموں کو مندمل کر دیا تھا لیکن یہاں اس کے ایک سوال نے عائشہ کو دوبارہ اسی تکلیف کی دلدل میں دھکیل دیا تھا جہاں سے نکلنے کی کوشش میں وہ خود پارہ پارہ کر چکی تھی۔

''پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں صرف تمہارا گناہ گار ہوں۔ تمہیں اندازہ ہے ناں کہ وہ سچ میرے لیے کتنا تکلیف دہ تھا۔ تم تو جانتی تھی ناں سب کچھ، تمہیں سب پتا تھا مجھے کتنی نفرت ہے اس سے۔ کتنا تکلیف دہ وقت تھا میرے لیے وہ۔ عائشہ میں مرتے وقت دل پہ یہ بوجھ لے کر اپنے ساتھ نہیں جانا چاہتا کہ میں تمہارا مجرم ہوں۔'' وہ اب اسے وضاحتیں دے رہا تھا مگر عائشہ کو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا اذان کا گڑگڑانا۔

''کوئی صورت نہیں ہے بچنے کی کیا؟'' دھیمے اور سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اگر ہو بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا وجود خود میرے لیے قابل نفرت ہے۔اس کا خاتمہ ہی مجھے میری سب اذیت سے نجات دلا سکتا ہے۔'' وہ تو پہلے ہی ملال کی وادی میں کھڑا تھا۔ اس کڑے سچ نے صرف امید نہیں توڑی تھی، اس کے جرم کو بڑھا دیا تھا۔ سزا سے بچ کر بھی ضمیر کی ملامت سے کیسے بچا جا سکتا تھا۔

''اپنے پیچھے رہ جانے والوں کا نہیں سوچا کہ وہ کیسے جئیں گے؟'' اس نے جتاتے ہوئے پوچھا۔ اذان نے چونک کر دیکھا تو کیا وہ اپنی بات کر رہی تھی؟

''اپنی ذات سے نظر ہٹا کر پہلے بھی کبھی ان کی فکر نہیں کی تھی آپ نے اور آج بھی ان کے بارے میں نہیں سوچ رہے۔ یعنی جس خودغرضی کے ساتھ جیتے رہے، اسی خودغرضی کو تھامے مرنا چاہتے ہیں۔'' وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی کیونکہ وہ اذان کو سب سے بہتر جانتی تھی۔ وہ واقعی خودغرض تھا۔ صرف اپنی ذات کے محور میں جکڑا، اپنے لیے سوچتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کی فکر نہیں کی تھی سوائے اپنے۔

''بی بی جان کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' اس نے جیسے اطلاع دی، اذان کے لیے یہ شاک تھا کیونکہ اسے اب تک یہ خبر نہیں ملی تھی۔

''تم ملی ہو کیا ان سے، کیسی ہیں وہ؟'' اس کے سوال پہ عائشہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''اگر کسی طرح سچائی ثابت ہو سکتی ہے تو بچا لیں خود کو۔ کہیں ایسا نہ ہو آپ کا یہ غم آپ کے اپنوں کی جان لے لے۔'' تو یہ مقصد تھا اس کے یہاں آنے کا۔

''یعنی تمہیں یقین ہے میری بے گناہی کا؟'' اس کے اس سوال پہ عائشہ نے جتاتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یقین تھا اسی لیے اس وقت آپ کا ہاتھ تھاما تھا۔ بھروسا تھا کہ چاہے کتنی کڑی آزمائش کیوں نہ آجائے آپ میرا ہاتھ نہیں چھوڑیں گے۔ اسی لیے وہ سچ بھی نہیں بتایا کیونکہ آپ کے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے نہیں پتا تھا میری ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا دیں گے آپ۔'' مان اور اعتماد ٹوٹنے کی وہ ساری کرچیاں اس کے لفظوں میں سمٹ کر اذان کی روح میں پیوست ہو رہی تھیں۔

''کہاں تھی؟'' شرمندگی کا بوجھ لہجے کو بھی کمزور کر گیا تھا۔

''وضاحت مانگ رہے ہیں؟'' اس نے بے اختیار پوچھا۔

''صرف پوچھ رہا ہوں کہ اتنے دن کیسے گزارے تم نے میرے بغیر۔'' اذان نے نفی میں سر ہلاتے وضاحت دی۔

''دن......؟ مجھے تو لگتا ہے صدیاں گزر چکی ہیں۔'' وہ زخمی لہجے میں مسکرائی۔

''ہاں......صدیاں ہی گزر چکی ہیں۔ میرا بھی ایک ایک دن تمہارے بغیر سالوں سا طویل گزرا ہے۔ اس پر یہ بوجھ کہ میں تمہارا گناہ گار ہوں۔ کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو؟'' ایک گہرا سانس لیتے اس نے پوچھا اور پھر ایک بار دوبارہ ہاتھ جوڑے معافی مانگی۔

''میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی۔ میں تو خود گناہ

گاروں میں سے ہوں۔ آج تک اس خوف سے اس کے آگے جھولی پھیلا کر معافی نہیں مانگی کیونکہ دھتکارے جانے سے خوف آتا ہے۔ میری اتنی اوقات نہیں کہ کسی کو معاف کرسکوں۔'' وہ لب بھینچے بے بسی سے بولی اور واپس جانے کو پلٹی۔

''کہاں جارہی ہو اب؟'' اذان نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہیں...... جہاں پہلے قسمت لے گئی تھی۔'' جاتے ہوئے رک کر اس نے بناء پلٹے جواب دیا۔

''یعنی زندگی کی آس دے کر، اسے ایک بار پھر میرے لیے سزا بنا کر دور چلی جاؤ گی؟'' یہ امید کے وہ واپس آچکی ہے، صرف خوش گمانی تھی، بھرم تھا۔

''دور نہیں ہوں، میں آج بھی آپ کی دسترس میں ہی ہوں۔ صرف وجود کا فاصلہ ہے، آپ کی ذات کی سرحد پار نہیں کی۔ جس دن ڈھونڈنے نکلیں گے تو مل جاؤں گی۔'' اس نے اذان کی طرف پلٹ کر دیکھتے جواب دیا اور تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ اذان سلاخوں پہ سر ٹکائے کھڑا اسے اس آخری لمحے تک دیکھتا رہا جب تک وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

ملاقات کا وقت تو شاید بہت پہلے ختم ہوچکا تھا لیکن حیرت یہ تھی کہ پولیس اہلکار نے ان دونوں کو ٹوکا نہیں تھا۔ شاید وہ محسوس کر چکا تھا ان دونوں کی اذیت۔ اذان نے پیچھے مڑ کر شکر گزار نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکائے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

❁......❁......❁

سامعیہ نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ بناء زور آزمائی کے کھل گیا تھا جبکہ کچھ دیر پہلے دروازہ باہر سے لاک تھا۔ وہ بچے کو گود میں لے کر باہر نکلی تو شرجیل جا چکا تھا لیکن مین انٹرنس لاک تھا۔ البتہ اس کی کل وقتی ملازمہ وہیں موجود تھی۔ سامعیہ نے شیشے کے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ باہر دو سیکورٹی گارڈ بیٹھے تھے جو یقیناً اس کی نگرانی پہ معمور تھے۔ اس کا مطلب شرجیل نے اسے گھر میں قید کردیا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹی اور لینڈ لائن کی طرف بڑھی تاکہ کال کرکے شرجیل کے والدین یا پھر پولیس سے مدد مانگے لیکن یہاں ایک اور شاک اس کا منتظر تھا۔ لینڈ لائن ڈسکنیکٹ ہوچکا تھا۔ سامعیہ کا فون بھی اسے نہیں ملا تھا۔ جس کا مطلب اب وہ کسی بھی صورت باہر رابطہ نہیں کرسکتی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وہ بے بس سی صوفہ پہ بیٹھ گئی تھی۔

❁......❁......❁

اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ عائشہ ہی تھی جسے اس نے ہاسپٹل کے باہر دیکھا تھا۔ وہ بی بی جان سے ملنے آیا تھا اور گاڑی پارک کرتے اس نے مین انٹرنس پہ سیاہ چادر اوڑھے اس لڑکی کو تیزی سے باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے چادر سے منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ بس ایک پل کو ہی چادر کا کونہ اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا اور پاس سے گزرتے شرجیل کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ ہرگز اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتا تھا۔ چند لمحے لب بھینچے وہ جیسے اپنے خیال کی تصدیق کرتا رہا اور پھر تیزی سے واپس گاڑی موڑ کر مین گیٹ سے باہر نکلا لیکن اسے دیر ہوچکی تھی۔ بس اسٹاپ، مین گیٹ کے پاس ہی تھا اور اسی وقت بس اسٹاپ پہ آکر رکی اور عائشہ جلدی سے اس بس میں سوار ہوگئی تھی۔ حالانکہ یہ اس کی مطلوبہ بس نہیں تھی لیکن خود وہ بھی شرجیل کو دیکھ چکی تھی اسی لیے بناء تاخیر وہ بس میں سوار ہوگئی تھی۔

''مجھے ہاسپٹل آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' زیر لب بڑبڑاتے اس نے خود کو کوسا۔ اذان سے مل کر وہ اب یہاں صرف یہ جاننے آئی تھی کہ بی بی جان کی طبیعت کیسی ہے۔ ان سے ملنے کا ارادہ نہیں تھا اسی لیے باہر کھڑے نرسنگ اسٹاف سے ہی ان کی خیریت معلوم کرکے وہ واپس مزار پہ جارہی تھی جس کے لیے اسے یہاں سے پہلے بس اڈے تک جانا تھا مگر شومئی قسمت وہاں شرجیل آگیا۔ ویسے تو بس میں اچھی خاصی بھیڑ تھی اور وہ ان میں چھپی کھڑی تھی مگر اس کا حلیہ اتنا الگ تھا کہ آسانی سے پہچانی جاتی۔ ویسے بھی شرجیل جیسے انسان سے وہ ہر امید کرسکتی تھی۔ اسے یقین تھا وہ اس کا پیچھا لازمی کرے گا اور وہ بالکل ٹھیک سوچ رہی تھی۔

شرجیل واقعی اس بس کا پیچھا کررہا تھا۔ایک مشکل یہ تھی کہ اس کے پاس پیسے بہت کم تھے۔وہ بس پہ ہی یہاں پہنچی تھی اور پھر کئی بسیں بدل کر شرجیل سے چھپ کر اب دن ڈھلے واپس اپنے ٹھکانے پہ جارہی تھی۔طبیعت الگ بے حال تھی کیونکہ صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔اب اسے دن بھر بھوکا رہنے کی عادت ہوچکی تھی لیکن سارا دن بیٹھ کر گزارنے میں اور پورا دن سفر کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔اس پہ شرجیل کی پریشانی۔بہرحال اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے حواس بھی قابو میں رکھے۔بس اسٹاپ پہ رکی تو چند عورتیں ایک ساتھ بس سے اتریں۔عائشہ بھی ان کے ساتھ ہی بس سے اتر گئی تھی۔ان میں سے چند عورتیں آگے بڑھ گئیں جبکہ اس سمیت بہت سے لوگ اب بھی بس اسٹاپ پہ دوسری بس کے منتظر تھے۔عائشہ کے لیے وہاں کھڑے ایک ایک پل جاں گسل تھا کیونکہ شرجیل اگر وہاں اس کا پیچھا کرتا پہنچ جاتا تو مصیبت ہوجاتی اور وہی ہوا تھا۔وہ واقعی وہاں آگیا تھا اور بھیڑ میں چھپی، چادر کے پلو سے چہرہ چھپائے کھڑی عائشہ کو پہچان بھی لیا تھا۔

''تمہیں تو لاکھوں کے مجمع میں پہچان سکتا ہوں۔یہ تو پھر چند لوگوں کی بھیڑ ہے۔'' اس کے قریب پہنچ کر اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا، اس کی آنکھوں میں نظر آتی کمینگی پہلے سے بڑھ کر تھی۔عائشہ نے نفرت سے دیکھا اور پھر ایسا تاثر دیا جیسے اس نے اسے پہچانا نہ ہو یا اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔وہ منہ پھیرے اجنبی بن کر کھڑی تھی۔شرجیل نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے، کون ہو تم، چھوڑو میرا ہاتھ۔'' اس نے بے اختیار شور مچاتے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر درحقیقت پاس کھڑے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کررہی تھی۔

''کیا بات ہے بھئی، شرم نہیں آتی بھرے مجمع میں لڑکی کو چھیڑ رہے ہو۔'' پاس کھڑی بھیڑ میں سے ایک آدمی نے سخت لہجے میں ٹوکا۔

''آپ بیچ میں مت بولیں یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ ہم جانتے ہیں ایک دوسرے کو۔'' اس نے پلٹ کر سختی سے کہا۔

""نہیں یہ جھوٹ بول رہا ہے، میں اسے بالکل نہیں جانتی۔" عائشہ نے موقع غنیمت جانتے اپنا ہاتھ چھڑایا اور جلدی سے کچھ فاصلہ پر جاکر کھڑی ہوگئی۔
""جھوٹ تم بول رہی ہو۔ میں جانتا ہوں تم عائشہ ہو۔" وہ چلاکر بولا۔
""کون عائشہ۔ بھائی صاحب دیکھئے ناں بلاوجہ گلے پڑ رہا ہے میرے یہ آدمی۔" وہ ایک دم مکری ساتھ ہی شکایتی انداز میں پاس کھڑے آدمی کو مددطلب نظروں سے دیکھا۔
""سب لڑکیوں کو چھیڑنے کے بہانے ہیں۔ اس کا تو ابھی دماغ ٹھیک کرتا ہوں میں۔" آدمی آستین چڑھائے شرجیل کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی دو اور لوگ بھی اس تکرار میں شامل ہوئے۔ شرجیل کو اندازہ نہیں تھا کہ عائشہ اس چالاکی کا مظاہرہ کرسکتی ہے۔ وہ لوگ اب اسے گالیاں دے رہے تھے، مکے تانے اس کو دھمکا رہے تھے۔ اسی وقت بس آکر رکی جو یہاں سے سیدھا بس اڈے جارہی تھی۔ شرجیل کو ان لوگوں سے الجھتا دیکھ کر عائشہ نے موقع غنیمت جانا اور پھر جلدی سے بس میں سوار ہوگئی تھی۔

❁......❁......❁

مزار پہ پہنچی تو رات کی سیاہی گہری ہوچکی تھی۔ اسے یقین تھا مزار کے دروازے کو تالا لگا ہوگا اور لازمی صبح تک اسے باہر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھ کر انتظار کرنا پڑے گا لیکن وہاں پہنچ کر اسے حیرت ہوئی تھی۔ نہ صرف مزار کا دروازہ کھلا تھا بلکہ روشن سائیں مزار کے صحن میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ وہ لب دبائے اندر داخل ہوئی۔ جھاڑو دیتے روشن سائیں نے ایک لمحہ رک کر اسے دیکھا اور پھر دوبارہ جھاڑو دینے لگا۔ عائشہ نظریں جھکائے تیزی سے وہاں رکھے گھڑے کی طرف بڑھی اور مٹی کے پیالے میں پانی ڈال کر جلدی جلدی پینے لگی۔ پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے اگ آئے تھے اس پہ پریشانی الگ تھی۔ پریشان تو خیر وہ اب بھی تھی کہ پتا نہیں بوڑھا مجاور اس سے کیا کہے گا۔ کیا پتا وہ اسے یہاں سے نکال دے یا پھر اس پہ شک کرے۔ اسے نہیں پتا تھا اس کے سوال کس نوعیت کے ہوں اور عائشہ کو اسے کیا جواب دینا ہیں۔ اسی الجھن میں تھی۔

روشن سائیں ہاتھ میں کھانے کی طشتری لیے اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ عائشہ نے گردن گھما کر دیکھا، اس نے آگے بڑھ کر پلیٹ اس کی مخصوص جگہ پہ رکھی اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔ عائشہ بھی لب دبائے بیٹھ گئی۔
""باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔ پہلے کھانا کھا لے۔ میں جانتا ہوں سارا دن سے بھوکی ہوگی۔" عائشہ جو سر جھکائے بیٹھی تھی، روشن سائیں کی بات پہ اس نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔ اسے کیسے اندازہ تھا کہ عائشہ بھوکی ہوگی، اس کا مطلب وہ اس کا منتظر تھا، یعنی اسے یقین تھا کہ عائشہ واپس آئے گی۔ اس نے چپ چاپ کھانا شروع کردیا۔ اسے واقعی ہی بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ایک ہی دن میں اتنا طویل سفر اور بے شمار اذیت اور دکھوں کو سہنا آسان نہیں تھا۔ پتا نہیں اس کے اندر اتنا حوصلہ کیسے آگیا تھا۔
""مل آئی ہے اس سے؟" اس سے پہلے کبھی اس نے اتنی رغبت سے کھانا نہیں کھایا تھا نہ ہی اتنی تیزی سے کھانا ختم کیا تھا۔ جیسے ہی اس نے آخری نوالہ منہ میں ڈالا، روشن سائیں نے سوال کیا۔ عائشہ نے ایک بار پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بار بار اسے حیران کررہا تھا۔
""آج بھی تیرا ہی ہے ناں؟" اس نے مزید پوچھا۔ عائشہ نے نظریں جھکائے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ آخری نوالہ چبانا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کا مطلب اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ وہ کس سے مل کر آئی ہے مگر اس کی بات کے جواب میں سر اثبات میں ضرور ہلایا تھا۔ وہ غرور جو اس کے دھتکارنے پہ چکنا چور ہوا تھا اچانک سورج کی پہلی کرن کی طرح سر نکالنے لگا تھا۔
""واپس کیوں آگئی پھر۔ وہ پہلے ہی اتنی تکلیف میں ہے۔ یہ درد دینا ضروری تھا کیا؟" اس نے تاسف سے کہا۔
""اس نے خود نکالا تھا ہاتھ پکڑ کر زندگی سے۔ جب تک ہاتھ پکڑ کر نہیں لے جائے گا میں واپس نہیں جاؤں گی۔" عائشہ ہمیشہ کی طرح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اٹھا کر انہیں ہتھیلی پہ جمع کررہی تھی۔
""بتا کر آئی ہے اسے اپنا ٹھکانہ کیا؟" عائشہ نے سر نفی میں

ہلایا۔
"وہ خود ہی ڈھونڈ لے گا۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔
"لیکن وہ یہاں کبھی نہیں آتا۔ اتنے برسوں میں تو نہیں دیکھا اسے۔" روشن سائیں کے بوڑھے چہرے پہ گہری سوچ پھیلی۔
"میری خاطر آئے گا۔" اس نے یقین سے کہا۔ "اگر واقعی میری چاہ ہے تو اس بار ضرور آئے گا۔" روشن سائیں کو دیکھتے اس کے چہرے پہ یقین تھا۔
"چل دیکھتے ہیں پھر۔ تیرا یہ یقین کب جیتتا ہے۔" وہ ہولے سے مسکرا کر کہتا اٹھ کر کھڑا ہوا۔
"بابا......" عائشہ نے منت طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
"فکر مت کر۔ کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ یہ راز مرتے دم تک راز ہی رہے گا میرے سینے میں۔" اس نے بے ساختہ تسلی دی۔ عائشہ جانتی تھی وہ اس کا یہ اعتبار کبھی نہیں توڑے گا۔
"بھوک زیادہ لگی ہے تو اور روٹی ڈال دوں؟" اس نے پیار سے پوچھا۔ عائشہ نے نفی میں سر ہلایا اور ہتھیلی پہ اکٹھی کی ہوئی روٹی کے سوکھے ٹکڑے منہ میں ڈال لیے۔ آج سے اس کا انتظار شروع ہوگیا تھا۔ وہ انتظار جو موت سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا ہے اور کیا پتا یہ تکلیف اسے موت تک سہنی ہو۔

❁......❁......❁

وہ جاتے ہوئے جو امید کا سرا اس کے ہاتھ میں تھما گئی تھی، اسے پکڑے وہ اس تک پہنچ سکتا تھا یا نہیں لیکن اس آس کے ساتھ زندگی تو گزار ہی سکتا تھا کہ ایک دن وہ ضرور مل جائے گی۔ بی بی جان کی طبیعت ہنوز خراب تھی اور وہ اب بھی ہاسپٹلائز تھیں لیکن اذان کی اپیل منظور ہوگئی تھی اور کیس اب اعلیٰ عدلیہ کے پاس پہنچ گیا تھا ساتھ ہی اسے واپس جیل منتقل کردیا گیا تھا کیونکہ پھانسی کی سزا منسوخ ہوگئی تھی۔ مجرم کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو اپنے پیچھے اپنا سراغ ضرور چھوڑ جاتا ہے پھر شرجیل تو فقط اپنا بدلہ پورا کررہا تھا۔ اس نے بھلے ظاہری طور پہ ہر کام پوری پلاننگ سے کیا تھا لیکن اذان کو معلوم تھا وہ کس چور راستے سے اس کے گھر کے اندر آیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی بلڈنگ سیکورڈ ہے اور یہاں نہ صرف مین انٹرنس بلکہ ہر کاریڈور میں سی سی ٹی وی لگا ہوا ہے۔
اذان کو یقین تھا کہ چابی ملازمہ کے ذریعے شرجیل کے ہاتھ لگی ہے، اس کا اچانک روپوش ہوجانا ہی اس کے یقین پہ مہر تھی۔ اب وہ خوف سے غائب ہوئی تھی یا اسے شرجیل نے غائب کیا تھا، یہ ایک الگ کہانی تھی مگر اسے بھی اندازہ نہیں تھا کہ شرجیل کا ارادہ کیا ہوگا۔ وہ اس کا کزن تھا اور اکثر اس کے گھر آتا جاتا تھا۔ دوسری طرف بلڈنگ کی سیکورٹی کی فوٹیج بھی شرجیل پہلے ہی ڈیلیٹ کرواچکا تھا اور اپنے طور پہ خاصہ مطمئن تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ صرف بلڈنگ نہیں اذان کے اپنے گھر کی انٹرنس اور لاؤنج میں بھی سرویلنس کیمرہ ہے جو ہر لمحہ اس کے پینٹ ہاؤس کی مانیٹرنگ کرتا ہے۔ بجلی بند ہونے کی صورت میں اس کا بیک اپ بیٹری سے چلتا ہے، جس کا تعلق مین سوئچ سے نہیں اور اس کی ویڈیو اذان کے پاس موجود ہے۔ پہلے اذان کا ارادہ نہیں تھا اس ویڈیو کو استعمال کرنے کا لیکن اب وہ اسے استعمال کرنے کا ارادہ کرچکا تھا۔ اندھیرے میں راہینہ کے قاتل کا چہرہ واضح نہیں تھا مگر راہینہ کی آمد سے پہلے وہاں موجود شرجیل کی ویڈیو، اس کے پاس آلہ قتل اور پھر راہینہ کا آنا ہی ریکارڈ نہیں ہوا تھا بلکہ کمرے سے اذان کا نکل کر مین سوئچ آن کرنا اور پھر اذان کا زخمی راہینہ کی مدد کی کوشش بھی سب کے سامنے تھی۔ اس ویڈیو کو عدالت میں ثبوت کے طور پہ پیش کرنا تابوت میں وہ کیل تھی جس نے کیس کا رخ تین سو ساٹھ ڈگری بدل دیا تھا۔ اذان کو رہائی مل گئی تھی اور شرجیل کا ٹرائل شروع ہوگیا تھا۔ جلد یا بدیر اسے سزا بھی مل ہی جانی تھی۔

❁......❁......❁

سامعیہ وہاں کھڑی ان دئیوں کی روشنی میں اپنی امید تلاش کررہی تھی یہ جان کر بھی کہ سب کچھ کھوچکا ہے وہ ان دئیوں کی روشنی میں آگے بڑھنے کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ زندگی بھی کتنے امتحان لیتی ہے۔ کبھی یہ گمان تھا کہ سب کچھ ہے اور آج اس کا دامن بالکل خالی تھا۔ سب کچھ کھوچکا تھا کیونکہ وہ

جو اپنا تھا وہ بس ایک بھرم ہی تھا۔ جب آنکھ کھلی تو خواب کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ جسے محبت جانا ایک سراب تھا، گمان تھا، دھوکا تھا، منزل پہ پہنچ کر سب غائب ہوگیا تھا۔ شرجیل کی اصلیت بارہا اس کے سامنے آئی اور ہر بار اس نے اپنے دل کو وسیع کرکے اسے معاف کردیا مگر اللہ کے انصاف سے نہیں بچاسکی تھی۔

وہ تو اس بار بھی اس کا پردہ رکھنا چاہتی تھی مگر اس کا جرم ہی ایسا تھا کہ اسے سزا سے بچانا ناممکن تھا۔ عدالت میں دیئے ثبوت کی بناء پہ اسے عمر قید ہوئی تھی اور پچھلے ایک سال سے سامعیہ اپنے بچے کے ساتھ آشیانہ میں تھی۔ بی بی جان نے اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا جبکہ سنبل اب اذان کے ساتھ شہر میں رہ رہی تھیں۔ وہ اکثر ہی مزار پہ آکر یہاں چند گھنٹے گزارا کرتی تھی۔ کچھ سال پہلے وہ یہاں ہر جمعرات دیئے جلانے آتی تھیں۔ اس وقت جو منت مانی تھی آج اس کی جھولی میں تھی۔ اس کا بیٹا کافی بڑا ہوگیا تھا لیکن اس دوران بہت کچھ کھو چکا تھا۔ آج بھی وہ اپنے دھیان میں گم ذہن میں آئی اپنی سوچوں اور اپنے خساروں کا گوشوارہ بنتی اردگرد سے یکسر لاپروا تھی کہ اب تو اس بھیڑ کی عادت سی ہوچکی تھی۔ جب تنہائی وجود کا حصہ ہو تو انسان یونہی بھیڑ میں تنہا ہوتا ہے۔ وہیں صحن کے کونے میں اپنی مخصوص جگہ بیٹھے عائشہ نے آنکھیں سکیڑے دیئے جلاتی سامعیہ کو دیکھا۔ وہ اتنے فاصلے سے بھی اس کی آنکھوں کی نمی بخوبی دیکھ پائی تھی۔ یک دم اس کے بے جان اور پتھرائے ہوئے وجود میں حرکت ہوئی، گو اس کا چہرہ پوری طرح سیاہ چادر سے ڈھکا تھا پھر بھی نجانے کیوں اسے لگا جیسے وہ اسے پہچان سکتی ہے اور اگر وہ اسے پہچان لے تو یقیناً اذان کو بتاسکتی ہے۔ ایک خوف تھا جو اس پل اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرائیت کرگیا تھا۔

وہ پچھلے ایک سال سے اس کی منتظر تھی۔ یہ اطلاع بھی روشن سائیں کے ذریعے اس تک پہنچ چکی تھی کہ اذان رہا ہوگیا ہے اور اصلی قاتل کو سزا مل چکی ہے۔ اس کے باوجود اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا اذان سے رابطے کا کیونکہ اب تو اسے آنا تھا عائشہ کے پاس۔ اسے ہی ڈھونڈنا تھا۔ اس نے اپنی ساری ہمت مجتمع کرتے وہاں سے اٹھنے کی کوشش کی۔ سامیعہ چبوترے کے پاس کھڑی ہاتھ میں پکڑی دیا سلائی سے وہاں رکھے دیئوں کی لو کو سلگارہی تھی اور وہ ایک ٹک اس کو دیکھتے قدم قدم وہاں سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کررہی تھی۔ مزار میں آمدورفت معمول سے زیادہ تھی کیونکہ آج جمعرات تھی۔ ایسے میں وہاں موجود لوگوں سے ٹکراتی وہ بہ مشکل جگہ بناتی احاطے کے دروازے تک آئی اور پھر پلٹ کر بری طرح بھاگتی مزار سے باہر نکل گئی لیکن پاؤں اس وقت من من بھاری ہوگئے تھے۔

اتنے مہینوں سے اس مزار کے ایک کونے میں بیٹھے اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی کمزور ہوچکی ہے، جو چند قدم دوڑنے سے ہی اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں، احاطے کے باہر درختوں کے جھنڈ میں دوڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی جب اچانک اس کے قدم رک گئے کیونکہ وہ مزار کی طرف بڑھتے اذان کو گاڑی سے اترتا دیکھ چکی تھی۔ اسے لگا اس کی رہی سہی ہمت بھی کھوگئی ہے۔ وہ اسی کی طرف چلتا ہوا آرہا تھا اور وہ قدم قدم پیچھے جارہی تھی۔ یک دم یوں لگا جیسے آسمان سر پہ آگرے گا۔ پیروں تلے زمین کروٹ لینے لگی اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ہر منظر دھندلا گیا تھا۔

❁.....❁.....❁

تیرے ہاتھ سے میرے ہاتھ تک
یہ جو ہاتھ بھر کا تھا فاصلہ
کئی موسموں میں بدل گیا
اسے ناپتے، اسے کاٹتے
میرا سارا وقت نکل گیا
تو میرے سفر کا شریک ہے
میں تیرے سفر کا شریک ہوں
پر جو درمیاں سے نکل گیا
اسی فاصلے کے شمار میں
اسی بے یقیں سے غبار میں
اسی راہ گزر کے حصار میں
تیرا راستہ کوئی اور ہے
میرا راستہ کوئی اور ہے

مزار سے نکلتے ہجوم میں وہ کب پیروں کی دھول ہوئی اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اسے اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ یہاں تک کہ اس کا وجود لوگوں کی بھیڑ میں کھو گیا تھا۔ بہت سے ہاتھ اسے اٹھانے کو آگے بڑھے تھے۔ بند ہوتی آنکھوں سے کئی چہرے اس نے خود پہ جھکے دیکھیں لیکن ان میں وہ نہیں تھا جس کی دید دل کا سکون بن جائے۔ وہ ظالم تو رکے بناء وہاں سے چلا گیا تھا۔ ایک بار پھر اس کے بے حد قریب پہنچ کر اسے تنہا چھوڑ گیا تھا۔ لوگ بہت کچھ کہہ رہے تھے لیکن اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ درد کی ٹیسیں تھیں یا ملال کی اذیت۔ اتنے برسوں سے یہ بوجھ اٹھائے پہلی بار اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ دل پھٹ جائے گا۔ یوں جیسے اسے دیکھ کر وہ اپنا ضبط کھو بیٹھی تھی۔ ہمت چھوڑ چکی تھی۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان ابھی منہ پہ آگرے گا۔ خوف سے اس نے بے اختیار آنکھیں موند لیں اور پھر جیسے اسے اپنا وجود ایک گہری کھائی میں گرتا محسوس ہوا۔ ہجوم کا شور دور جانے لگا۔ سکوت گہرا ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک دوسری دنیا کے سفر کی طرف گامزن ہوگئی تھی۔

❁......❁......❁

آنکھ کھلیں تو اس کا متفکر و بے چین چہرہ خود پہ جھکا دیکھا۔ اس نے بے اختیار آنکھیں موند لیں۔ یقیناً وہ خواب دیکھ رہی تھی کیونکہ اذان تو اسے دیکھے بناء اس کی آنکھوں کے سامنے مجمع میں گم ہوگیا تھا پھر کیسے وہ اس کے اتنے قریب ہوسکتا تھا مگر اب اس کی انگلیوں کا لمس وہ اپنے چہرے پہ محسوس کررہی تھی۔ اس کا مطلب یہ خواب نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔ وہ اسی طرح چہرہ جھکائے اسے پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ عائشہ نے حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی حیرت کو پڑھتے بے اختیار اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، ایک سکون تھا جو سانس بن کر سینے سے نکلا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا تھا میں تمہیں کبھی ڈھونڈ نہیں سکوں گا؟" اس نے مسکراتے ہوئے جیسے جتایا۔

"ایک یہی تو یقین تھا میرے پاس کہ اگر آپ کو واقعی مجھ سے سچی محبت ہے تو آپ مجھے ضرور ڈھونڈ لیں گے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔

"میں ایک بار پہلے بھی تمہارے اعتبار کو شکست دے چکا ہوں اس کے باوجود تمہیں مجھ پہ یقین تھا؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"اعتبار صرف محبت پہ تھا۔" حالانکہ سر اب بھی دکھ رہا تھا مگر وہ پرسکون تھی کیونکہ وہ اس کے پاس تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کی موجودگی باعث اطمینان تھی۔ کچھ باتیں مقدر میں لکھی ہوتی ہیں اور ان کا ہونا روز قیامت کی طرح اٹل ہوتا ہے۔ یہ صرف اتفاق تھا کہ وہ آج پہلی بار مزار آیا تھا۔ ورنہ تو اس نے کبھی ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ ہر ہفتے ماں کے ساتھ بی بی جان سے ملنے آشیانہ آتا تھا۔ آج جمعرات تھی اور سامعیہ مزار پہ تھی کہ پیچھے سے اس کا بیٹا جس نے ابھی چلنا شروع ہی کیا تھا ٹھوکر لگنے سے گر گیا۔ بچہ ماں کے بغیر بے چین ہورہا تھا اور کسی سے سنبھل بھی نہیں رہا تھا۔ اتفاق سے ڈرائیور خود سامعیہ کو مزار پہ لے کر آیا تھا اس لیے اذان اسے اس کی آیا کے ساتھ لے کر خود مزار کی طرف آگیا تاکہ سامعیہ کو اسے سونپ دے۔ وہ خود بھی بچے سے بہت مانوس ہو چکا تھا اور اس کا رونا اس سے برداشت نہیں ہورہا تھا اسی لیے وہ اردگرد دیکھے بغیر افراتفری میں مزار کے اندر چلا آیا تھا۔ سامعیہ کے ساتھ باہر نکلا تو لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع تھی اور عائشہ اوندھے منہ بے ہوش پڑی تھی۔ اذان نے صرف اسے اس کی سیاہ چادر سے پہچانا تھا جس پہ اب چند نئے سوراخوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔

"تم مجھے بتا بھی تو سکتی تھی۔ اس طرح ہم دونوں اس انتظار اور جدائی کی اذیت سے بچ جاتے۔" اس کے بالوں کو سہلاتے اس نے دھیرے سے شکوہ کیا۔

"شاید یہ جدائی ہی کفارہ تھا۔ میں نے بہت کوشش کی زندگی کو اپنے بس میں کرنے کی لیکن ہر بار وہی ہوا جو تقدیر میں لکھا تھا پھر میں نے سوچا جب کچھ بھی اختیار میں نہیں تو کیوں ناں خود کو بے اختیار ہی رہنے دوں۔ دیکھیں تو سہی کیا لکھا ہے اس سے آگے مقدر میں۔" زور زبردستی تو کئی بار

کر کے دیکھ چکی تھی۔ پہلی بار وہ خود کو وقت و حالات پہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ حالانکہ اس دوران کئی بار یہ دل میں آئی کہ اذان کو پیغام دے دے۔ روشن سائیں نے بھی کہا کہ وہ بھی اب اس کے راز سے واقف تھا لیکن عائشہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ اگر ان کا ملنا واقعی مقدر میں تھا تو پھر اذان کو خود وہاں آنا ہوگا اسے واپس لے جانے۔

''اس سے آگے صرف محبت ہے۔ ہمیں جتنے امتحانوں سے گزرنا تھا گزر چکے۔ میں پہلے بھی تم سے معافی مانگ چکا ہوں ایک بار پھر یہی درخواست ہے کہ مجھے معاف کردو۔'' اس نے ایک بار پھر منت بھرے انداز میں کہتے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، بالکل اسی طرح جیسے اس دن وہ سلاخوں کے پیچھے کھڑا ہاتھوں کو جوڑے اس سے معافی مانگ رہا تھا۔ عائشہ کو اچانک وہ وقت یاد آیا جب وہ اس کی پھانسی سے محض چند دن پہلے اس سے ملنے گئی تھی۔ کتنا مجبور اور بے بس تھا وہ اس کے سامنے۔ کتنی شکستہ حالت تھی اس کی۔ عائشہ نے ایک دم اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ وہ اب ویسا نہیں تھا۔ کافی بہتر لگ رہا تھا بلکہ شاید پہلے کی طرح بشاش اور دلکش۔ کم سے کم اس کی ظاہری حالت دیکھ کر تو نہیں لگتا تھا کہ وہ کسی ٹراما سے گزرا ہے۔

''میں نے کہا ناں معاف کرنے کا اختیار میرے پاس نہیں لیکن اگر میرے دل میں کوئی شکایت ہوتی تو میں آپ کا انتظار نہ کرتی۔''

''میں کوشش کروں گا اس سے آگے تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہو۔'' اس نے محبت سے کہا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' اس نے اب غور کیا کہ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔ کمرہ کافی بڑا اور خوب صورتی سے سجا تھا لیکن یہ اذان کا گھر تھا اور نہ ہی آشیانہ۔ عائشہ کو اس کا پرانی طرز کا انٹیریئر کافی پسند تھا۔ وہ وہاں کئی بار آچکی تھی اس لیے اسے پہچان تھی۔

''یہ ہمارا گھر ہے۔ دراصل یہ میرے ڈیڈ کا گھر ہے۔ بہت سال یہ جگہ مجھے ہانٹ (ڈراتی) کرتی رہی۔ وہ میرے اندر کا خوف تھا کیونکہ مجھے اس گھر کا فرش اپنے ڈیڈ کے خون سے لال نظر آتا تھا اور پھر وہی خون میرے پینٹ ہاؤس کے فرش پر بھی تھا۔ انسان بدل گئے تھے مگر خون کی رنگت وہی تھی۔ میرے جنون، میری وحشت اور ماضی کی بے چینی نے مجھے بہت نقصان پہنچایا، بہت سے قیمتی لمحے کھو گئے مجھ سے اور صرف وقت نہیں...... اپنی اولاد کو بھی کھو دیا میں نے جبکہ میری غلطیوں کی سزا تمہیں بھگتنی پڑی۔'' اس نے تاسف سے کہا۔ بالآخر وہ ان حالات سے نکل ہی آیا تھا۔ ماضی کو فراموش کر کے حال کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ اسے اس روپ میں دیکھنے کی خواہش، ہاجرہ بیگم کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی جو ان کی زندگی میں ہی پوری ہوگئی تھی۔ وہ خوش تھیں اور اذان مطمئن۔ عائشہ کے لیے یہ بہت بڑی تبدیلی تھی کیونکہ اس نے اسے بہت تکلیف اور اذیت جھیلتے دیکھا تھا۔

''اذان جو ہوگیا اسے بھول جائیں۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان باتوں کو دوبارہ دہرایا جائے جو ہمیشہ ان کی تکلیف کا باعث بنتی رہی ہیں۔ اب اگر وہ کوئی فیصلہ کر ہی چکا تھا۔

''اب یہی فیصلہ کیا ہے۔'' اس نے جھک کر عائشہ کا ماتھا چومتے کہا۔

''ممی ہمیشہ یہاں آکر رہنا چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم یہیں رہیں گے۔ بہت جی لیا ماضی کو۔ اب وقت ضائع نہیں کروں گا۔ جتنی بھی زندگی باقی ہے اسے ایک ساتھ ہم سب خوشی سے گزاریں گے۔'' عائشہ نے مسکرا کر دیکھا۔ وہ سچ میں بدل گیا تھا۔ عائشہ کو لگا صرف اسی کا نہیں، اذان اور اس کے گھر والوں کے تکلیف دہ سفر کا بھی خاتمہ ہوگیا ہے۔

اور آج کے بعد وہ سب ایک ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے والے تھے۔ عائشہ اور اذان کے دل کا ملال ڈھل گیا تھا۔

(ختم شد)

دوہری زندگی

حنا احمد خان

لان برقی قمقموں سے سجا ہوا تھا اور اس کی آرائش دیکھنے والے کو مبہوت کر رہی تھی۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ سلیولیس شرٹس، کھلے گہرے گلے، جسم پر چپکے کپڑے، شیفون اور سلک کی بے ہودا جسم کو ظاہر کرتی ساڑھیاں...... عشاء نے اطراف کا بغور جائزہ لیا اور کن اکھیوں سے اس نے امینہ بیگم (اماں) کی جانب دیکھا جن کے چہرے پر موجود تاثرات سے اس نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کو بھی یہ منظر گراں گزر رہا ہے۔ امینہ بیگم عاشی کا ہاتھ تھامے خالی پڑی کرسیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

امینہ بیگم جو بے زاری بیٹھی تھیں، اردگرد کا جائزہ لیتی ان کی نگاہیں عاشی پر ٹک سی گئیں۔ بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس ان کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

گلابی شلوار قمیص میں ملبوس، گلابی ہی لمبا دوپٹا سلیقے سے شانوں پر پھیلائے، سیاہ اسکارف کے ہالے میں مقید اس کا پاکیزہ چہرہ جو ہر قسم کے میک اپ سے عاری بہت معصوم دکھ رہا تھا۔ عاشی کی نظریں اسٹیج پر تھیں جہاں امینہ بیگم کے نوعمر بھتیجے اسی طرح رقص میں محو تھے کہ دیکھنے والوں کو گمان گزرتا کہ انہوں نے باقاعدہ کہیں سے رقص کی تربیت لی ہے۔ وہ بار بار اس منظر سے نظریں ہٹاتی مگر پھر سے نظریں بھٹکتی وہیں جا ٹھہرتیں۔ اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بہت بے چین سی تھی۔ دفعتاً امینہ بیگم کی نظریں دور کھڑے بھائی پر پڑیں تو وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

عشاء ڈری سہمی دبوسی لڑکی تھی۔ لوگوں سے گھلنے ملنے سے کتراتی تھی یہی وجہ تھی کہ امینہ بیگم اسے قریبی تقاریب میں زبردستی گھسیٹ کر لاتی تھیں تاکہ اس کی خوداعتمادی

بحال ہوسکے۔ اس کے دل کی سرزمین پر پنجے گاڑے بہت استحقاق سے براجمان تھا وہ مکمل طور پر ختم نہیں تو کم تو ضرور ہوجائے، یہ تقریب ان کے بھائی ایاز کے بچوں کے عقیقہ کی تھی، ایاز اسٹیٹس کونشس تھا اور کافی امیر بھی تھا۔ بیوہ بہن کو یاد رکھتا مگر امینہ اور ان کے میکے والوں کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان کا میکہ کافی آزاد خیال تھا، اس کے برعکس امینہ نے نہ صرف خود زندگی شریعت کی اصولوں پر گزاری تھی بلکہ عشاء کی بھی اسی طرح سے تربیت کی تھی۔ عشاء کو انہوں نے کھلی آزادی دی نہ اسے ماڈرن لڑکیوں کی طرح بے ہودا ملبوسات زیب تن کرنے دیئے۔ عشاء کو انہوں نے باپردہ اور عملی مسلمان عورت کے روپ ہی میں ڈھالا تھا۔

''اوہ ہائے عاشی ڈارلنگ، کیسی ہو تم؟ اور یہ کیا بڑھیاؤں والا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے،، بالکل ماسی بنی ہوئی ہو۔ ابھی پھپو بھی کچھ ایسے ہی حلیے میں دکھی ہیں مجھے۔'' عفت، تیسرے ماموں کی منجھلی بیٹی اس کے قریب آئی اور استہزائیہ لہجے میں بولی۔ امینہ بیگم بھائی سے ملنے چلی گئی تھیں اور عفت انہیں دیکھ کر ہی عاشی سے ملنے آئی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟'' وہ بروقت رسمی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتی اعتماد سے گویا ہوئی۔

''ہمیشہ کی طرح دلکش اور خوب صورت، خیر آؤ میں تمہیں اپنی فرینڈز سے ملواؤں۔'' عفت کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بولی۔ عاشی اس کے جملے پر بغور اسے تکنے لگی۔ سلیولیس شارٹ شرٹ جو اس کے جسم سے چپکی ہوئی تھی اور اسی طرح کی تنگ پینٹ پر شولڈر کٹ بال، موبائل فون کے بٹن پریس کرتی گاہے بگاہے عاشی پر نظر ڈالتی وہ کہیں سے بھی مہذب فیملی کی نہ لگ رہی تھی۔

''نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں، تم انجوائے کرو۔'' عاشی فوراً بولی۔

''اچھا جیسی تمہاری مرضی۔'' عفت طنز سے بھرپور نگاہ اس کے وجود پر ڈال کر آگے بڑھ گئی۔

''بیٹا...... کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟'' عاشی جو عفت کو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتا دیکھ رہی تھی اس میٹھے لہجے والی آواز پر چونک کر سیدھی ہوئی۔ وہ جو کوئی بھی تھیں کرسی کی پشت پر دودھیا ہاتھ رکھے مسکرا کر اجازت طلب کر رہی تھیں۔ کچھ لوگ خود میں ایسا سحر رکھتے ہیں کہ ان کی جانب اٹھنے والی نگاہ پلٹنا بھول جاتی ہے جیسے اس وقت عاشی کی نگاہیں ہٹنا بھول گئی تھیں۔ پنک رنگ کے سادہ کاٹن کے شلوار قمیص پر سیاہ چادر جس پر گولڈن رنگ سے نفیس کڑھائی کی گئی تھی زیب تن کیے چادر کے ہالے میں مقید ان خاتون کا مقدس چہرہ بھی نور سے جگمگا رہا تھا۔

''جی...... جی پلیز بیٹھیں ناں آپ کھڑی کیوں ہیں؟'' عاشی کہنے کے ساتھ احتراماً اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور پھر ان کے ساتھ ہی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اجنبی خاتون نے دریافت کیا۔

''میرا نام عشاء عمران ہے، پیار سے سب عاشی بلاتے ہیں۔'' عاشی نے مسکرا کر کہا۔

''بیٹا مسلمان گھرانے کا یہ حال دیکھ کر میرا دل ہول رہا ہے۔ دیکھو ذرا یہ آج کل کے بچے کس بے شرمی سے رقص میں مصروف ہیں اور اب تو لڑکیوں میں بھی فلمیں اور ڈرامے دیکھ کر حیا رہی نہیں ہے، اس طرح کے کھلے گہرے گلے، نیم برہنہ ملبوسات اور اس پر دوپٹا ندارد، یہ سب کچھ دیکھ کر دل کٹ رہا ہے میرا۔'' عاشی کی نظریں بھی بے ساختہ اس بے ہودا منظر پر اٹھی جہاں اب صنف نازک رقص میں مصروف تھیں اور ان کا ساتھ لڑکے بھی دے رہے تھے۔

''جی آنٹی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، مسلمان مرد ہوں یا عورتیں، سب اپنی نمازیں، تقویٰ، رہن سہن، پردہ سب کچھ بھلا کر اس زندگی کو اپنا بیٹھے ہیں جس کے اختتام پر صرف اور صرف رسوائی ہی ہے۔ جہنم کی آگ ہے عذاب ہے۔ عورت جس کا دوپٹا پہلے سینے سے اور اب سرے سے ہی غائب ہوگیا ہے یہ سب اس ماحول کے

سبب ہے جو ہم بیرون ملک کے ٹی وی ڈراموں کو دیکھ کر اپنا رہے ہیں۔ اگر اس دہری زندگی سے جو صرف گناہوں سے پر ہے، مسلمان مرد اور عورتیں آج خود کو نہیں بچائیں گے تو نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا۔'' عاشی بولی۔ خاتون اس کے خیالات سے متاثر ہوئیں۔ اس کے ہر انداز سے اس کی ماں کی تربیت ظاہر ہو رہی تھی۔

''بیٹا...... اتنی کم عمری میں اس طرح کی سوچ یقیناً تمہاری ماں نیک عورت ہوگی جس نے تمہاری اتنی اچھی پرورش کی۔'' وہ خاتون اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی دعائیں دیتی کھڑی ہوگئیں۔

''آپ اتنی دیر بیٹھی مجھ سے باتیں کرتی رہیں، مجھے وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوسکا اور دیکھیں میں آپ کا نام بھی نہ پوچھ سکی، آپ کا کیا نام ہے؟'' عاشی انہیں اٹھتا دیکھ کر بولی، اس کو یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ اچھی آنٹی اپنا نام بتائے بغیر ہی رخصت نہ ہوجائیں۔

''بیٹا میں تمہاری امی سے ملنے آؤں گی، تھوڑا صبر کرو پھر سب کچھ جان جاؤ گی میرے بارے میں۔'' وہ خاتون پراسرار طریقے سے مسکرائی اور پلٹ گئیں، عاشی ان کی مبہم گفتگو سے کوئی نتیجہ اخذ نہ کرپائی۔ دور سے آتی ماں پر نظر پڑی جو اس کی جانب آرہی تھیں تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر امی کے اشارے پر ان کے ساتھ چل پڑی تھی۔

❀......❀......❀

''عاشی تمہیں ماموں کے بچوں کے عقیقے میں طیبہ بھابی ملی تھیں اور تم نے مجھ سے ذکر بھی نہیں کیا۔'' عاشی جو ابھی کالج سے لوٹی تھی اور منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھانا شروع ہی کیا تھا کہ امینہ بیگم نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ خوشی ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔

''کون طیبہ بھابی؟'' نوالہ منہ میں رکھتی وہ نہ سمجھی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں جو خاتون ماموں کی دعوت پر ملی تھیں،

جنہوں نے پنک شلوار قمیص پر سیاہ کڑھائی والی چادر اوڑھ رکھی تھی اور جو کافی ڈھیر ساری باتیں کر کے اٹھی تھیں، وہ دراصل میرے بچپن کی گہری سہیلی طیبہ بھابی ہیں۔ جنہیں میں ماضی میں طیبہ اور شادی کے بعد بھابی کہنے لگی ہوں کیونکہ ان کی شادی میرے تایا زاد بھائی سے ہوئی تھی۔ خیر وہ تمہارا رشتہ ڈال کر گئی ہیں اور یہ تصویر بھی دے کر گئی ہیں تاکہ تم دیکھ سکو۔" امینہ اس کے بھول پن پر اسے تفصیل سے بتاتی رہیں۔ چہرے پر موجود مسکراہٹ اب بھی پہلے ہی کی طرح قائم تھی۔

"وہ میرا رشتہ لے کر آئی تھیں، وہ بھی مجھ سے محض ایک ہی بار ملنے پر۔" ماں کے تفصیل سے بتانے پر اب طیبہ بھابی ہرگز بھی اس کے لیے انجان نہ رہی تھیں مگر وہ بے تحاشا حیران تھی کہ وہ اس ہی کا رشتہ کیوں لے کر آئیں حالانکہ وہاں اس سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں بھی موجود تھیں۔

"طیبہ بھابی کا کہنا ہے کہ تم انہیں اس لیے پسند آئی ہو کیونکہ آج کل کی دوہری زندگی گزارنے والی لڑکیوں کا عکس تم میں انہیں ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکا۔ یہ تصویر دیکھو کتنا اسمارٹ سا بیٹا ہے ان کا، تم بتاؤ کیا میں ہاں میں جواب دے دوں؟" امینہ نے تصویر کی جانب ایک بار پھر اس کی توجہ مبذول کرائی اور ساتھ ہی ہاں یا نہ کا عندیہ چاہا۔

"امی جیسے آپ کی مرضی۔" تصویر کو ایک نظر دیکھنے کے بعد حیا دار پلکیں جھکائے، شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی ساتھ ہی سر بھی حیا سے جھک گیا تھا۔ امینہ بیگم اس کے انداز پر نہال ہوتی دعائیں دیتی مسکراتی ہوئی اٹھ گئیں۔

طیبہ، امینہ بیگم کی بچپن کی سہیلی تھیں، شادی کے بعد وہ شوہر کے ساتھ ہی بیرون ملک چلی گئی تھیں۔ حال ہی میں کراچی شفٹ ہو کر بیٹے کے لیے لڑکی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئی تھیں۔ وہ خود بھی پردہ کرتی تھیں اور مذہب سے قریب تھیں بیٹے کی تربیت بھی انہوں نے ایسی ہی کی تھی۔ وہ امینہ کے میکے والوں کو بھی جانتی تھیں۔ جب ہی دعوت پر وہ بھی مدعو تھیں مگر وہ تو لڑکی دیکھنے کی نیت سے آئی تھیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ٹھہریں۔ عشاء انہیں بہت پسند آئی تھی، طیبہ نے عاشی سے یہ بات پوشیدہ رکھی تھی کہ وہ اس کی ماں کی دوست ہیں وہ عاشی کی سوچ وخیالات جاننا چاہتی تھیں یہی وجہ تھی کہ عرصہ دراز کے بعد دیکھنے والی عزیز دوست سے ملے بغیر ہی وہ واپس لوٹ گئی تھیں۔ پر اس احساس کے ساتھ کہ وہ اپنی دوستی کو گہرے مراسم میں بدل دیں گی، عاشی کو اپنی بہو بنائیں گی۔

"عاشی یاد رکھنا...... عورت نام ہی خود کو چھپا کر رکھنے کا ہے، اپنی عزت وآبرو کو پردے میں ڈھانپ کر رکھنا، تم کبھی اس دوہری زندگی میں قدم نہ رکھنا جس میں عورت کے لیے صرف رسوائی ہی رسوائی ہے اور جہنم کی آگ ہے۔" ماں کی کبھی کی کہی ہوئی باتیں آج نہ جانے کیوں اسے یاد آ رہی تھیں۔

"امی میں نے اس زندگی کا انتخاب خود اپنی مرضی سے کیا ہے، میں اس عزت آبرو کو ہمیشہ پردے میں چھپا کر رکھوں گی کیونکہ اگر اس کے برعکس کیا تو...... تو دوہری زندگی مجھے ساری عمر اپنے عذاب میں گرفتار رکھے گی۔" وہ دل ہی دل میں ماں سے مخاطب تھی تب ہی دفعتاً اس کی نظر قریب رکھی تصویر پر پڑی جہاں عادل دلکشی سے مسکراتا اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ گیا تھا۔ بے اختیار ہی اس کے لب آپ ہی آپ مسکرانے لگے۔ خوشیاں اس کے وجود پر بارش کی مانند برسنے کو بے تاب ہوئیں اور وہ ان خوشیوں کو اپنے ہونے والے شریک سفر کے ساتھ قبول کر چکی تھی۔

الٹا چکر

عائشہ اختر بٹ

نیم کے درخت پر چڑیاں ادھر سے ادھر پھدکتی پھر رہی تھیں، سکینہ مسکرائی اور جلدی جلدی ہاتھ چلاتے ہوئے آخری روٹی توے پر ڈال دی، صبح صبح کا وقت تھا۔ سکینہ کا معمول تھا کہ وہ روز چڑیوں کو اپنے ہاتھوں سے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ڈالتی اور اپنے ہاتھوں سے لگائے ہوئے نیم کے درخت کو پانی بھی دیتی۔ سکینہ نے جب اس گھر میں قدم رکھا تو سونا آنگن دیکھ کر افسردہ ہوگئی تھی اور نیم کا پودا کچے صحن میں ایک طرف دبا دیا۔ پھر روز اس کی گوڈی کرتی اور پانی بھی دیتی۔ نتیجتاً اب یہ جوان ہو کر گھنا درخت بن گیا تھا۔ وہ اس کی ٹھنڈی چھاؤں میں مزے سے بیٹھ کر گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی اور پھر وہیں نیم دراز ہو جایا کرتی تھی۔ سکینہ نے شوہر کو ناشتہ دینے کے بعد چڑیوں کی طرف توجہ کی اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ان کے آگے ڈال دیئے۔ مٹی کی کنالیوں (آبخوروں) میں تازہ پانی بھر کر رکھا اور پھر نیم کو پانی سے تر کر دیا۔

سکینہ کی شادی کو آٹھ سال بیت چکے تھے مگر گود ہنوز خالی تھی۔ چڑیاں پیٹ بھر کر اڑ گئی تھیں۔

❁......❁......❁

سکینہ نے تنہائی سے تنگ آ کر محلے کی بچیوں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ اس سلسلے کو چوتھا سال تھا مگر اس کا درد جوں کا توں تھا۔ دن تیزی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ وہ بچیوں کو سبق دے کر فارغ ہوئی تو آٹا گوندھنے کے لیے اٹھی۔ پانی لینے کی خاطر چھوٹی دیگچی اٹھائی اور نلکے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اچانک سکینہ کو شدید چکر آئے اور وہ اپنا توازن

برقرار نہ رکھ پائی اور زمین پر گر کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ جانے کب اس کا شوہر آیا اور اسے اٹھا کر صحن میں رکھی چارپائی پر لٹایا اور ڈاکٹر کو بلالایا تھا۔

❁.....❁.....❁

سکینہ آج بہت خوش تھی اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چڑیوں کو ڈال رہی تھی، چڑیاں خوب چہک چہک کر روٹی کے ٹکڑے چگنے میں مگن تھیں۔ ایک خوشگوار سی مسکراہٹ سکینہ کے لبوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ سرشاری سی سرشاری تھی۔ اللہ نے سکینہ کی سونی گود بھر دی تھی۔ رضوان اس کا بہت خیال رکھتا۔ قدرت کی اس مہربانی پر وہ بے حد شکر گزار تھے۔ سکینہ آنے والے ننھے مہمان کا سوچتی تو خوش ہوجاتی ماں بنے کا احساس بہت بھلا لگ رہا تھا۔

❁.....❁.....❁

پھر وہ دن بھی آ گیا جب سکینہ کی گود میں عبداللہ آ گیا۔ گھر میں اس ننھے مہمان کی آمد پر رضوان اور سکینہ بہت خوش تھے۔ سسرال اور میکے میں ایسا کوئی نہ تھا جو اس موقع پر سکینہ کی دیکھ بھال کرتا اور بچے کو بھی سنبھالتا ایسے میں رضوان نے ہی سکینہ کا خیال رکھا اور بچے کو سنبھالنے میں بھی سکینہ کا ہر ممکن ساتھ دیا۔

نیم کے درخت پر سہمی ہوئی چڑیاں سر جھکائے افسردہ سی نظر آرہی تھیں چارپائی پر پڑے بے جان وجود کے سرہانے بیٹھی روتی، کرلاتی سکینہ کو دیکھ کر بے چینی سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جا بیٹھیں۔ لوگ افسوس کے لیے آرہے تھے اور میت کے پاس بیٹھ رہے تھے۔ سکینہ کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ بہت تھوڑا وقت ہی وہ دونوں ساتھ رہ پائے تھے، ابھی تو انہوں نے بچے کی خوشی کو بھی مکمل طور پر محسوس نہیں کیا تھا۔

نیم کے پتوں پر پڑی اوس سورج کی ہلکی ہلکی شعاعیں پڑنے سے یوں پگھل کر گر رہی تھی جیسے ہر پتے کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوں۔ نیم کا درخت سوگوار صورت بنائے ہولے ہولے سسکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

سکینہ دو سالہ عبداللہ کو سینے سے لگائے بے حال تھی۔ وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ ننھے عبداللہ کو ماں کی محبت کے ساتھ باپ کی شفقت کی بھی ضرورت تھی۔ سکینہ نے ہمت نہیں ہاری اور عدت ختم ہوتے ہی محلے کی خواتین اور چھوٹے بچوں کے کپڑے سینا شروع کردیے تاکہ کچھ آمدنی ہو۔ محلے کی خواتین بھی اس سلسلے میں سکینہ کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس کی زندگی معمول سے ہٹ کر چلنے لگی تھی۔ عبداللہ اسکول جانے لگا تھا۔

❁.....❁.....❁

عبداللہ ماں کا بے حد لاڈلا تھا اور ہر خواہش کو حق سمجھ کر پوری کرواتا۔ ماں کے دکھوں سے بے خبر۔ وہ پائی پائی جوڑ کر رکھتی کہ بیٹے کے کام آئے گی۔ سارا دن سلائی کرتی تاکہ بیٹے کو تکلیف نہ ہو ہر ماں کی طرح اس نے بھی اولاد کو خوش دیکھ کر خوشی ملتی تھی۔ یہ ماؤں کے دل بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں ناں اپنا ہر سکھ اور خوشی اولاد کے سر سے یوں وار کر پھینک دیتی ہیں جیسے ان کو ان خوشیوں سے کوئی سروکار ہی نہ ہو، جیسے ان کے دلوں نے کبھی کسی خوشی کی تمنا ہی نہ کی ہو۔

❁.....❁.....❁

آج عبداللہ شہر اعلیٰ تعلیم کے لیے جارہا تھا۔ سکینہ کے بالوں میں چاندی اترنے لگی تھی مگر وہ بیٹے کو پڑھانے کے لیے کمربستہ تھی۔ اس کے حوصلے کبھی پست نہ ہوئے تھے بیٹے کی خوشی کی خاطر وہ پوری لگن اور دلجمعی سے سلائی کا کام کرتی۔ سکینہ نے اپنے مرحوم شوہر کی نشانی، سونے کے جھمکے انگوٹھی اور چار چوڑیاں سنار کو دے دیں ان کے بدلے جو رقم ملی وہ بیٹے کی پڑھائی پر قربان کردی۔ دل بے حد اداس تھا مگر بیٹے کو کسی مقام پر دیکھنا چاہتی تھی، سو دل کڑا کرلیا ساری جمع پونجی بھی بیٹے کو دے دی۔ وہ شہر چلا گیا تھا۔ اب سکینہ پھر سے گھر میں مصروف ہوگئی تھی۔ وہ فارغ وقت میں

سلائی کرتی اور اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے پیسے جوڑ جوڑ کر رکھتی پر اس میں اب کام کرنے کی پہلے جیسی طاقت نہیں رہی تھی وہ دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھی۔ ایسے میں اسے بیٹے کے لیے چاندسی دلہن لانے کی خواہش ہوئی، اس کی آنکھوں کے سامنے وہ چھوئی موئی سی ہما آ گئی جو یتیم اور مسکین تھی اور اپنے چچا، چچی کے پاس رہتی تھی کہنے والوں نے کہا کہ لڑکی نہایت تیز طرار ہے سکینہ سوچ لے مگر سکینہ کو تو اس کی یتیمی، مسکینی سے آگے کچھ دکھائی ہی نہ دیا۔ جٹ منگنی پٹ بیاہ کیا اور لے آئی بہو، لڑکی بلاشبہ بے حد حسین تھی مگر بے حد طرح دار تھی۔ پہلے پہل تو شوہر کے سامنے خوب اماں، اماں کیا مگر جب دیکھا کہ ساس بیچاری بے وقوف ہے تو فوراً اصلیت پر آ گئی اور سکینہ کو اس کے کمرے تک ہی محدود کردیا۔ بہو زبان کی بھی بہت تیز تھی جبکہ سکینہ سیدھی سادھی خاتون تھی اس لیے اس کی خرافات سن کر وہ خاموش رہتی تھی۔ وقت تھوڑا اور سرکا تو سکینہ فالج کا شکار ہوگئی۔ اب تو ہما نے بالکل ہی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ عبداللہ شہر میں رہتا تھا اسے گھر کے حالات پتا نہیں تھے ایک روز وہ چھٹی لے کر واپس آیا تو ماں کو کھانسے دیکھا تو اسے تشویش ہوئی گاؤں کے ڈاکٹر کو دکھایا اس نے ٹی بی کا بتایا مگر ساتھ ہی حوصلہ بھی دیا کہ یہ مرض لاعلاج نہیں ہے، باقاعدہ کورس مکمل کروائیں تو جلد صحت یاب ہوسکتی ہیں۔ عبداللہ شہر سے ڈاکٹر سے دوا لایا اور بیوی کو تھمادی، اب عبداللہ ہفتے بعد گھر آتا تھا، فیکٹری میں کام کافی بڑھ گیا تھا۔ فیکٹری کا مالک اس پر بے حد مہربان تھا۔ سکینہ لاغر وجود کے ساتھ اب بہو کے رحم وکرم پر تھی دل چاہتا تو دوا دیتی نہ چاہتا تو نہ دیتی تھی۔ اس نے کون سا بھی بیٹے سے شکایت کی تھی، عبداللہ آنے والا ہوتا تو سکینہ کو نیا جوڑا پہنا کر کنگھی کردیتی تاکہ سب اچھا ہے کا تاثر ملے۔

❁......❁......❁

ہما ماں کا درجہ پا گئی تھی۔ سکینہ مزید کمزور ہوتی

جارہی تھی۔ ہما کے ساتھ برا یہ ہوا تھا کہ وہ غسل خانے میں گر گئی تھی لیڈی ڈاکٹر نے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ دوبارہ ماں نہیں بن پائے گی۔ وہ ہر وقت بیٹے کو سکینہ سے دور رکھتی اور اس کو کوستی رہتی کہ یہ سب اس کی نحوست سے ہوا ہے مگر سکینہ بہو کے طعنوں تشنوں پر اف تک نہ کرتی تھی۔

❁......❁......❁

سکینہ کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔ ہما نے ٹی وی کی آواز اور تیز کردی تھی۔ وہ کھانستی ہوئی گرتی پڑتی بمشکل کمرے سے باہر آئی اور چڑیوں کے لیے رکھے گئے پانی کے برتن سے منہ لگا کر پانی پی لیا۔ سکینہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے کمرے کی طرف نگاہ کی۔ اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھری کہ کاش اس کا پوتا آ کر اس کے سینے سے لگ جائے۔ وہ ایک بار اپنے پوتے کو سینے سے لگانا چاہتی تھی مگر ٹانگیں بے جان ہونے لگیں تو وہیں زمین پر لیٹ گئی کچی زمین...... انسان کا اصل مقام ہے۔ سکینہ کو کچی زمین پر لیٹ کر بے تحاشہ سکون مل رہا تھا۔

❁......❁......❁

سکینہ کو مرے آج پچیس سال گزر گئے تھے۔ حالات آج بھی ویسے ہی تھے۔ عبداللہ ماں کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے چھ سال بعد ہی ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کر گیا تھا اور ہما اپنے بیٹے کے ساتھ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ آج سکینہ کی جگہ اس کی بہو ہما تھی بالکل ویسے ہی زور، زور سے کھانستے ہوئے مگر اس کی کوئی بہو اندر کمرے میں نہ تو ٹی وی دیکھ رہی تھی نہ ہی اس گھر میں ہی کہیں موجود تھی اس کا بیٹا سکینہ کی موت کے دوسرے روز تیز بخار میں مبتلا ہوا اور جان کی بازی ہار گیا تھا۔ گویا ہما کے جینے کی وجہ بھی ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اس اچانک موت پر ذہنی توازن کھو بیٹھی تھی۔ محلے کی کوئی عورت آتی تو ہما نیم آنکھوں سے اس کو دیکھتی پر کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے تو حرکت کرتے ہی تکلیف شروع ہوجاتی تھی۔

دل اس کا جرم یاد کرواتا تھا۔ وہ دن بدن کمزور ہوتی جارہی تھی یہ وقت کا پہیہ تھا جو الٹا چکر کاٹ رہا تھا کہتے ہیں وقت اپنے آپ کو کبھی نہ کبھی دوہراتا ضرور ہے۔ آج بھی وقت الٹا چکر کاٹ رہا تھا سب کچھ...... پرانی یادیں، پرانے اعمال، گزرا ہوا وقت، اپنے ہاتھوں بویا ہوا بیج سب کا سب اس الٹے چکر میں اس کو واضح دکھائی دے رہا تھا مگر وہ اس تیز گھومتے پہیے کو ہاتھ بڑھا کر روکنے سے قاصر تھی۔

ایک دم ہی سکینہ کی بہو چلانے لگی، پڑوس کی پروین اسی لمحے گھر میں داخل ہوئی تھی اور ہما کو سنبھالا پر وہ رونے لگی تھی۔

❁......❁......❁

ہما اپنے کیے پر پچھتا رہی تھی، پر اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہوسکتا تھا جو اس نے بویا تھا وہی اس کو کاٹنا بھی تھا۔ ہما بھری دنیا میں تنہا تھی اور کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا سوائے اللہ کے، پر وہ اس تعلق کو بھی کہاں پہنچ پائی تھی۔ جب دلوں پر مہر لگ جائے تو انسان اس سے غافل ہوجاتا ہے اور یہ مہر بھی اس کی طرف سے ہی لگتی ہے۔

اللہ ہمارے دلوں میں اپنی محبت قائم رکھے آمین

ہما کی موت کا وقت مقرر ہے پر یہ موت بھی اتنی آسانی سے کہاں آتی ہے اس کی زندگی اس کے وجود سے چمٹی اس کی موت کا راستہ روکے ہوئے تھی۔

انتخاب

سارہ عمر

''بس بہت ہو گیا، آج تمہیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔'' آج بھی ان کے لہجے میں ان کا ازلی جلال بول رہا تھا۔ وہ جانتے تھے انتخاب انہی کا ہوگا بھلا آج تک کسی کو انکار کرنے کی ہمت ہی کب ہوئی تھی۔ اس نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ ایک لمحے کو سامنے کھڑے دونوں مردوں کے چہرے دھندلا گئے تھے۔

''ایسا مت کریں میرے ساتھ۔'' اس نے انہیں منانے کی کوشش کی مگر وہ ملک تیمور ہی کیا جو کبھی کسی کی بات مان لیں۔

''فیصلہ کرو کون ہے تمہارا انتخاب یہ شخص یا میں؟''

انہوں نے کندھوں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا، مدمقابل تو ہونٹوں پہ قفل لگائے بے یقینی کی سی کیفیت کا شکار تھا۔

کئی سال پہلے بھی وہ ان حالات سے گزر چکی تھی۔ وہ دن آج بھی اپنی پوری حقیقت کے ساتھ اس کی یادداشت میں تازہ تھا۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتی تو یقیناً اس کا فیصلہ مختلف ہوتا۔ وہ ان لمحات کو یاد کرتے ہی ایک لمحے کو چونکی اور دو قدم پیچھے ہوئی۔

''ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔'' یہ الفاظ نہیں پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ان کے کانوں میں انڈیلا گیا تھا۔

وہ اپنی محبت کا ہاتھ تھامے ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو ملک تیمور اپنے قدموں پہ کھڑے نہ رہ پائے اور وہیں صوفے پہ ڈھیر ہو گئے۔ وہ حیرت زدہ تھے آج اس کا انتخاب بدل کیوں گیا حالانکہ سالوں پہلے تو یہ قرعہ فال ان کے نام نکلا تھا مگر وہ غلط تھے۔ یہ قرعہ فال ان کے نہیں فقط رشتے کے نام نکلا تھا۔

❁......❁......❁

ملک تیمور اور شیریں کی شادی ان کے والدین کی پسند سے ہوئی تھی۔ شیریں تو اپنے نام کی طرح زبان کی بھی شیریں تھیں جو کوئی مل لیتا کبھی اس کو بھلا نہ پاتا۔ بھول تو ملک تیمور بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ جس طرح ہر شخص پہ طنز کے نشتر چلاتے مدمقابل اس سے بچنے کی کوشش میں بھی لہولہان ہو جاتا۔ ملک تیمور نے والد کے انتقال کے بعد سارا کاروبار خود ہی سنبھالا تھا۔ چھوٹی عمر میں ضرورت سے زیادہ بھاری بوجھ نے ان کے کندھوں کو شل کر دیا تھا۔ کئی رشتے داروں نے ایسی صورت حال میں کاروبار ہتھیانے کی کوشش کی مگر ملک صاحب والد کی وراثت کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن گئے تھے۔ لوگوں کے منفی رویوں نے نہ صرف انہیں سخت جان بنا دیا تھا بلکہ وہ زبان کے بھی کڑوے ہو گئے تھے۔ والدہ نے بارہا سمجھایا کہ اتنا سخت اور پتھر دل نہ بنو یہ صفت انسانوں کو نہیں پتھروں کو ہی زیب دیتی ہے مگر وہ اپنی روش پہ قائم رہے۔

شیریں ان کے آنگن میں بہار بن کر اتری تھی۔ وہ ان کی چچا زاد تھی۔ چچا نے کاروبار کے سلسلے میں بھی ان کا بہت ساتھ دیا تھا۔ زندگی دبے پاؤں گزر رہی تھی جب مراد اور مرحا کی آمد نے ان کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ مرحا مراد سے پانچ سال چھوٹی تھی۔ بیٹی میں تو ملک تیمور کی جان تھی۔ جب تک مراد اکلوتا تھا تو ملک تیمور اتنے ذمہ دار اور حساس نہ تھے مگر بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ اپنی بیٹی کے لیے جتنے نرم دل تھے دوسرے لوگوں کے لیے اتنا ہی سخت اور مزاج کے کڑوے تھے۔ مرحا کی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ شیریں سے خوب سوال وجواب کیے جاتے۔

''آج یہ دوپہر میں سوئی کیوں نہیں؟''

''مہمان آگئے تو کیا بچہ آرام نہ کرے؟''

کبھی کہتے ''اسے چوٹ کیسے لگ گئی یقیناً تم نے ہی اس کا خیال نہ رکھا ہوگا۔''

شیریں چونکہ ان کی فطرت سے واقف تھی جبھی نہایت تحمل اور صبر و برداشت کا مظاہرہ کرتی۔ اس کی والدہ نے اس کی تربیت ہی ایسی کی تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پہ نہ لیتی۔ ملک صاحب جتنا مرحا کے لیے پریشان رہتے، مراد بھی اتنا ہی اپنی بہن کا خیال رکھتا تھا۔ لڑائی جھگڑا تو ویسے بھی وہ دونوں نہ کرتے تھے مگر وہ بھی مرحا کو کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھتا تھا۔

وقت گزرتا گیا، مراد شادی کر کے ان کے کاروبار کے سلسلے میں ہی ملک سے باہر چلا گیا۔ ہر چھ ماہ بعد وہ بیوی بچوں کے ساتھ چکر لگاتا تو گھر میں رونق ہو جاتی تھی۔ مرحا کی شادی کا فیصلہ ملک تیمور کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا۔ رشتے کے لیے آنے والے ایک ایک فرد سے ملک صاحب نے بالمشافہ ملاقات کی۔ کوئی ایک بھی لڑکا ان کی نظر میں جچتا نہ تھا۔ کوئی خاندانی نہ تھا تو کوئی شکل صورت میں کم لگتا۔ کسی کے گھر میں عیب دکھائی دیتا کسی کے گھر والوں میں۔ کئی رشتے مسترد کرنے کے بعد فیصلہ بالآخر ملک شہوار کے حق میں فیصلہ ہو گیا تھا۔

وہ ان کے ایک کاروباری حلیف کا بیٹا تھا۔ کاروبار، خاندان، رکھ رکھاؤ، شکل وصورت میں وہ واقعی مرحا کے ہم پلہ تھا۔ مرحا عادات میں بالکل اپنی والدہ کا پرتو تھی۔ والدہ نے کبھی ملک صاحب کے رویے کا شکوہ اپنی اولاد سے نہ کیا تھا مگر کئی سال پہلے ہونے والے ایک حادثے نے ان کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ حادثہ ہی تو تھا جو اپنے ساتھ کئی رشتے لے گیا تھا۔ آہستہ آہستہ سب بہتر ہو گیا رشتے بحال ہو گئے مگر وہ غم شیریں بیگم کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔

مرحا کی شادی بہت دھوم دھام سے کی گئی تھی۔ کتنے ہی دن شادی کی تقریبات چلتی رہیں۔ چاند سورج کی اس جوڑی پہ سب لوگ رشک کرتے۔ ملک شہوار تو پہلی نظر میں ہی مرحا پہ دل ہار بیٹھا تھا۔ اس

سے شادی کے بعد وہ خود کو خوش قسمت ترین شخص سمجھتا۔ مرحا اس کی زندگی میں بہار بن کر آئی تھی۔ کچھ ماہ تک تو سب کچھ خوش اسلوبی سے چلتا رہا مگر حالات اس وقت خراب ہونے لگے جب ملک تیمور کی مداخلت ان کی زندگی میں بڑھتی گئی۔

پہلے پہل وہ مرحا کو کئی دن اپنے پاس بلا لیتے تو شہوار مچل کر رہ جاتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی محبوب بیوی سے ملنے پہنچتا تو کبھی وہ گھر پہ نہ ہونے کا بہانہ کر دیتے یا ملاقات ہو بھی جاتی تو وہ مستقل مرحا کے ساتھ رہتے۔ وہ اپنی بیوی سے اپنی شدتوں کا اظہار کیے بغیر ہی چلا جاتا۔ جب وہ شہوار کے ساتھ ہوتی تو بار بار مرحا کو چھو کر دیکھتا۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی کو محسوس کرتا۔ اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں پہ رکھ کر اس سے باتیں کرتا رہتا۔ مرحا اس پاگل پن پہ شرمسار ہو جاتی۔

''تم مجھ سے دور تو نہیں جاؤ گی؟'' وہ بار بار پوچھتا۔ کبھی گھنٹوں اسے اپنے کمرے سے نکلنے نہ دیتا۔

''مجھے لگتا ہے تمہیں مجھ سے کوئی چھین لے گا۔'' ایک دن وہ اپنے دل کا حال کہہ بیٹھا تھا۔

''بھلا کون؟'' وہ حیران ہوئی۔ بار بار اس بات کے ذکر کرنے پہ وہ بھی جواباً پوچھ بیٹھی۔

''تمہارے والد۔'' جواب بے ساختہ تھا جبکہ مرحا بری طرح چونکی تھی۔ وہ بچپن سے اپنے والد کی محبت اور حساسیت سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ شادی بھی اس کی والدہ اور لوگوں کے اصرار پہ کی گئی ہے ورنہ ملک تیمور کا دل چاہتا تھا کہ اپنی بیٹی کو لے کر کہیں گوشہ نشین ہو جائیں۔ وہ گھر جاتی تو وہ اپنے سب کام چھوڑ کر اسی سے باتیں کرتے رہتے۔ اس کا ہاتھ تھام کر بار بار اس سے یہی کہتے۔

''کبھی شہوار تمہیں تنگ کرے یا تکلیف دے تو بتانا میں تمہیں ایک لمحے میں اپنے پاس لے آؤں گا۔'' وہ اب تک اسے اپنے باپ کی محبت سمجھتی رہی تھی مگر اب یہ محبت اس کے محبوب کی محبت میں حائل ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے والد کی فطرت کے متعلق شہوار کو بتا چکی تھی تب ہی وہ ان سب باتوں پہ صبر کے گھونٹ پی لیتا تھا۔

❁......❁......❁

مرحا کچھ دن سے شہوار کو پریشان دیکھ رہی تھی وہ پوچھتی تو وہ ٹال جاتا کہ کاروباری مسئلہ ہے اور واقعی ایسا تھا مگر یہ مسئلہ اس کے والد کے ساتھ ہوگا وہ یہ نہ جانتی تھی۔ کوئی ٹینڈر اس کے والد کی کمپنی کو ملنا تھا جو شہوار کی کمپنی کو مل گیا تھا۔ یہ اتنی بڑی بات نہ تھی جتنی ملک تیمور نے بنا لی تھی۔ مرحا میں ان کی جان بستی تھی مگر اپنی ہی پسند کا داماد اب انہیں اپنا حریف لگنے لگا تھا جو نہ صرف ان کی بیٹی اپنے گھر لے گیا تھا بلکہ اب ان کا کاروبار بھی اپنے نام کر وا رہا تھا۔

مرحا کو آج انہوں نے خصوصی دعوت پہ مدعو کیا تھا۔ شہوار بضد تھا کہ وہ نہ جائے مگر مرحا انکار نہ کر پائی۔ راستے میں بالآخر شہوار نے اسے ساری بات بتا دی تھی۔ نجانے کیوں وہ بے یقینی کی سی کیفیت کا شکار تھا۔ اسے لگتا تھا وہ جا تو رہا ہے مگر واپسی مرحا کے ساتھ نہ ہو سکے گی۔

''دیکھو مرحا میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پریشان ہو مگر تمہارے والد کئی بار مجھے فون کر کے دھمکیاں دے چکے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں یہ ٹینڈر میں انہیں دے دوں اسے انہوں نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ میں ایسا کر بھی دوں مگر اس میں میرے علاوہ بھی اور لوگوں کی محنت ہے میں ان کو جواب دہ ہوں اور اگر آج میں ان کے آگے جھک گیا تو ہمیشہ ہی مجھے ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔'' مرحا اس صورت حال پہ گھبرائی مگر وہ اصل سنگینی سے اس وقت واقف ہوئی جب وہ لوگ کھانا کھا کر گھر واپس آنے لگے تھے۔

''مرحا نہیں جائے گی وہ یہیں رہے گی۔'' ملک

تیمور کی بات پہ مرحا نے بے اختیار شہوار کو دیکھا جبکہ شہوار خود بھی جانتا تھا کہ آج انہوں نے فیصلے کے لیے ہی مدعو کیا ہے۔ آر یا پار۔

''جی مرحا کا گھر ہے، وہ جتنے دن چاہے رہ سکتی ہے۔'' شہوار نے دل پہ پتھر رکھ کر سعادت مندی سے کہا۔

''کچھ دن کے لیے نہیں ہمیشہ کے لیے۔'' انہوں نے ''ہمیشہ'' پہ زور دیتے تکبر سے کہا تو شیریں بیگم نے حیرانی سے ان سب کو دیکھا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ جو سب کچھ ان کے ساتھ ہوا تھا وہ ملک صاحب دوبارہ دہرائیں گے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ماضی کے منظر دوڑنے لگے۔ فیصلہ تو آج بھی ہوگا مگر کیا ملک صاحب سہہ پائیں گے؟ ماضی کا تکلیف دہ ورق سامنے آ گیا تھا۔

❁......❁......❁

گھر میں ڈھول کی آواز گونج رہی تھی۔ ڈھول کی تھاپ پہ رقص کرتی لڑکیاں کبھی ہنستیں، کبھی رقص کرتے کرتے رک جاتیں۔ شادی کی تیاریوں میں خوب گہما گہمی مچی ہوئی تھی۔ شیریں بھی مراد اور مرحا کے ساتھ بہن کی شادی کے لیے پہلے سے رہنے آ گئی تھی۔ بچوں کے بعد پہلی بار وہ اتنے دنوں کے لیے اپنے والدین کے گھر آئی تھی۔ کچھ گھر دور ہونے کے باعث اور کچھ ملک تیمور کے غصے کی بدولت بھی وہ زیادہ دن میکے رہ نہ پاتی۔ آج کل تو وہ بہت خوش تھی۔ دو دن بعد مہندی کی رسم تھی۔ وہ اپنے کمرے سے مہندی کا تھال لیے سیڑھیوں سے اتر رہی تھی کہ سامنے ملک تیمور کو کھڑا دیکھ کر حیران و پریشان رہ گئی۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔

''آپ یہاں خیریت...... وہ......'' الفاظ منہ میں ہی رہ گئے جب ان کے پیچھے مرحا کی صورت دکھائی دی۔ مرحا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جبکہ اس کے ہونٹ سے کافی خون بہہ رہا تھا۔ شیریں تھال رکھتی فوراً مرحا کے پاس آئی۔

''اب ہاتھ نہ لگاؤ اسے، اپنی بہن کی شادی میں تمہیں اپنی اولاد تک بھول گئی۔'' وہ دھاڑے تو شیریں نے گھبرا کر مرحا کو دیکھا جو چوٹ سے زیادہ والد کے غصے سے سہم گئی تھی۔

شیریں کمرے میں تھی اور تمام بچے لان میں تھے۔ وہاں کھیلتے مرحا کو کسی بچے نے دھکا دیا اور وہ گر گئی تھی۔ اسی وقت ملک تیمور گھر میں داخل ہوئے تھے۔ آنا تو مہندی والے دن تھا مگر مرحا سے ملنے پہلے ہی چلے آئے اور سامنے کے منظر نے ان کے حواس جیسے مفلوج کر دیے تھے۔ شیریں نے مرحا کی جانب بڑھنے کی کوشش کی تو ملک تیمور نے اسے روک دیا تھا۔

''جب تم اپنی بچی کا خیال نہیں رکھ سکتیں تو میں اسے لے جاتا ہوں، تم بے فکر ہو کر شادی کی تیاریاں کرو۔'' وہ مرحا کو ساتھ چمٹائے طنزاً بولے تو شیریں شرمسار ہو گئی تھیں۔ اس کے والدین، بہن بھائی، مہمان سب ہی اس ہنگامے پہ اکٹھے ہو گئے تھے۔ شادی والے گھر میں سب کو سانپ سونگ گیا تھا۔

سب کے سامنے اس قسم کی صورت حال کا سامنا کرنا بے تحاشا مشکل تھا۔ وہ شرمندگی سے اپنے والدین اور مہمانوں کا سامنا نہ کر پا رہی تھی۔ اپنے شوہر کے غصے اور بیٹی کے لیے بے جا حساسیت نے آج یہ دن دیکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''آپ مجھے مرحا کو دیکھنے تو دیں، بچے ہیں کھیل، کھیل میں لگ جاتی ہے کبھی چوٹ۔'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوئی۔

''تیمور تسلی سے بات کرو، کوئی بڑی بات نہیں۔ شادی والا گھر ہے بھول چوک ہو جاتی ہے۔ اس طرح بدمزگی کا کوئی فائدہ نہیں۔'' پہلی بار اس کے والد نے آگے بڑھ کر شیریں کی حمایت کی مگر ملک تیمور غصہ کی آگ میں چچا کا لحاظ بھی بھلا بیٹھا تھا۔

''آپ کے لیے یہ چھوٹی بات ہوگی میرے نزدیک نہیں ہے۔ لوگوں کو اپنی اولاد سے اتنا پیار نہیں ہوتا ہوگا جتنا مجھے ہے۔'' وہ بری طرح گرجا تھا۔ ذرا سی بات پہ اتنا ہنگامہ دیکھ کر تمام گھر والے پریشان ہوگئے تھے کہ کس طرح تیمور کو ٹھنڈا کریں جو کوئی بات سننے کو تیار نہ تھا۔

''تیمور آپ بیٹھیں ہم تسلی سے......''

''کسی تسلی کی ضرورت نہیں۔ میں مرحا کو ساتھ لے جارہا ہوں، اب تم فیصلہ کرو کہ یہیں رہو گی ہمیشہ یا میرے ساتھ جاؤ گی؟'' ہمیشہ کے لفظ نے وہاں کھڑے ہر شخص کو حواس باختہ کردیا تھا۔ چھوٹی سی بات پہ بیوی کو چھوڑ دینا کہاں کی عقل مندی تھی۔

''میں تم سے پوچھ رہا ہوں آج تمہیں اپنے باپ اور اپنے شوہر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ بولو کون ہے تمہارا انتخاب؟''

''ایسا مت کریں۔'' اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو بلک بلک کر رو دی تھی۔

مرحا کو اس ہنگامے میں اپنی چوٹ کا درد بھول گیا تھا۔ ہونٹ سے بہتا خون تو اب خشک ہوکر پپڑی کی مانند جم گیا تھا۔ آٹھ سال کی بچی کو سمجھ نہیں آیا کہ بھلا ہمیشہ کے لیے گھر جانے پہ امی اس قدر رو کیوں رہی ہیں۔ وہ انہی کا گھر تو تھا۔

''بولو شیریں آج فیصلہ کرو، تمہارے نزدیک کس کی اہمیت ہے میری یا اس گھر کی......؟'' شیریں نے اپنی والدہ کی جانب دیکھا جنہوں نے شادی کے وقت ایک ہی بات کہی تھی۔ ''کبھی شوہر اور والدین میں سے کسی ایک کو چننا پڑ جائے تو شوہر کو چن لینا۔ ہمارا خون کا رشتہ ہے مر کر بھی ختم نہیں ہوگا۔ اس شخص سے دو بول کا رشتہ ہے چھوٹ گیا تو کبھی جڑ نہ پائے گا۔'' اپنے والد کے پاس جاکر وہ فقط اتنا بولی تھی۔

''ابا ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔'' مرحا کا ہاتھ تھامے وہ گھر کی دہلیز پار کرگئی تو ملک تیمور کی اکڑ میں

اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں ایک نظر وہاں موجود افراد پہ ڈالی اور وہاں سے چلا گیا تھا۔

مہندی پہ تو شیریں نہ جاسکی البتہ بہن کی رخصتی پہ چند گھڑی کے لیے غیروں کی طرح ملنے کی اجازت مل گئی تھی۔ ملک تیمور نے شادی میں شرکت نہ کرکے اپنی فتح کا جشن منایا تھا۔ اسے فخر تھا کہ بیوی نے باپ کے مقابلے میں اسے فوقیت دی تھی حالانکہ ایسا نہیں تھا۔

❀......❀......❀

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے انکل، مرحا بیوی ہے میری......'' شہوار کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

''ہوگا ضرور ہوگا، اچھے سے اچھے کی تلاش میں کتنے ہی رشتے میں نے ٹھکرائے۔ تمہیں اپنی ہیرا سی بیٹی دے دی کیا اتنا کافی نہیں تھا جو تمہیں کاروبار میں بھی مجھ سے حصہ چاہیے۔'' وہ آج بھی اسی لہجے میں بول رہے تھے۔

''انکل آپ کاروبار کو رشتے سے الگ رکھیں، مرحا میرا سب کچھ ہے، آپ اسے مجھ سے جدا نہ کریں۔ آپ زیادتی کررہے ہیں میرے ساتھ۔''

''بس بہت ہوگیا۔ آج تمہیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔'' وہ تکبر کے ساتھ اپنی بات منوانے کے زعم میں اکڑ کر کہہ رہے تھے۔

مرحا نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ ایک لمحے کو دونوں کے چہرے دھندلا گئے تھے۔ بھلا ایسا بھی وقت آتا ہے کہ دو محبوب رشتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑجائے۔

''ایسا مت کریں میرے ساتھ۔'' اس نے انہیں منانے کی کوشش کی مگر وہ ملک تیمور ہی کیا جو کبھی کسی کی بات مان لیں۔

''فیصلہ کرو کون ہے تمہارا انتخاب یہ شخص یا میں؟'' انہوں نے کندھوں سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا، سالوں پہلے کا منظر اس کی یادداشت کے پردے پہ ابھرا تھا۔

وہ اپنی ماں کا دھواں دھواں چہرہ دیکھ چکی تھی۔ وہ اپنے دل سے سوال کرتی تو یقیناً اس کا فیصلہ مختلف ہوتا۔ وہ ان لمحات کو یاد کرتے ہی ایک لمحے کو چونکی اور دو قدم پیچھے ہوئی تھی۔ سالوں پہلے اس کی ماں بھی تو اسی کیفیت سے گزری تھی۔

''ہوسکے تو مجھے معاف کردیجیے گا۔'' مرحا کے الفاظ نہیں تھے پگھلا ہوا سیسہ تھا جو ان کے کانوں میں انڈیلا گیا تھا۔

وہ اپنی محبت کا ہاتھ تھامے ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو ملک تیمور اپنے قدموں پہ کھڑے نہ رہ پائے اور وہیں صوفے پہ ڈھیر ہوگئے۔ وہ حیرت زدہ تھے آج ان کا انتخاب بدل کیوں گیا حالانکہ سالوں پہلے تو یہ قرعہ فال ان کے نام نکلا تھا مگر وہ غلط تھے۔ یہ قرعہ فال ان کے نہیں فقط رشتے کے نام نکلا تھا۔ اپنے شوہر سے دو بول کے کچے رشتے کے نام۔

سالوں بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ غلط تھے، ان کی سوچ بالکل غلط تھی اور وہ درد جو آج برداشت کررہے ہیں سالوں پہلے ان کے چچا نے بھی برداشت کیا ہوگا۔ وہ تو یہ بھی بھول گئے تھے کہ کئی سال پہلے شیریں نے بھی تو اپنا گھر اور رشتہ بچانے کی خاطر اپنے سگے باپ کو چھوڑ دیا تھا تو مرحا بھی تو اسی عورت کی بیٹی تھی جس نے آج اپنا گھر بچانے کی خاطر شوہر اور باپ کے مابین فقط ''رشتے'' کا انتخاب کیا تھا اور یہ انتخاب بالکل درست تھا۔ وہ شرمندہ تھے آج ان کی آنکھیں ان کی بیٹی نے کھول دی تھیں۔

صبح کاذب کا وقت تھا۔ صبح سویرے ہی اہل خانہ اپنے اپنے کاموں میں منہمک ہو جایا کرتے تھے۔ پرندوں کی چہکار سے پورا آنگن گونجتا تھا۔ یوں لگتا جیسے وہ رب العالمین کی حمد و ثنا میں مشغول ہوں۔ شبو بھی اٹھ کر باہر آنگن میں آ گئی اور ملازمہ کو توجہ سے کام کرنے کی تاکید کرنے لگی۔

"نی شبو ناشتے کی تیاری کرو، ناشتے کی تیاری مکمل ہو جائے تو اپنی بھاوج کو بھی جگا دینا۔" اماں نے اسے نصیحت کی۔

"اماں یہ اچھی بات ہے۔ یہاں ساری ملازموں کے سر پر کھڑی ہوں میں ناشتے کی بھی تیاری کرواؤں۔ اپنی مہارانی کی تجھے کوئی خیر خبر ہی نہیں ہے۔ بھرجائی کو ابھی سے سر پر چڑھائے گی تو ہم سب ہی سر پر ہاتھ رکھ کر روئیں گے۔" شبو نے بھی تیز لہجہ میں کہا، بیگم رب نواز نے ایک تیکھی نگاہ اس پر ڈالی۔

"کچھ شرم کر، اتنا اونچا بول رہی ہے۔ یہ ہماری جوتیاں اٹھانے والی گھر گھر جا کر کہانی سنائیں گی۔ کچھ تو لحاظ کر۔" بیگم رب نواز نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے جا کر آواز کو دبا کر کہا۔

"دیکھ اماں میں نے جو کہا اس پر مجھے شرم نہ دلا اور ہمیں کیا ملازمینوں کا ہم نے اچار ڈالنا ہے۔ جس دن سے یہ آئی ہے میرا بھائی گھر ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ لاہور کے چکر کاٹ رہا ہے۔ یہاں پنڈ میں سب کو ہی احساس ہو گیا ہے۔ ایک میرے کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تو مان لے کہ تیری بہو تیرے پتر کو راضی نہ رکھ سکی۔" شبو نے غصیلے انداز میں کہا۔ اس کے ہر لفظ سے حقارت اور نفرت جھلک رہی تھی۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ اس کے اندرونی خلفشار کا

غماز تھا۔

اس وقت وہ بہت ہی تیکھی مرچی جیسی ہو رہی تھی۔ اس کے لب و لہجے کی تلخی کے تو سب گواہ تھے اور جانتے تھے کہ وہ کس قدر غصیلی ہے مگر اب وہ ہاتھوں سے بھی نکلی جا رہی تھی۔

''تو ٹھیک کہہ رہی ہے مگر بات کرنے سے پہلے اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں کو دیکھ لیا کرو۔'' بیگم رب نواز نے اسے سختی سے تنبیہ کی اور پھر وہ منہ بسور کر ہاتھ چھڑا کر کچن کا رخ کر گئی۔ ناشتے کی تیاری مکمل ہوئی تو گھر میں دلفریب کھانے کی مہک پھیل گئی تھی۔ جب شبو نے ملازمہ کو بھیجا کہ جا کر بھاوج کو جگا دے اور کہے کہ ناشتے کی میز پر آ جائے۔

جب عائی کھانے کی میز پر آئی تو اس نے غیر معمولی خاموشی محسوس کی تھی۔ اس وقت شبو اور بیگم رب نواز دونوں ہی اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ شبو کی باتوں کا ہی اثر تھا کہ اس وقت بیگم چودھری رب نواز کا مزاج بھی قدرے برہم تھا۔

''یہ کس حلیے میں اٹھ کر ادھر آ گئی ہو۔ نہ کانوں میں بالیاں ہیں اور کنگن کہاں گئے؟'' چودھرائن کا مزاج بے حد خراب اور لہجہ بے حد سخت تھا۔

''چچی جان۔ وہ تو بس میں جلدی میں آ گئی۔'' عائی کو سخت گھبراہٹ آ گھیرا۔

''ناں تو کون سی جلدی تھی اور وقت دیکھا ہے تو نے یہ بہوؤں کے چال چلن نہیں ہوتے۔ دھی رانی تو وقت سے جاگا کر اور وقت سے سج سنور کر آیا کر۔ تیری سونی کلائیاں دیکھ کر پنڈ والے تو یہی سمجھیں گے ناں کہ ہم نے کبھی تیری فکر ہی نہیں کی۔ تجھے اتنا سونا چڑھایا ہے اور تو یوں منہ اٹھائے چلی آئی۔ ابھی کوئی پنڈ کی عورت آ بیٹھی تو کیا سمجھے گی۔ کیا تو یہ جتانا چاہتی ہے کہ تو یہاں خوش نہیں؟'' لہجہ سخت اور باز پرس کرتا ہوا تھا۔

''جی میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ بس آج بھول ہو گئی۔ میں ایسا کرتی ہوں کہ پہلے جا کر سب پہن آتی ہوں۔'' وہ روہانسی ہو کر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، جب ہی چودھرائن نے روک لیا۔

''چل اب رہن دے۔ پہلے کھا پی لے۔ کام کاج تو تیرے لیے ابھی نہیں ہیں۔ تو کم از کم اپنا حلیہ ہی اچھا رکھا کر۔ آج شام میں کسی وقت اہل آ جائے گا۔ خوب سج سنور کر رہ کہ اسے ادھر ادھر منہ مارنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔'' چودھرائن کی بات پر اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی، وہ تو پہلے سے ہی منہ ماری کر چکا تھا اور اس کی ماں یہاں بیٹھی نصیحت کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے دیسی گھی میں تر بتر پراٹھے کا لقمہ چبانے لگی۔ یہ بھی ایک رسم ہی تھی۔ ورنہ اس کی بھوک تو جانے کب کی مر گئی تھی۔

❁ ❁ ❁

''ابا یہ میری زندگی کا معاملہ ہے پھر تو نے ہی تو کہا تھا کہ میری بات بھی رکھی جائے گی۔ پہلے وہ گمنام تھی مگر اب گمنام نہیں ہے۔ وہ دولت خان کی وسیع و عریض جائیداد کی وارث ہے۔'' اہل خان جب سے واپس لوٹا تھا اس وقت سے باپ کے کمرے میں بیٹھا اپنی بات منوانے میں مصروف عمل تھا۔ چودھری رب نواز نے اس کی ساری رام کتھا سنی اور پھر ہنکارا ابھرا۔

''ہاں جانتا ہوں۔ دولت خان کے پاس تو بھرا جی سے بھی زیادہ دولت ہے مگر ہر بات کے لیے کچھ وقت چاہیے ہوتا ہے۔ اپنا الو تو سیدھا ہو گیا مگر اب ایک دم تیری شادی سے سارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا ہے تو پہلے عائی کو رخصت کر، سن ایک بات پھر بھی اپنے ذہن میں رکھ لے کہ وہ تیری بیوی ہے اور رہے گی۔ یہ سب بس دکھانا ہے کہ وہ تجھے خوش نہیں رکھ سکی اور تو مجبوراً دوسری شادی کر رہا ہے۔ سمجھ رہا ہے ناں تو؟'' چودھری رب نواز ایک لالچی انسان تھا۔ خود غرضی اور ہوس میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس کو تو پیسوں کی ایسی لت پڑ گئی تھی کہ اب جان نہ چھوٹتی تھی اور وہ جان گیا تھا کہ دولت خان کا بزنس کس قدر وسعت اختیار کر چکا ہے۔ اس کی زمینوں سے کہیں زیادہ اس ایک شخص کی دولت تھی۔ اس کو علم تھا کہ

اس کا ایک بیٹا گلفام اور ایک بیٹی سارا پہلے سے بھی تھیں مگر جائیداد کا بٹوارا کیا جاتا تب بھی اکیلی نگینہ کے حصے میں اتنا کچھ آسکتا تھا کہ وہ اکیلی یہاں کروڑوں کی جائیداد کی وارث بن سکتی تھی اور پھر یہی نہیں خود رب نواز بھی اپنی اکلوتی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ رب نواز نے اپنے بیٹے کی نگاہوں میں نگینہ کا عکس دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ آج نہیں تو کل وہ یہ کر گزرے گا۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ وہ مصالحت کی راہ چن لیتا۔ اپنے بیٹے کو ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر اس نے بہت ہی سمجھ داری سے پینترا بدلا اور دوسری طرف خود امل بھی باپ کی بات سن کر شبہ پا گیا تھا۔ اس نے کمرے میں آ کر گہرا سانس لیا پھر اس نے کمرے کا دروازہ اندر سے بھیڑا اگرچہ کنڈی نہیں لگائی تھی۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور پھر نگینہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا تیسری بیل پر ہی فون اٹھالیا گیا تھا۔

"اب کس لیے فون کیا ہے؟" نگینہ کا لہجہ اس کی آواز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ صاف محسوس کیا جاسکتا تھا کہ وہ بھی اندر ہی اندر امل کے لیے سلگ رہی ہے، جل رہی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی طرح سے اس کا اور امل کا جوڑ ہوجائے۔ یہ بے جوڑ شادی جوڑنے میں ڈھل جائے۔ لفظ انکاری مگر لہجہ گداز تھا۔

"کیا تم مجھے واقعی بھول گئی ہو؟ میری محبت نے تمہارے دل میں اپنا کوئی مقام نہیں بنایا۔ میں جو دن رات تمہارے ہجر میں باولا ہوا پھرتا ہوں تم اس محبت کی تپش کی ہلکی سی لو بھی محسوس نہیں کرسکتی؟" امل کا لہجہ شکست خوردہ ہوا۔ دوسری طرف مہیب خاموشی چھائی اور پھر نگینہ کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دی۔

"میں لڑکی ذات ہوں، کیا کرسکتی ہوں۔ اتنے برسوں کے بعد اپنی ماں کے چہرے پر میں نے آسودگی اور اطمینان جھلکتا دیکھا ہے۔ میرے ایک غلط قدم سے اس کے ماضی کے تمام ابواب پھر سے کھل جائیں گے۔ میری خود سری اور میری بغاوت کو امی کے ماضی سے منسلک کرکے ان کو بھی ساتھ ہی ساتھ رگڑا جائے گا۔ میں جانتی ہوں کہ ہم دونوں کے دلوں میں محبت کا دیپ جو جل اٹھا ہے اب بجھ نہیں سکتا مگر شاید اس میں وصل کے لمحات رقم نہیں ہیں۔ محض ہجر کی تشنگی ہے۔ میری ماں کا ماضی میری ذات کے ہی ساتھ جڑا ہوا ہے۔" وہ رو رہی تھی۔ امل کے دل کو کچھ ہوا۔ تاسف، درد اور گہر املال، وہ چاہتا بھی تو اپنی محبت کے چہرے پر آنسوؤں کی ان لکیروں کو مٹا نہیں سکتا تھا ہجر کے اس باب کو ملن کی خوش خبری کا بھرا پیالہ نہیں پلا سکتا تھا۔

نگینہ نے فون بند کردیا تھا۔ اسے علم ہی نہیں ہوسکا کہ دروازے پر اس کا احوال پوچھنے کے لیے آئے دولت خان اس کی ساری بات سن چکے ہیں اور پھر الٹے قدموں واپس بھی لوٹ گئے۔ وہ اگرچہ اپنے سارے بچوں سے ہی بہت محبت کرتے تھے مگر انہیں اس بات کا گہر املال تھا کہ نگینہ کا سارا بچپن ایک محرومی میں گزرا ہے۔ جب اس بچی کو باپ کی شفقت اور محبت کی سب سے زیادہ ضرورت تھی تو وہ اس محبت سے محروم رہی۔ اب اس کی ایک خوشی ایک چاہت تھی اور وہ اس کو بھی پوری کرنے سے انکاری ہیں مگر وہ بھی کیا کرتے۔ ان کو علم تھا کہ امل تو شاید مخلص ہے مگر اس کی پہلی شادی اور پھر اس کا دیہاتی رہن سہن، ان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہا تھا بہرحال اب کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ اپنے کمرے میں بند ہوکر اس وقت اس کے متعلق سوچتے خلا میں گھور رہے تھے۔

❁......❁......❁

"تم کیا دروازے سے لگی میری باتیں سنتی رہتی ہو۔ تمہیں پہلے دن ہی اپنی حد بتادی تھی پھر بھی سر پر چڑھتی چلی جارہی ہو۔" امل کا لہجہ خونخوار ہوا۔

دراصل عابی جیسے ہی کمرے میں داخل ہونے لگی تھی۔ اس کے منہ سے محبت بھرے الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ سارا ماجرا کیا ہے؟ اس لیے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس وقت کمرے میں جائے مگر باہر صحن سے گزرتی ہوئی شبو نے چونکہ اس کو دیکھ لیا تھا اور اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکان اسے مجبور کررہی تھی کہ وہ جو بھی

صورت حال سامنے آئے وہ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر کمرے میں داخل ہوئی اور ویسا ہی ہوا جیسا اس نے ذہن میں خاکہ بنایا تھا۔

"مجھے کیا ضرورت ہے آپ کی باتیں چھپ چھپ کر سننے کی جبکہ سب کچھ تو آپ خود ہی بتا چکے ہیں۔" اگرچہ اس نے سادہ لہجے میں کہا تھا مگر امل کو اس کا لہجہ سراسر طنزیہ لگا۔

"یہ تم کس انداز میں بات کر رہی ہو، بہت زبان چلنے لگی ہے تیری۔" امل کا مزاج پہلے ہی بہت خراب ہوا۔ اس پر عابی کی اس وقت آمد اس کا مزاج مزید خراب کر گیا تھا پھر اس کا ہاتھ اٹھتا ہی چلا گیا تھا۔ وہ کراہ کر رہ گئی، اس کا زوردار تھپڑ اس کے رخسار کو نیلگوں کر گیا تھا اور امل کا ہاتھ تھک کر ہی رکا تھا۔ اس کا سارا غبار نکل گیا تو وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔

❀......❀......❀

چودھری شاہنواز کا ذہن اگرچہ جاگیردارانہ تھا مگر برسوں بعد بھی وہ اس جاگیردرانہ نظام کو ذہن و دل سے قبول نہیں کر سکے تھے۔ ان کا خاندان مالی طور پر اس قدر مستحکم تھا کہ ان کو اور ان کی آنے والی نسلوں کو کسی بھی قسم کی ملازمت کی ضرورت نہ پڑتی۔ سکندر ان کا اکلوتا وارث تھا مگر اس کا دماغ شروع سے ہی پڑھائی لکھائی میں خوب لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس کی فرمائش پر ایک گھر شہر میں خرید کر دے دیا تھا اور وہ نہ صرف اپنی تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا بلکہ وہیں رہائش پذیر بھی تھا۔ ایک لحاظ سے دیکھا جاتا تو انہوں نے اپنی اولاد کی خواہش کو ترجیح دی تھی۔

اب جب سے انہوں نے عابی سے پوچھے بنا اس کا رشتہ ایک ایسے شخص سے جوڑا تھا جو اس کا طلب گار ہی نہ تھا شاید یہی بات وہ روز اول سے جانتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے کیونکہ امل اور اس کے ابا کو دولت کی چاہت تو تھی مگر ان کی بیٹی کی تمنا نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آئے دن ان کے کانوں میں اپنی بچی کی ناآسودگی کی داستان پڑھ رہی تھی۔ وہ سنی ان سنی کر دیتے۔ مگر ان کے اندر ایک گہرا ملال اور پچھتاوا سا در آیا تھا اور پھر یہ سیدھی راہ اور اصل سوچ اور سمجھ صرف بیٹوں کی مرتبہ بھی والدین کو آتی ہے۔ قربانیاں تو ازل سے صرف بیٹیاں ہی دیتی چلی آ رہی ہیں۔ ایسی ہی ایک قربانی عابی نے بھی دی تھی اور اب اس کی یہ قربانی رائیگاں نہیں گئی تھی۔ ان کو اب احساس ہو چلا تھا کہ زور زبردستی کیے گئے رشتے ناپائیدار ہوا کرتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی بچی وہاں صبر سے ساری زندگی کاٹ لے گی مگر اف نہ کہے گی۔ اب انہوں نے سکندر کے معاملے میں نرمی اختیار کرنے کی ٹھانی اور اگلے ہفتے ان لوگوں نے سوچا تھا کہ وہ عابی کو بلوا کر اس کو بھی شہر لے جائیں گے اور اس طرح سے سکندر کے لیے میرب کو دیکھنے جائیں گے۔ شاہنواز نے کہلوا بھیجا تھا کہ عابی گھر آ جائے۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" بیگم شاہنواز نے ملازمہ کو اشارہ کیا تو اس نے چائے کی ٹرے رکھی اور سر ہلا کر باہر نکل گئی۔

"سوچ رہا ہوں کہ عابی کے ساتھ ہم نے شاید اچھا نہیں کیا۔ لیکن میں نے جو کیا ایک باپ ہونے کے ناطے کیا۔ اس کے جوڑ کا رشتہ اور تھا بھی نہیں۔" چودھری شاہنواز نے ہموار لہجہ میں کہا۔

"اب بھی تو بیٹے کی مرتبہ برادری کو چھوڑ کر باہر دیکھ رہے ہیں پھر عابی کے لیے اردگرد کے چودھریوں کے بچوں کے رشتے بھی ٹھکراتے رہے تھے۔" بیگم شاہنواز نے دبی دبی آواز میں کہا۔

"ہاں تو سچ کہتی ہے سکندر کی ماں، مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا ہے۔" چودھری شاہنواز نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

"سنا ہے کہ امل اس پر ہاتھ بھی اٹھانے لگا ہے۔" دکھ ہی دکھ تھا ان کے لہجہ میں۔

"یہ کس سے سنا تم نے؟" چائے کا سپ بھرتے ہوئے چودھری شاہنواز نے پوچھا۔

"یہاں بھی کمینوں کی کمی نہیں ہے ہر طرف تو بات

پھیل جاتی ہے اور پھر وہ آئے گی تو خود اس سے پوچھ لیں۔‘‘ اس مرتبہ چودھرائن کا لہجہ بھی تیکھا ہو چلا تھا۔

’’کل مجھے چودھری رب نواز نے بلایا ہے آتے ہی عابی کو بھی ساتھ ہی لے آؤں گا پھر تسلی کر لینا۔ ہم نے بیٹی بیاہی ہے۔ بیچی نہیں ہے۔‘‘ اس مرتبہ غصہ چودھری کو بھی آ گیا تھا۔

’’اچھا پریشان نہ ہوں، آرام سے چائے پئیں، یہ دیکھیں ساتھ بسکٹ سموسے بھی ہیں۔‘‘ وہ نہ جانے کیوں ان کا دھیان بٹانا چاہ رہی تھیں۔

❁……❁……❁

’’تم نے یہ کیا نئی کہانی سوچی، یہ کیسے ممکن ہے، وٹہ سٹہ کیسے ہو سکتا ہے؟‘‘ چودھری رب نواز نے تحیر سے پوچھا۔

’’اجی کیوں نہیں ہو سکتا، ہم نے عام سی شکل وصورت والی لڑکی گھر بلالی اور پھر اب ہم اپنی بیٹی کا رشتہ سکندر سے کریں گے۔ سکندر ہر لحاظ سے شبو کے لیے بہتر ہے اور پھر آپ تو جانتے ہیں کہ شبو کس قدر ضدی ہے اس کا کہنا ہے کہ بات کی جائے۔‘‘ چودھرائن رب نواز نے دھیمے لہجہ میں کہا مگر لہجہ میں اصرار ہی اصرار پنہاں تھا۔

’’کہہ کر دیکھوں گا مگر دال گلتی دکھائی نہیں دیتی، تم یہ بھی تو دیکھو کہ وٹہ سٹہ رشتے خراب کرتا ہے۔ کل کو عابی نے جا کر کوئی شکایت کر دی تو تیری بیٹی کا بھی گھر اجڑے گا۔‘‘ وہ دور کی کوڑی لائے، بات میں دم تھا۔

’’جو کچھ بھی ہے۔ اب امل نے شادی تو کرنی ہی ہے اور وجہ بھی چاہیے اور پھر شبو کا بھی ارادہ ہے تو میں کیا گھن چکر بنی ہوئی ہوں۔ دیکھتے ہیں کیا نتیجہ نکلتا ہے اور پھر شبو کی فکر مت کریں۔ وہ عابی جیسی نہیں ہے۔ مرد کو قابو کرنا جانتی ہے۔‘‘ نجانے کیسے چودھرائن کے منہ سے سچ پھسل گیا تھا۔ ان کے الفاظ پر چودھری رب نواز نے سختی سے بیگم کو دیکھا۔

’’بڑی اچھی تربیت کی ہے واہ۔‘‘ غصہ دیدنی تھا۔

’’ارے گھر بسانا بھی سکھانا چاہیے، ورنہ اب اپنی بھاوج کو ہی لے لیں۔ کیسے عابی کی تربیت کی ہے۔ منہ جھاڑ پہاڑ امل کے سامنے بولتی ہے۔ سرخی پاؤڈر تک کا تو میں کہتی ہوں۔ وہ خاک اسے گھاس ڈالے گا۔‘‘ چودھرائن نے بھی دوبدو جواب دے کر اپنے تئیں دامن بچایا۔

’’تیری باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر وہ میرے بڑے بھائی بھاوج ہیں، کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں کہ وہ جانتے نہ ہوں کہ امل کے کیا چال چلن رہے ہیں۔‘‘ چودھرائن نے اپنی جگہ پہلو بدلا مگر بولی کچھ نہیں۔

’’اور پھر یہ تیری دھی رانی...... ابھی تو اپنے گھر میں اس کا یہ حال ہے۔ اگلے گھر جائے گی تو نجانے کیا کرے گی۔‘‘ چودھری رب نواز نے بھی آج کھری کھری سنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

’’آپ رہنے ہی دو، آپ کو تو بس اپنے بچوں میں ہی عیب دکھائی دیتے ہیں دوسروں میں تو خوبیوں کی لڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہی حوصلہ افزائی اپنے بچے کی ہوتی تو آج حالات اور طرح کے ہوتے۔‘‘ چودھرائن نے بھی اب پینترا بدلنا ضروری خیال کیا۔

’’خیر اب بات تو کرنی ہی پڑے گی۔‘‘ اگلے روز جب چودھری شاہنواز اپنی بیٹی عابی کو گھر لے جانے کے لیے پہنچے تب چودھری رب نواز نے ان کا پرتپاک استقبال کیا اور خوب آؤ بھگت کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بڑا بھائی اس کے معاملے میں کسی بھی قسم کی کوتاہی یا کمی کو محسوس کرے۔ وہ بڑے بھائی کو کسی طرح سے بھی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔

’’لیں بھراجی یہ لسی پئیں۔ یہ میری شبو نے بطور خاص اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے بنائی ہے۔‘‘ لسی کا پہلا گھونٹ بھرتے ہوئے شاہنواز کو کھانسی کا پھندا لگا جو وسوسے اس کے اور اس کی بیگم کے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ اب کھل کر سامنے آ رہے تھے۔

’’کیا ہو گیا؟ ٹھنڈ زیادہ تو نہیں ڈال دی۔‘‘ چودھری رب نواز اپنی گلابی اردو میں بول رہا تھا۔

’’ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔‘‘ چودھری

شاہنواز نے اپنا گلا کھنکھار کر وضاحت کرنا ضروری سمجھا۔
"اور پھر کیا حال احوال ہیں؟" وہ بڑے بھائی کے سامنے خوش دلی اور بشاشت کی انتہاؤں پر کھڑا ہوا چاہ رہے تھے۔
"بس وہی زمینوں کے وہی شولے، فی الحال تو بس عابی پتر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا تھا۔ اس کی اماں بھی اداس ہے اور پھر ایک خاص کام بھی ہے۔" چودھری شاہنواز رکے۔ جیسے سوچ میں ہو کہ آگے بولے کہ نہ بولے۔
"ہم نے بھی ضروری بات کے لیے آپ کو یہاں بلایا ہے بھائی صاحب۔ ہم اپنی شبو کے لیے بات کرنا چاہتے ہیں۔" شبو جو پاس ہی بھڑکیلے لباس میں ملبوس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت ماں نے آنکھوں کا اشارا کیا کہ وہ اٹھ کر فوری طور پر چلی جائے۔ شبو بھی اشارہ ملتے ہی شرماتے لجاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔
"ہاں کہو کیا بات کرنی ہے۔ کہیں کوئی رشتہ وشتہ تو نہیں طے کر دیا۔" چودھری شاہنواز نے گویا اپنے کندھوں سے بوجھ اتارنے کی کوشش کی۔
"لو جی...... اپنے سکندر کے ہوتے ہم کہیں اور کیوں شبو کا رشتہ کرنے لگے۔" چودھری رب نواز سے پہلے چودھرائن نے لب کشائی کی اور چودھری شاہنواز ہکابکا بیٹھے اپنی بھاوج کا منہ تکتے رہ گئے۔
"سکندر اور شبو......! مگر......" وہ تحیر زدہ ہوئے۔
"کیوں اس میں کیا عیب ہے۔ ہماری بچی ہزاروں میں ایک ہے۔"
"آپ کی بات درست ہے مگر آپ جانتے ہیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہ بچوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔ سکندر خود مختار ہے، پڑھا لکھا باشعور ہے، ہم اس پر اپنی مرضی مسلط نہیں کر سکتے۔" چودھری شاہنواز نے کہا۔
"لو جی کر لو گل۔ بیٹی کی مرتبہ تو آپ کے اصول اصول نہ تھے۔ اب نئے اصول سامنے آ رہے ہیں۔"
"جی مگر وہ بھی کر کے ہم پچھتا ہی رہے ہیں۔"
نجانے کیسے ان کی زبان سے پھسل گیا اور پھر بعد میں ان کو ہوش آیا کہ وہ کہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب سنتے اچانک ہی عابی کی تیز تیز چیخوں سے پورا گھر گونج اٹھا تھا۔
زنان خانے میں ہی بیٹھے چودھری شاہنواز نے تعجب سے دیکھا تھا چودھرائن کا بھی رنگ اچانک فق ہو گیا تھا۔ سلسلہ زرد وکوب تو کئی دنوں سے جاری تھا لیکن آج تو انہوں نے بطور خاص خود امل کو کہا تھا کہ تم نے بہو پر ہاتھ نہیں اٹھانا مگر اچانک عابی کی دل دوز چیخیں سن کر ان سب کے ساتھ ساتھ چودھری شاہنواز کا بھی ماتھا ٹھنکا اور وہ غصے سے آگ بگولا ہو کر باہر سیدھے عابی اور امل کے کمرے کی طرف بڑھے۔ ان کے پیچھے پیچھے چودھری رب نواز اور ان کی بیگم بھی تھیں۔ جو چودھری شاہنواز کو آوازیں دے رہے تھے۔ گویا اس معاملے سے دور رہنے کا کہہ رہے تھے۔
"تم...... ذلیل عورت، سمجھتی کیا ہو خود کو۔ جس دن سے میری زندگی میں آئی ہو میری زندگی جہنم بنا دی ہے۔" امل کا ہاتھ کے ساتھ ساتھ زبان کے وار سے عمل جاری تھا۔
"میرے آگے بولتی ہے، تیری زبان بہت چلنے لگی ہے۔" اس وقت تھپڑ کی گونج باہر تک سنائی دی اور عابی کے سسکنے کی آواز بھی۔
شاہنواز عالم نے طیش میں آ کر دروازے کو دھکا دیا اور سامنے کا منظر کھل کر واضح ہو گیا تھا۔ عابی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی جب کہ امل اس کے سر پر کھڑا اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی دونوں نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا، امل کا اٹھا ہاتھ خلا میں ہی رہ گیا اور اپنے باپ کو اس طرح اچانک سامنے دیکھ کر عابی سسک کر آگے بڑھی اور شاہنواز کے سینے سے لپٹ گئی۔ اس کی ایک آنکھ کے گرد نیل پڑ گیا تھا اور اس کا ایک ہونٹ کا کنارہ لہو رنگ تھا۔
"آہ......!" درد نہاں ہی نہاں تھا۔ شاہنواز نے پلٹ

کر چودھری رب نواز کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا۔
"تم کس منہ سے اپنی بیٹی کا رشتہ مجھے دینا چاہتے ہو جبکہ دوسرے کی بیٹی کے ساتھ تمہارا یہ سلوک ہے اور امل تم نے یہ اچھا نہیں کیا ہے۔ تم نے میری پھول جیسی بچی پر ہاتھ اٹھا کر اپنے بیچ ہونے کا ثبوت دے دیا۔ کیا کچھ نہیں کیا میں نے اس رشتے کے لیے، اپنی سیکڑوں ایکڑ مربع زمینیں تمہارے نام کردی مگر تم نے اپنی ذلالت دکھا ہی دی۔" شاہنواز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ امل کو آگ لگادے۔

امل بھی ہق دق کھڑا تھا۔ جبکہ بیگم رب نواز کو بھی اس وقت اپنے لاڈلے سپوت پر انتہا کا غصہ تھا۔ نہ وہ یہ حرکت کرتا اور نہ ہی معاملات اتنے خراب ہوتے۔
"میری بیٹی مجھ پر بھاری نہیں ہے کہ اسے یہاں بٹھنے کے لیے بٹھائے رکھوں، اب یہ واپسی تب ہی آئے گی جب تم اپنا ناک رگڑنے آؤ گے۔" چودھری شاہنواز نے غصیلے انداز میں کہا۔
"یہ آپ کی بھول ہے کہ میں آؤں گا۔ وہ بھی اس کے لیے۔ میں نے پہلے ہی بابا سے کہا تھا کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں اور شادی بھی اسی سے کروں گا مگر بابا کی ضد تھی کہ بھائی کی عزت کا سوال ہے۔ مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے اس کو یہاں رکھنے کا۔" امل یہ کہہ کر رکا نہیں دروازے کو ٹھوکر مارتا گھر سے ہی نکل گیا۔ اس کی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ شاہنواز کو چودھری رب نواز نے کندھے سے تھاما مگر چودھری شاہنواز نے اپنا دایاں ہاتھ کھڑا کردیا۔
"بس اب کوئی اور لومڑی کی چال نہ چلنا، میں جانتا ہوں تو کوئی غیر نہیں میرا اپنا ہی خون ہو مگر افسوس کہ یہ رنگ ڈھنگ نہ تھے گھر میں کسی کے۔" اس کے بعد کچھ بھی کہنا سننا بے کار تھا۔
"جا پتر اپنی چادر لے آ، اس کے سوا کچھ مت لے کر آنا، ہم اونچی شان والے ہیں اپنی دھی رانی کو ہر شے لے کر دیں گے۔ تجھے یہاں سے کچھ بھی لے جانے کی ضرورت نہیں۔" یہ الفاظ سن کر عابی جیسے سکتے سے باہر نکلی، اس نے تیر کی طرح اندر کمرے میں قدم رکھا تھا۔ اپنی چادر اٹھائی اور ایک ادھوری نگاہ اس کمرے پر ڈالی جہاں اس کے لیے گھٹن کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

وہ اتنے دنوں سے اس کی مار کھا رہی تھی مگر اف تک نہ کرتی تھی۔ اس کا صبر تھا۔ اس کا حوصلہ تھا اور کمال کا تھا۔ اس نے تو اتنے صبر کا مظاہرہ کیا کہ ہر فون کال پر اپنی ماں اور باپ کو بھی یہی کہا کہ وہ خوش ہے یہاں پھر چودھری شاہنواز کے ساتھ وہ فرنٹ سیٹ پر چپ چاپ خلا میں دیکھتی واپسی کے سفر پر گامزن تھی۔ چار ماہ اور بیس دن تک کا ہی اس کا زندگی کا سفر تھا جو شاید اب اختتام پذیر تھا مگر اس نے ایک مدت اذیت سہی تھی۔

❁......❁......❁

پورے گوٹھ میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ امل کی دلہن روٹھ کر اپنے گھر چلی گئی ہے اور خود عابی جب سے گھر واپس آئی تھی بہت ہی چپ اور خاموش تھی۔ اپنے آپ کو کمرے تک محدود کرلیا تھا۔ جو وہ سوچے بیٹھے تھے کہ عابی کو شہر لے جائیں گے۔ مگر اس کا نیلوں نیل وجود دیکھ کر سب نے اس معاملے کو ملتوی کردیا تھا۔ ان کی بچی اتنی ٹوٹی بکھری تھی کہ گھر میں افسردگی سی گھلی ہوئی تھی۔

اداسی کے پل ہوں
یا خوشیوں کے پل
دید کے یا پھر محبتوں کے پل ہوں
مگر یاد رکھنا اے میری ہم نفس
گھلی ان میں کڑواہٹوں کے نہ پل ہوں
نہ حسرتیں شمار ہوں
کاش مٹھی میں بند میرے تمام پل
یوں وہ جذبے جو تم پر نچھاور ہوں
سارے نچھاور میری انسیت کے تمام پل ہوں

بخشو کی ماں عابی کے پاس آئی تھی۔ اس کا حال احوال پوچھنے کی نیت سے۔
"ارے اس کا کیا پوچھتی ہو مرجھا گئی ہے میری بچی۔" بیگم شاہنواز نے بخشو کی ماں سمیرا سے کہا۔ عابی چت لیٹی

چھت کو گھور رہی تھی۔ اماں کے ساتھ سمیرا کو دیکھ کر وہ دوپٹا کندھے پر پھیلاتی اٹھ بیٹھی۔

اس کو دیکھ کر سمیرا کے دل پر گھونسے پڑے، کس قدر زردی مائل رنگت ہو رہی تھی۔ اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ سمیرا نے دیکھا کہ عابی نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب کھولے تھے مگر ان لبوں نے کچھ بھی ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی آنکھ جھلملا سی گئی تھی۔ آنسو بہنے لگے اور پھر وہ اور سمیرا تڑپ کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئی تھیں۔ وہ جو ایک ڈھڑکا سا تھا کہیں چودھرائن کے دل میں، آج وہ ثابت بھی ہو گیا تھا۔ گویا سمیرا اور عابی کے تعلق کا مرکز بخشو ہی تھا۔ بخشو کی آنکھوں کی جوت اس سے چھپی ہوئی نہ تھی۔

"میری بچی، میں تیرے لیے کچھ نہ کر سکی۔ مجھے معاف کر دینا۔" سمیرا اور بخشو کی ماں رو رہی تھی۔ چودھرائن چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

اتنے دنوں کی جامع چپ اگر سمیرا کے آنے سے ٹوٹی تھی تو اچھا ہی ہوا تھا اور اب ایک ماں ہونے کے ناطے انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ذات برادری سے اوپر بھی خلوص اور ممتا کا رشتہ ہوا کرتا ہے وہ اپنے کمرے میں آ بیٹھی تھیں چاہتی تھیں کہ سمیرا اور عابی کھل کر باتیں کر سکیں۔

"کیا بات ہے اتنی چپ کیوں ہو؟" چودھری شاہنواز نے پوچھا۔

"اگر میں کچھ کہوں تو آپ پہلے وعدہ کریں کہ غصہ نہیں کریں گے۔" بیگم شاہنواز نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

"کیا کہنا چاہتی ہو کھل کر کہو۔" چودھری شاہنواز نے حیرت سے پوچھا۔ تب چودھرائن نے چپ چاپ اٹھ کر الماری کھولی اور اس میں سے ایک سادے سے لفافے کو شاہ پران کی طرف بڑھا دیا۔

چودھری شاہنواز نے خاموشی سے اس لفافے کو تھاما، کھولا اور اس کے بعد وہ لب بستہ سے رہ گئے، ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔

"یہ سب کرنے سے پہلے مصالحت کی ایک کوشش بھی نہیں کی اس شخص نے۔ آج سے وہ میرے لیے مر گیا ہے۔" طلاق نامہ ان کے ہاتھوں میں تھا اور ان کے ہاتھوں کی لرزش نمایاں تھی۔

"اب اگر اجازت دیں تو میں کچھ عرض کروں؟" ان کا لہجہ اتنا عجیب اور پراسرار تھا کہ وہ چونکے۔

"یہ طلاق نامہ آئے پندرہ روز ہو گئے ہیں اور تم مجھے اب دکھا رہی ہو۔" ان کے لہجے میں غصہ کے ساتھ دکھ بھی شامل ہوا۔

"تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا آپ عابی کی حالت نہیں دیکھ رہے، اس نے جب سے یہ طلاق نامہ دیکھا ہے بستر سے لگ گئی ہے۔ میری ہمت نہ تھی کہ آپ سے کچھ کہتی کہ آپ غصے میں ایسا ویسا کچھ قدم اٹھا لیتے۔ دوسری وجہ سکندر کی تھی۔ وہ شہر جاتا تو میں پیچھے سے آپ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ جانتے ہیں ناں، جوان بھائی کا غصہ کیسا ہوتا ہے۔ اب اپنی ہی مثال لے لیں۔" آخری جملہ نادانستگی میں ان کی زبان سے پھسلا جس پر چودھری شاہنواز نے جزبز ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"یہ طلاق نامہ تو محض ایک کاغذ کا پرزہ ہے۔ سچ تو یہی ہے کہ اس شخص نے میری بچی کو کبھی دل سے قبول ہی نہیں کیا۔ اسے بس ضرورتاً سمجھا اور اس ضرورت کو پورا کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولیں۔

"میں کوئی چٹی ان پڑھ گنوار نہ تھی۔ بارہ جماعتیں پڑھ کر بیاہی تھی اور آپ نے بھی مان دیا اور آج اس مان کا ایک فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں یا سچ پوچھیں تو بروقت ایک اچھا فیصلہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم کھل کر کہو، کیوں پہلیاں بجھوا رہی ہو؟" شاہنواز نے الجھن آمیز لہجہ میں کہا۔

"بس اتنا سمجھ لیں کہ یہ عدت گزرنے کے بعد میں نے جو رشتہ اپنی عابی کے لیے سوچا ہے وہیں اس کی شادی ہوگی۔" چودھرائن کا لہجہ پراسرار اور دبے دبے جوش میں ڈوبا ہوا تھا۔

”کون سا رشتہ، تم نے مجھ سے اتنا کچھ چھپا رکھا ہے؟“ وہ حسرت سے بولے۔

”جی ابھی بات دوسرے فریق سے کھل کر نہیں ہوئی مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ لوگ میری عابی کو ہاتھوں کا چھالہ بنا کر رکھیں گے اور آپ کو یہ حق ایک ماں ہونے کے ناطے مجھے دینا بھی ہوگا کہ میں اپنی بچی کی خوشیوں کا سودا چاہتی ہوں۔“ چودھرائن کا انداز تلخی سا تھا۔ چودھری شاہنواز نے گہری سانس لی۔

”سارے اختیار تمہیں سونپتا ہوں عابی کے حوالے سے بھی اور سکندر کے حوالے سے بھی۔“ ان کا شکست خوردہ لہجہ پسپائی لیے ہوئے تھا، بیگم چودھری شاہنواز کا چہرہ خوشی اور فتح کے جذبات سے ٹمٹما اٹھا تھا۔ مامتا بھرے خاص جذبات ان کے چہرے سے عیاں تھے۔

❁……❁……❁

”یہ لیں گرما گرم چائے اور آج کا ڈنر میں نے بہت ہی خاص الخاص آپ کے لیے آپ کی پسند کا بنایا ہے۔“ میرب نے چائے کا مگ میز پر رکھا۔ عثمان صاحب نے مسکرا کر بیٹی کو دیکھا۔

”اس نوازش کی کوئی خاص وجہ؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”دس از ناٹ فیئر بابا جانی۔ آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے پہلے میں آپ کا خیال ہی نہیں رکھتی تھی۔“ وہ خفگی سے بولی۔ اس وقت کال بیل بجی اور عثمان صاحب کا جملہ ان کے لبوں میں ہی رہ گیا۔

”میں دیکھتی ہوں آپ چائے پئیں۔“ وہ اٹھ کر لاؤنج تک آئی کہ سامنے سے آتے ہوئے گلفام کو دیکھ کر اس نے گہری سانس لی۔

نہ جانے کیوں یہ بہت دنوں سے چل رہا تھا کہ گلفام خان دن میں دو دو بار ادھر کے چکر لگانے لگا تھا۔ یہ تو ٹھیک تھا کہ اس کی دوستی عثمان صاحب سے ہوگئی تھی۔ سیاست، مذاہب، عمرانیات اور کلچر پر وہ لوگ گھنٹوں بلا تکان بولتے تھے۔ خوب سیر حاصل بحث چھڑ جاتی تھی مگر یہ حیرت کا سبب تھا کہ دن میں دو دو بار گلفام کی آمد عثمان صاحب کو تازہ دم کردیا کرتی تھی مگر اصل الجھن تو اسے گلفام کی ان نگاہوں سے ہوتی تھی پہلے پہل تو نگاہوں سے اس کو اپنی محبت کا خاموش پیغام پہنچایا کرتا تھا اور اب لفظوں میں بھی اس صورت حال میں تبادلہ ہونے لگا تھا۔ ابھی کل ہی کی بات تھی جب گلفام اور عثمان صاحب باہر لان میں بیٹھے گفت وشنید میں مصروف تھے کہ وہ ان دونوں کے لیے پکوڑے اور چائے لے کر آئی تھی اور اس کو لان کے پرنٹڈ سوٹ میں دیکھ کر گلفام کھل اٹھا تھا۔ بابا ہاتھ دھونے کی نیت سے اٹھے، جب اس کو چائے میں چینی ملاتے دیکھ کر گلفام مسکرا کر بولا۔

”اس آنگن میں سرخ گلابوں میں سب سے حسین گلاب آپ ہیں۔“ اس کا ہاتھ جو پیالی گلفام کو تھما رہا تھا لرزا۔ کچھ پیالی میں چائے بھی چھلک پڑی تھی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا تھا۔

”یہ کیا گلاب کے رنگ پھیکے کیوں پڑ گئے۔ لڑکیوں کو تو اپنی تعریف بہت اچھی لگتی۔“ گلفام نے گہری نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر کے کہا۔

”لیکن میں ان لڑکیوں میں شامل نہیں ہوں، ویسے کتنی لڑکیوں کا تجربہ ہے آپ کو؟“ اس نے کچھ تلخی سے پوچھا مگر گلفام اس کے لہجے کو نظر انداز کر کے ہنس دیا۔

”آپ جیلس ہو رہی ہیں؟“ وہ ہنسا۔ گویا خوب حظ اٹھا رہا ہو۔ وہ ہونق چہرہ لیے رہ گئی۔

”مسٹر آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔“ اس نے تصیح ضروری سمجھی مگر اس وقت عثمان صاحب کے آجانے سے باتوں کا سلسلہ بیچ میں ہی رک گیا ورنہ اس کا پختہ ارادہ تھا کہ وہ ضرور اس لڑکے کی غلط فہمی دور کروا کے رہے گی۔ اب اسے یوں مسکراتا آتا دیکھ کر اس کا مزاج قدرے برہم ہوا تھا۔

”واہ اس وقت میں کچھ اور بھی مانگ لیتا تو مل جاتا مگر آپ کی دید تو کیا کم ہے ہر نعمت سے۔“ گلفام نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھ کر کھل کر کہا، اس کی شگفتگی میں گھلا ہوا لہجہ

اس کو آگ لگا گیا تھا۔
"کس کام سے آئے تھے؟" وہ غصہ ہونے لگی۔ اس کا انداز دیکھ کر گلفام بھی لمحہ بھر کے لیے بالکل چپ کرا گیا۔ اسی وقت عثمان صاحب آ گئے تھے۔
"ارے برخوردار تشریف لائے ہیں، کہاں رہے، سارا دن بہت مس کیا تمہیں۔" عثمان صاحب نے خوش دلی سے کہا۔
"مگر آپ کی بیٹی تو ہمیں یہیں سے ٹرخانے پر آمادہ تھیں کہ کام بتایا نہیں اور چلتے بنے۔" گلفام نے شکایتی لہجہ میں کہا۔
"کیا واقعی ایسا ہے۔ میرب یہ تو بہت ہی بری بات ہے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔" عثمانی صاحب نے واقعی برا منایا۔
"سوری ڈیڈ میں نے ایسا کچھ بھی نہیں کہا دراصل ان کو ہی شدید قسم کی غلط فہمی ہو رہی ہے۔" میرب نے بھی وضاحتی لہجہ اپنایا۔
"انکل جسٹ جوکنگ، میں بھی آج جلدی میں ہوں، اس جمعہ کو ہی ہمارے گھر میں تقریب ہے۔ آپ کو بتایا تھا ناں؟ نگینہ آپی کے متعلق ان کا نکاح ہے۔ آپ پلیز ضرور آیئے گا۔ یوں تو آپ کبھی آتے ہی نہیں۔" گلفام نے مٹھائی کا ڈبا تھمایا، میرب نے چارو ناچار وہ تھام لیا، گلفام یہ کہہ کر رکا نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد عثمانی صاحب نے میرب کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔
"یہ کیا حرکت تھی میرب؟" عثمان صاحب نے سرزنش کرتے ہوئے میرب سے پوچھا۔
"بابا...... پتا نہیں کیوں، وہ حد سے زیادہ فری ہوتا جا رہا ہے اور مجھے فری ہونے والے لوگ پسند نہیں۔" اس کا لہجہ اچانک ہی تیز ہو گیا تھا۔ عثمان صاحب نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنی ناک پر چشمہ جماتے ہوئے بولے۔
"لیکن سکندر کے ساتھ تو بہت ہی ہنس ہنس کر بات چیت کرتی ہو؟" ان کا انداز سراسر جتانے والا تھا۔ وہ لاجواب ہو کر ٹکر ٹکر ان کا چہرہ دیکھتی رہی، سکندر کے ذکر پر اس کے چہرے پر محبت کے پھول کھل گئے تھے۔
"ڈیڈ آپ بھی ناں...... سکندر تو پھر سکندر ہے ناں۔" اس کا لہجہ شرمگیں اور محبت سے اس قدر پر تھا کہ وہ نظر بھر کر بھی اپنی بیٹی کو نہ دیکھ پائے۔ جوان کے سامنے سکندر کے ذکر پر ہی اتنی چھوئی موئی سی ہو رہی تھی۔ ان کے دل سے اپنی میرب کے لیے اس کی خوشیوں کے دائمی اور آسودگی کے لیے دعا نکلی۔
"اچھا جی یہ تو ہم جانتے ہیں کہ ہماری گڑیا کو سکندر بہت بھاتا ہے۔" وہ ہنس دیے۔
"مگر ڈیڈ...... گلفام کے والد کچھ عجیب سے ہیں، سرد مہری لیے رہتے ہیں اور پھر ان کی مام تو کھڑے کھڑے ہی سلام کر کے چلتی بنیں پھر ایک مام کیا کم تھیں۔ ایک اور مام آ گئی ہیں وہ بھی راتوں رات اور پھر وہ نگینہ......" اچانک ہی عثمان صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوکا۔
"بہت بری بات ہے میرب بیٹا۔ وہ ہم سے اتنے خلوص سے ملتا ہے اور مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی کہ تم ان کے اہل خانہ کی برائیاں کر رہی ہو اور رہی بات دولت صاحب کی دوسری بیگم کی تو یہ تو سراسر ان کا نجی معاملہ ہے۔ اگر وہ لوگ خوش ہیں ایک گھر میں، آسودہ حال جی رہے ہیں تو تم کیوں اتنا خار کھانے لگی ہو۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔" عثمان صاحب نے ناصحانہ انداز اپنایا، وہ جی بھر کے شرمندہ ہوئی۔ بات تو ان کی بالکل درست تھی اور وہ واقعی گلفام کے قریب ہونے کا بدلہ سارے گھر والوں میں عیب زنی کر کے پورا کرنے پر تلی تھی اور اب اسے بھی احساس ندامت نے گھیر لیا تھا۔
"بیٹا...... ہم لوگ ضرور نکاح میں شرکت کے لیے جائیں گے۔ دو قدم پر تو گھر ہے۔ تم تیاری رکھنا اوکے۔" اچانک ہی عثمان صاحب نے اس کو شرمندہ دیکھ کر خوب صورتی سے موضوع ہی بدل دیا اور وہ بھی سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

❁......❁......❁......❁

''پہلے کیا کم خرچے ہورہے ہیں۔ اب یہ نئی ناگہانی افتاد آ گئی ہے۔ اب اس کی رخصتی ہوگی۔ لو جی طوائف کی بیٹی کی بھی رخصتی ہوتی ہے۔ وہ بھی آن بان شان سے۔''
سیارا کا مزاج بے حد خراب تھا اور وہ اونچا اونچا بول رہی تھی۔ اس کا مقصد ہی ماں کو سنانا تھا اور یہی نہیں باہر لاؤنج تک جاتی آوازیں زرینہ اور نگینہ باآسانی سن سکتی تھیں۔ دولت خان اس وقت گھر میں نہ تھے۔

دو دن بعد نکاح کی تقریب تھی اور اس کے لیے دولت خان اپنا پیسہ تو پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ نگینہ کی حق تلفی جو جانے انجانے میں ان سے سرزد ہوگئی تھی۔ اس کی تلافی کے لیے اب وہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چند دن پہلے جب چودھری امل خان نے ان کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کو طلاق دے چکا ہے اور اب ان کی بیٹی کو اپنانا چاہتا ہے اور کسی خفیہ طریقے سے نہیں بلکہ پوری آن بان سے اور سب کے سامنے ہی بیاہ کر لے جانے کے لیے آئے گا۔ اس بات کے بعد دولت خان کے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں رہا تھا پھر ابھی وہ تذبذب میں ہی تھے کہ چودھری رب نواز اور بیگم رب نواز نے باقاعدہ طور پر ان کے دولت کدے پر حاضری دی تھی اور شادی کے لیے تقاضا کیا تھا۔ دولت خان جانتے تھے کہ ان کی بیٹی کی رضا بھی امل کے ساتھ ہی منسلک ہے اس لیے انہوں نے بلا تامل ہاں کردی تھی اور پھر انہوں نے ایک خطیر رقم بطور سلامی امل کو دینے کا وعدہ کیا تھا اور ایک خاصی معقول رقم امل کو شاپنگ کے لیے دی تھی کہ وہ جیسے چاہے شادی کے لیے خرچ کرے۔

ان کا کہنا تھا کہ جہاں امل رہے ان کی بیٹی بھی ان کے ساتھ ہی رہے مگر یہ بھی دولت خان کی اپنی بیٹی نگینہ سے محبت کی شدت تھی کہ انہوں نے ایک خوب صورت اور وسیع و عریض بنگلہ نگینہ کے نام کردیا تھا۔ وہ چاہتی تو یہاں شہر میں رہائش پذیر رہتی اور چاہتی تو امل کے ساتھ گاؤں میں جا کر رہتی۔ جب سارا خان کو اس بنگلے کا علم ہوا تو اس نے خوب واویلا مچایا تھا۔ اس کا غصے سے برا حال تھا اور یہی نہیں جب سونے اور ڈائمنڈ کے زیورات کے ڈبے گھر آئے تو اسی دن سے اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ دولت خان کی نوازشات بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔ برسوں پہلے کی ماضی کی راکھ میں دبی ہوئی محبت سر چڑھ کر بولنے لگی تھی اور اس محبت کی بدولت ہی وہ اتنا کچھ کررہے تھے۔

''بہو کچھ تو عقل سے کام لو۔ برسوں پہلے تم نے دو لوگوں کو جدا کرنا چاہا مگر دیکھ لو، اسے مکافات عمل کہتے ہیں۔ ایک بچی نے والد سے دوری سہی اور اتنے عرصے تک وہ بدنامی میں جلتی رہی مگر اب جا کے جب وہ اپنے باپ کے زیر سایہ آئی ہے تو پھر تم کیوں دوبارہ اس سب میں ولن کا کردار ادا کررہی ہو؟'' بی بی جی کے یہ فرمودات تو کیا ہی سارا بیگم پر اثر انداز ہوتے مگر غصے میں وہ مزید تلملا کر رہ گئی۔

''آپ نے کبھی مجھے بہو کا درجہ دیا ہی نہیں ورنہ آج میری طرف داری کرتیں اور آج آپ اس دو ٹکے کی عورت کو مجھ پر ترجیح دے رہی ہیں وہ جو بازاری ہے اور نامعلوم کہ وہ بچی بھی دولت کی ہے یا نہیں یا کسی اور کے ساتھ منہ کالا کر کے......''

''بس......'' اچانک ہی دولت خان کی کرخت آواز سنائی دی، اگرچہ سارا خان بھی ایک دم دار عورت تھی مگر شوہر کی گرج کے سامنے وہ وقتی طور پر ڈر ضرور گئی تھی۔

''ایک لفظ بھی مزید منہ سے نہ نکالنا میں تمہیں اپنے پورے ہوش و حواس میں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں۔'' سارا خان یک ٹک حیرت سے اپنے مجازی خدا کو خونخوار نگاہوں سے طلاق کی ادائیگی کرتے دیکھتی رہیں۔

''اب تم جاسکتی ہو۔ ابھی اس گھر سے دفعان ہوجاؤ اور برسوں سے جو میرے بچے کی خدمت میری ماں کررہی ہے۔ اب تم اس سے بھی آزاد ہو اور میرے دل میں تمہارے لیے کل بھی نفرت تھی اور آج جبکہ تم نے اپنی ہر حد پار کرلی ہے۔ آج بھی تم سے شدید نفرت ہے۔''

دولت خان نے گلفام خان کی طرف دیکھا جو دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ہوا اپنی ماں کا متغیر چہرہ دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ماں تو بی جان تھیں۔ جنہوں نے شفقت سے پالا پوسا تھا۔ یہ تو ماں ہو کر بھی کوسوں دور فاصلوں پر رہی تھیں اور پھر سارا نے ہمیشہ کی طرح اپنی اکڑ اور نام نہاد انا کو بلند رکھا۔ وہ چپ چاپ گھر سے نکل گئیں، اس پر اس گھر کے ہی نہیں دولت خان کے دل کے دروازے بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے تھے۔

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ جو بھی تھا وہ آپ کے بیٹے کی ماں تھیں۔ اس گھر کی عزت تھیں۔ مجھ کم ذات کے لیے آپ نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔" رات کو جب دولت خان نے محبت سے زرینہ کے ہاتھ تھامے تو زرینہ نے تاسف سے کہا، آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسو ان کے درد کا درماں نہ تھے۔

"کم ذات وہ تھی۔ جو بہتان باندھ رہی تھی۔ تم ان سب باتوں میں مت الجھو، بس خوش رہو اور کل کا دن میری بچی کے لیے بہت ہی خاص دن ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کل مہندی کی رسم ہو اور پھر اس کے بعد تو وہ رخصت ہوجائے گی۔" دولت خان کے لب ولہجہ میں ایک باپ کی شفقت عود کر آئی تھی۔

"آپ بہت اچھے ہیں۔" زرینہ نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا اور دولت خان نے اپنے رگ و پے میں ایک عجیب سی طمانت اور محبت ہلکولے لیتی ہوئی محسوس کی تھی۔

گھر کو خوب صورتی سے گلاب اور گیندے کے پھولوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ برقی قمقمے چہار سو دیدہ سجاوٹ کا حصہ تھے۔ مہمانوں کی آمد کا اور استقبال کا انتظام کیا گیا تھا۔ گھر میں خوب رونق تھی۔ دولت خان نے اپنے تمام قریبی عزیز واقارب کو مدعو کیا تھا۔ وہ لوگ جو واقعی ان کی خوشی میں خوش ہو سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے حلقہ احباب میں موجود سب افراد کو مدعو نہیں کیا تھا۔ وہ ایک وسیع وعریض جائیداد رکھتے تھے۔ بے حد وسیع کاروبار تھا اور ہزاروں افراد سے واسطہ اور سلسلہ تھا۔ مگر ان سب سے دعا سلام کی حد تک ہی تعلق تھا۔ انہوں نے اپنے بے حد قریبی چند دوستوں کو بمع فیملی بلایا تھا۔ جو انکے ساتھ مخلص تھے تصنع اور ریا کاری سے مبرا۔

نگینہ کی خوشی دیدنی تھی۔ اسے گھر میں ہی آ کر پارلر کی ایک لڑکی نے تیار کیا تھا اور وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس پر دلہن بن کر خوب روپ آیا تھا کچھ اپنے محبوب سے ملنے کی بھی خوشی تھی اور یہ سب اتنے احسن طریقے سے انجام پذیر ہوا تھا کہ اس نے یہ سوچا ہی نہ تھا۔

"بیٹا ماشاءاللہ بے حد پیاری لگ رہی ہو مگر میری چند باتوں کو گرہ سے باندھ لو۔" زرینہ نے پارلر والی لڑکی کو اشارہ کیا تو وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔ سرخ آتشی لباس میں ملبوس نگینہ گہرے میک اپ میں بھولی بھالی سی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا وہ معصوم دل تھا۔ جو زمانے کی چال کو سمجھنے سے قاصر تھا وہ بے حد معصوم تھی۔

"جی۔" وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

"بیٹا تو جانتی ہے کہ ہمارا ناطہ کس جگہ سے رہا ہے۔ تو بے عیب ہے۔ بے داغ ہے اور کھوٹ تو مجھ میں بھی نہیں تھا مگر بس تقدیر کا پھیر سمجھ لے اور پھر تو جانتی ہے کہ تیرے ابا نے کیسے مجھے مان دیا، نام دیا، نکاح کیا۔ اب تو اگلے گھر جارہی ہے تو نے اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ تیرے اٹھائے ہوئے ایک غلط قدم سے مجھ پر ہی نہیں تیرے ابا کے خون پر بھی سوال اٹھیں گے۔ تو نے دیکھا تیرے باپ نے تیرے بیاہ کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہایا ہے۔ تیرے لیے ہر جتن کررہے ہیں تو بھی اب ان کا مان رکھنا اور اپنے گھر میں سکھی رہنا۔" زرینہ کا دل وہموں اور وسوسوں کی آماجگاہ بن گیا۔ نگینہ نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"میں سب سمجھتی ہوں، میرے باپ نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے۔" پھر مبارک سلامت میں امل اور نگینہ کا نکاح ہوگیا، امل نے

بڑے طریقے سے اپنے اہل خانہ کو سوائے اپنے باپ کے کہ اس سے تو کچھ بھی چھپنا مشکل تھا۔ سب سے نگینہ کی والدہ کا پس منظر چھپالیا تھا۔

عثمان صاحب بھی شریک تھے مگر ایک جانب بے حد خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور چپ تو میرب بھی بہت تھی۔ اچانک ہی شبو کی نگاہ میرب پر اٹھی، اس نے اپنی ماں کے کان میں کھسر پھسر شروع کردی تھی۔

''منحوس ماری جہاں جاتے ہیں وہاں آجاتی ہے۔ اس کا بھلا یہاں کیا کام۔'' بیگم رب نواز نے برملا تبصرہ کیا، شبو خونخوار نگاہوں سے میرب کو دیکھ رہی تھی۔ میرب اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی تھی۔

''کیا بات ہے بیٹا یہ خواتین تمہیں اتنے غصے سے کیوں گھور رہی ہیں۔'' عثمان صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''ڈیڈ یہ سکندر کی کزن شبانہ ہے۔ یہ وہی ہے جس کا میں نے ایک بار آپ سے ذکر کیا تھا۔'' میرب کا لہجہ بے حد سپاٹ تھا۔ عثمان صاحب نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

''گویا میرا اندازہ درست تھا۔''

''کیا مطلب ڈیڈ؟'' میرب چونکی۔

''یہ تمہارے چھوٹے ماموں اور ممانی ہیں اور شبانہ بھی اس لحاظ سے کوئی غیر نہیں ہے تمہاری کزن ہی ہے۔'' ڈیڈ کی بات پر وہ بری طرح چونکی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ اس کے سامنے اس وقت اس کے سگے ماموں موجود تھے اور پھر اس نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ سکندر کی طرح شبانہ اس کی بھی تو کزن ہوئی۔ اس سوچ نے اسے بری طرح سے پریشان کردیا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو یہ لوگ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے۔ جب دلوں کے تعلق مضبوط ہوتے ہیں تو پھر یہ سارے ناطے بے معنی ہوجاتے ہیں باقی سارے رشتے پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ صرف دو لوگوں کا مضبوط تعلق ہی باقی ہر رشتوں کو بھی مضبوطی میں ڈھال دیتا ہے اور اگر دو لوگوں کے درمیانی استوار تعلق میں ہی ہو تو پھر باقی سب بھی بوسیدہ عمارت کی طرح ڈھے کر نیست و نابود ہوجاتے ہیں۔'' عثمان صاحب کی بات سچ ہی تو تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ ہر درد اور ہر تکلیف میں ہر خوشی اور ہر حسرت میں اس کے والدین ایک مضبوط کردار بن کر رہے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی ایک دوسرے سے تعلق میں کسی بھی مقام پر کمی نہیں کی تھی۔

''ڈیڈ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

گلفام ساتھ آیا، ویٹر نے قرینے سے ان کی میز پر کھانا سرو کیا اور مشروبات گلاسوں میں انڈیلے۔

''آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو پلیز بلا تکلف کہہ دیجیے گا۔ آپ میرے وی آئی پی گیسٹ ہیں۔'' آخری جملہ اس نے میرب کی طرف دیکھتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا، جس پر میرب تڑپ اٹھی، اس لیے اس نے اپنے سرخ چہرے کو دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ شیفون کے خوب صورت لباس میں آج وہ کوئی اپسرا معلوم ہورہی تھی۔ نک سک سے تیار وہ آج عام معمولی کے دنوں سے ہٹ کر زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں یکبارگی مچلتے جذبات طوفان برپا کررہے تھے پھر بیگم رب نواز باقاعدہ اٹھ کر میرب کے پاس آئیں۔

''گلفام بیٹے اپنے ان مہمانوں سے ہمارا تعارف تو کرواؤ گے۔'' بیگم رب نواز بھاری بھرکم زیورات میں لدھی کچھ مغرور سی دکھائی دے رہی تھیں۔ رعونیت ان کے چہرے پر رقم تھی۔ گلفام ادب سے ایک قدم پیچھے ہوا اور پھر انہوں نے ساتھ رکھی کرسی کو بیگم رب نواز کے لیے کھینچا تو بیگم رب نواز ایک ادائے بے نیازی سے وہاں بیٹھ گئیں۔

''یہ ہمارے مہمان ہی نہیں ہمارے پڑوسی بھی ہیں۔ عثمان انکل میرے لیے بہت ہی قابل احترام ہیں اور یہ ان کی بیٹی میرب ہیں۔ بہت ہی سلجھی ہوئی ہیں۔'' آخری جملہ اس نے شرارتاً ادا کیا تھا۔ میرب کو بہت برا لگا، بھلا یہ بھی تعارف کروانے کا کوئی طریقہ تھا۔ اس وقت بی جان

آ گئی اور آتے ہی میرب کو گلے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔

''یہ بچی بہت ہی پیاری ہے، میرے دل کو نہ جانے کیوں بہت اپنی اپنی سی لگتی ہے۔'' بی جان نے محبت سے کہا، میرب شرمساری ہوئی۔ یہ لوگ اتنا خلوص لٹاتے تھے مگر وہ نہ جانے کیوں ان کے خلوص سے ہمیشہ ہی متنفر رہتی تھی۔

''یہ تو آپ کی محبت ہے بی جان۔'' عمشان صاحب مودب سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اچھا ہوا ملاقات ہوگئی۔ بہت ہی ذکر سنا تھا آپ کا۔ پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے ہیں۔ بیٹا گلفام ان کو اچھے سے کھانے کا پوچھ لینا کسی شے کی کمی نہ ہو۔'' بی جان کا لگاوٹ اور محبت سے گندھا لہجہ تھا۔ بیگم رب نواز جو اندازے لگاتی رہی تھیں لگ گئی اور پھر اپنی جگہ واپس آ کر بیٹھ گئیں۔ سب باری باری دلہا دلہن کے ساتھ تصاویر بنوا رہے تھے۔ اس وقت کچھ کھانے میں مصروف تھے۔ وہ بھی ایک جانب شبو کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

''کیا کہہ رہے تھے وہ سب۔'' شبو کو کرید ہوئی۔

''جس طرح یہ نگینہ کا بھائی گلفام میرب کے آگے پیچھے پھر رہا ہے لگتا ہے کہ اس پر لٹو ہو گیا ہے۔'' شبو یہ سن کر بہت پر جوش سی ہوئی۔

''اماں اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ یہ پتہ کٹ جائے گا۔'' وہ جوش میں مسکرا کر بولی۔

''کچھ ہوش کے ناخن لے۔ تجھے کیا لگتا ہے تیرے بھائی نے جو گل کھلایا ہے اس کے بعد بھرا جی اور بھر جائی تجھے اپنی بہو بنائیں گے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو چودھریوں کی دشمنی کو جانتی نہیں ہے۔'' شبو کا سارا غلغلہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

''چل کھانا کھا چپ چاپ؟'' پھر دعاؤں کے حصار میں نگینہ رخصت ہو کر گوٹھ آ گئی تھی۔

❁......❁......❁

میرب آج بہت زیادہ خوش تھی اس کی زندگی کا یہ ایسا دن تھا جس نے اسے بہت دنوں سے مضطرب کر رکھا تھا۔ سکندر نے جیسے ہی اسے خبر دی تھی کہ اس کی آپی عابی کی عدت پوری ہوگئی ہے اور وہ سب یہاں اس کے اور میرب کے رشتے کی بات کرنے آنا چاہتے ہیں۔ تب سے وہ خوشی سے نہال تھی۔ اس نے ایک ایک پل بے صبری سے گزارا تھا اور بالآخر وہ پل آ ہی گیا جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔

اس کے سامنے ڈرائنگ روم کا منظر بے حد صاف اور واضح تھا۔ وہ تو بس ایک کونے میں لاؤنج میں کھڑی ہوئی خانساماں کو ہدایت دے رہی تھی اور کن اکھیوں سے اندر شیشے کے پار دکھائی دینے والے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ چودھری شاہنواز اس کے بڑے ماموں جن کو وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی۔ اچھی صحت کے سرخ وسفید باریش انسان تھے۔ ان کے چہرے پر تمکنت اور رعب و دبدبہ جھلکتا تھا۔ ان کے ہمراہ بیٹھی ہوئی ان کی ممانی تھیں۔ جن کے چہرے کی بشاشت بتا رہی تھی کہ وہ سکندر اور میرب کے اس رشتے کو لے کر بہت خوش ہیں۔ البتہ عابی کو وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی مگر اس کی آنکھوں کے نیچے بڑے حلقے اس کی بے خوابی کی چغلی کھا رہے تھے۔ خوش تو وہ بھی تھی مگر کچھ مضمحل سی تھی اور بار بار نہ جانے کیوں کھوسی جاتی تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی۔ عابی نے ایک نئی زندگی میں قدم رکھا اور پھر اس زندگی سے بے دخل کردی گئی۔ اس کا دکھ بہت زیادہ تھا۔ اس وقت اسے اپنے نام کی صدا سنائی دی۔ اسے پکارنے والے اس کے بابا جان تھے۔ وہ سر پر دوپٹا جمائے کچھ ہچکچاتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، سب کی توجہ اس پر مرکوز تھی۔ گلابی اور فیروزی کاٹن کے پرنٹڈ لباس میں اس نے بالوں کی سادہ سی چٹیا بنا رکھی تھی۔ اس وقت وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ کچھ خوب صورتی اس کے اندرونی خوشی سے سفارتی تھی۔

''ادھر آؤ میرے پاس۔'' عابی نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا، میرب کو تو ڈھیر ساری شرم آ رہی تھی۔ دل خوشی سے بے قابو تھا اور پھر یہ سب اس کے اپنے تھے۔ اس کا

اپنا خون تھے اس سوچ سے وہ بہت مطمئن تھی۔ اگرچہ یہ ایک راز تھا مگر اسے یقین تھا کہ جس طرح سکندر نے ایک معرکہ سر کرلیا ہے۔ وہ دوسرا معرکہ بھی سر کرلے گا۔ اس کو یقین تھا کہ ان کی محبت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ سارے مراحل خوش اسلوبی سے طے کرلیں گے۔

''سنو، تم بہت خوش نصیب ہو۔'' عابی نے پرسوچ مگر خوشی سے کہا۔

''جی......!'' وہ تحیر سے بولی۔

''ہاں ناں...... دیکھو ناں...... سکندر نے تم سے والہانہ محبت کی اور پھر اس محبت کے بل بوتے پر تم سے اظہار کیا پھر اس پر اکتفا نہیں کیا۔ تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانے کا ارادہ کیا۔ اس ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس نے جتن کیے۔ جانتی ہو کہ میں بیمار ہوگئی تھی۔ میرے ساتھ جو سانحہ ہوا وہ اتنا معمولی بھی تو نہ تھا کہ دو دن میں اٹھ کھڑی ہوتی۔ سو سنبھلنے میں عرصہ لگا۔ میں نے کہا تھا۔ ویر تو اپنی خوشی پوری کر۔ اس کی ضد تھی کہ نہ آپو، جب تو میری خوشی میں دل سے شامل ہوگی۔ تب ہی میری خوشی پوری ہوگی۔'' عابی کا لہجہ محبت سے مغلوب تھا۔''اور جس کا بھائی اتنا پیارا ہو۔ اس کی وہٹی تو خوش قسمت ہی ہوگی ناں۔'' عابی نے شرارت سے آخری جملہ ادا کیا۔ میرب کا سر مزید جھک گیا۔

''ماشاء اللہ بہت پیاری ہے ہماری میرب تو، جب سکندر نے ذکر کیا تو سوچا تھا کہ اچھی ہی ہوگی مگر اس نے تو ایک نظر میں ہی میرے دل میں اپنا گھر بنالیا۔'' بیگم شاہنواز نے بے حد خوشی اور محبت سے کہا۔ عثمان صاحب بے حد مطمئن تھے۔ ان کا دل چاہا تھا کہ وہ ان سے ماضی کی راکھ میں دبی چنگاری کا حوالہ بھی دیں مگر سکندر نے وعدہ لیا تھا اور پھر وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کے چہرے پر جو خوشی کے رنگ بہار کی مانند ہیں وہ ان کے ایک غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ جائے۔

''جی...... یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ آپا کو ہماری بچی اچھی لگی۔'' عثمان صاحب کا لہجہ عجز سے پر تھا۔

آج ہی انہوں نے اپنی بیگم کی ساری تصاویر دیواروں پر سے ہٹادی تھیں۔

سکندر نے شاید پہلے ہی بتادیا تھا اس لیے کسی نے بھی میرب کی والدہ کے حوالے سے کوئی سوال نہیں کیا تھا پھر بیگم شاہنواز نے آگے بڑھ کر میرب کے ماتھے کو چوم کر اسے نقد سلامی دی اور اس کی مخروطی انگلی میں انگوٹھی پہنائی اور ملازم نے مٹھائی سے سب کا باری باری منہ میٹھا کروایا۔

''آج سے میرب ہماری ہوئی۔'' بیگم شاہنواز نے پرعزم اور پختہ لہجہ میں کہا۔

عابی، میرب کو لے کر گھر کا دوسرا حصہ دکھانے کے لیے چلی گئی، بڑے مل کر آپس میں شادی کی تاریخ طے کرنے لگے تھے اور اس وقت میرب کو وہاں بیٹھے رہنا بہت ہی برا لگ رہا تھا۔ اس کے والد کے سامنے اس کی شادی کی بات ہورہی تھی اور وہ شرم محسوس کررہی تھی۔ میرب کے انداز کو دیکھ کر بھی عابی نے کہا تھا۔

''چلو مجھے اپنا کمرہ تو دکھاؤ۔'' یوں وہ اٹھ کر میرب کے ساتھ باہر آگئی تھی۔

میرب جب اپنے کمرے میں آئی تو اس نے تیزی سے میز پر رکھی اپنی اور اپنی ماں کی تصویر چھپانا چاہی تب ہی عابی تیزی سے بولی۔

''کیا چھپارہی ہو مجھے نہیں دکھاؤ گی۔'' اس نے محبت سے کہا اور ساتھ ہی میرب کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔

''پیاری کزن میں جانتی ہوں، میں سکندر کی بڑی بہن ہی نہیں بہترین دوست بھی ہوں اور سکندر نے مجھے اپنا راز دار بنالیا ہے۔ تاکہ اس راہ میں میں اس کے ساتھ چلوں اور میں تو یہ جان کر بہت خوش ہوں کہ تم پیاری اپنی ہو۔'' عابی تصویر دیکھ کر چونکی۔ میرب بھی چور سی بن گئی تھی پر وہ سب کچھ عابی کو سچ سچ بتاتی چلی گئی۔ میرب کو عابی نے محبت سے گلے لگالیا کہ یہ مخصوص خوشبو اپنوں کی خوشبو تھی۔

''آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے غلط نہیں سمجھا۔''

میرب کا لہجہ گلوگیر ہوا۔
''ارے کیسی باتیں کر رہی ہو۔ محبت کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ محبت تو بس محبت ہوتی ہے۔'' عابی نے کہا، اس لفظ محبت پر عابی نجانے کیوں جیسے کسی گہرے خیال میں کھوسی گئی تھی۔
''یہ خیال کس کا تھا؟''
''کیا آپ نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟'' میرب کے لبوں سے بے ساختہ ہای نکلا۔
''محبت میں نے......؟'' اچانک ہی عابی بے حد سنجیدہ ہوئی تھی۔
میرب نے محسوس کیا کہ اس نے شاید کوئی تلخ سا سوال کر دیا ہے۔ جو اسے عابی سے اس وقت اتنی جلدی پہلی ہی ملاقات میں نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اب پچھتائے کیا ہوتا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔
''پریشان نہیں ہو۔'' عابی نے اس کے چہرے کا فق رنگ دیکھ لیا تھا۔ عابی کے چہرے پر بشاشت لوٹتے دیکھ کر میرب نے سکھ کا سانس لیا۔
''محبت تو بہت ہی معمولی سا لفظ ہے۔ جس نے اسے اپنی ہر سانس میں تحلیل ہوتے محسوس کیا ہو۔ اس کا خیال، اس کا عکس، اس کا چہرہ میرے دل میں ہی نہیں میرے نقش پا میں ڈھلا ہوا ہے۔ مجھے ازبر ہے وہ شخص مگر آہ......وہ میرا نہیں ہے۔ وہ شخص جسے دل نے اپنا کہا مگر زمانے کی بھیڑ چال میں اسے اپنانا کہہ سکی۔ میرے جذبات، میرے دل میں گھٹ گھٹ کر جینے اور مرنے لگے مگر میں نے محبت کو عشق میں ڈھلتے دیکھا ہے۔ میں نے محبت کو عشق کا پیرھن اوڑھتے دیکھا ہے، وہ عشق کب جنون کا چولا اوڑھ کر میرے گرد حصار، میری رگ و پے میں سرایت کر گیا مجھے معلوم ہی نہ ہوسکا، میں جو ڈھول ڈھول اٹی ہوئی ہوں۔ میرا وجود جو خاردار راہ ہے۔ میرا لبادہ جو خاردار راستوں میں بوسیدہ ہو چلا ہے۔ میرے جسم پر آبلہ پائی کے آبلے ہیں مگر میری روح شگفتہ و تروتازہ ہے۔ میری روح میں وہ گلاب بن کر کھل رہا ہے۔ میری روح میں وہ کسی تازہ شگفتہ کلی کی مانند اپنی محسور کن مہک سے میری پور پور میں رچ بس گیا ہے۔ میری فسوں جاں میں سرایت کرتا وہ شخص نجانے کہاں ہے۔ مگر دیکھو تو یہاں ہے یہاں۔'' اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔
''ارے آپ تو بہت خوب صورت باتیں کرتی ہیں۔'' میرب دم بخود اس وقت عابی کے چہرے پر بکھرے محبت کے ان کہے رنگوں میں محو تھی۔
''ہاں بس محبت چیز ہی ایسی ہے۔ جو لفظوں میں کمال تک پہنچا دیتی ہے مگر میں ان پڑھ تو نہیں، میرے بھائی نے مجھے کبھی پیچھے نہیں رکھا۔'' عابی کا لہجہ بھائی کے ذکر سے محبت میں ڈوب گیا۔
''چلیں اندر چل کر بیٹھتے ہیں کافی دیر ہوگئی۔'' اس وقت عابی نے اچانک ہی واپسی کا عندیہ دیا، وہ دونوں واپس ڈرائنگ روم میں آئیں۔ ڈرائنگ روم کا منظر بدل گیا تھا۔ سب ہی خوش رنگ قہقہوں اور باتوں میں مشغول تھے۔
اتنی دیر میں وہ بیگانگی والا ناطہ اپنائیت میں ڈھل گیا تھا۔ گویا سکندر، عثمان صاحب کا اپنا بن گیا تھا اور میرب کو شاہنواز نے اپنی بیٹی بنالیا تھا۔ اس وقت ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ باہر گلفام صاحب آئے ہیں۔
''ارے اس کو بھی ادھر ہی بلا لو ناں۔ خوشی کا موقع ہے۔'' عثمان صاحب نے خوش دلی سے کہا، گلفام اندر داخل ہوا تو اندر موجود افراد کو دیکھ کر اس نے باآواز بلند سلام کیا۔
''یہ گلفام ہے، بہت ہی ملنسار بچہ ہے۔ پڑوسی ہے ہمارا۔'' عثمان صاحب نے تعارف کروایا۔
''اچھا ماشاءاللہ۔'' شاہنواز نے بغور گلفام کو دیکھا۔
''انکل میں پھر حاضر ہوجاتا ہوں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کے مہمان آئے ہیں۔'' اس نے مہذب انداز میں کہا، اب نہ جانے کیوں اسے جانے کی جلدی تھی۔
اس نے کن اکھیوں سے میرب کو دیکھا جو اس وقت ایک نوجوان لڑکی کے ہمراہ بیٹھی خوشی سے نہال معلوم

ہورہی تھی۔

"ارے میرب کا رشتہ طے ہوگیا ہے۔ مٹھائی تو کھاتے جاؤ۔" عثمان صاحب نے گلاب جامن کی پلیٹ اٹھا کر گلفام کے سامنے کی، گلفام کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے سخت بے یقینی سے میرب کو دیکھا جو اس وقت اس کی طرف متوجہ تھی۔

"میرب کا رشتہ۔" وہ اٹک اٹک کر بولا۔

"ارے ہاں، میرب اور ہمارا بیٹا سکندر بہت چاہتے ہیں ایک دوسرے کو اور اب ہم نے سوچا کہ سارے ذات پات کے بندھن کو پس پشت ڈال کر ان کا نکاح کردیا جائے۔ اس لیے اسی مہینے کی اکیس تاریخ کو شادی ہے۔ تم شادی میں ضرور شریک ہونا۔" عثمان صاحب اس کی اندرونی حالت سے بے خبر جوش سے بولے جب کہ میرب اس کے چہرے کی متغیر رنگت کو بغور دیکھ کر رہی تھی۔

"اور شاہنواز بھائی یہ لڑکا آپ کا رشتہ دار اور عزیز دار بھی بن گیا ہے۔" عثمان صاحب اصل پس منظر سے قطعی طور پر ناواقف تھے کہ کس طرح عابی کا رشتہ امل سے طے ہوکر ٹوٹ گیا ہے۔ ان کو ان سارے حالات واقعات کا بالکل بھی علم نہ تھا۔ ہوتا تو شاید یہ جملے ادا نہ کرتے۔

"اچھا......! وہ کیسے؟" متعجب انداز میں شاہنواز صاحب نے کہا۔

"چودھری نواز آپ کے ہی بھائی ہیں ناں، ان کی بیٹی ہے شبانہ اس کو پہچان لیا تھا میرب نے۔ اس کے بھائی امل سے بھی تو شادی ہوئی ہے نگینہ بیٹی کی۔" عابی کے تو جیسے دماغ پر ہتھوڑا سا پڑا تھا اور خود چودھری شاہنواز بھی یک ٹک عثمان صاحب کو دیکھ رہے تھے اور خود گلفام کی پلیٹ میز پر رکھ کر معذرت کرتا ہوا چلا گیا، منظر اچانک ہی غمی میں ڈھل گیا تھا۔

"یہی دنیا کی ریت ہے کہ ہر خوشی کے بعد غم ملے اور ہر غم کے پیچھے خوشی کھڑی مسکرا رہی ہوتی ہے۔"

"کیا آپ جانتے ہیں کہ امل کی پہلی شادی کس سے ہوئی تھی۔" بیگم شاہ نواز سے رہا نہ گیا، عثمان صاحب نے ان سب کے سنجیدہ ہوتے چہرے دیکھ کر کسی بڑی غلطی کا اندازہ لگانا چاہا۔

"جی نہیں۔" وہ متعجب ہوئے۔ چودھری شاہنواز نے ہنکارا بھرا اور پوری بات گوش گزار کردی۔

"اوہ...... مجھے اس بات کا قطعی طور پر علم نہ تھا۔ میں بہت معذرت خواہ ہوں۔" وہ سخت نادم ہوئے۔

"ارے نہیں۔ آپ کا کیا قصور بہرحال، جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ ہماری بچی اب مطمئن ہے، ہم نے اس کا رشتہ بھی طے کردیا ہے۔" چودھری شاہنواز کی بات پر عابی نے دکھ اور حیرت سے اپنے باپ کو دیکھا۔

ایک مرتبہ پھر اسے بنا پوچھے نجانے کس شخص کی ملکیت میں جانا تھا مگر اس وقت تو وہ چپ ہی رہی مگر اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اس بار وہ بالکل بھی چپ نہیں رہے گی۔ ہر مرتبہ بیٹی ہی کیوں قربانی دے۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ واپسی کے سفر میں سب ہی بہت خوش تھے۔ بالآخر اس خاموشی کو توڑا بیگم شاہنواز نے۔

"چودھری صاحب کیا آپ نے کچھ محسوس کیا؟" انداز سوالیہ ہی نہیں پریشان کن بھی تھا۔

"ہاں یہ محض اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔"

"عابی کو لگا کہ یہ اس کے اور امل کے رشتے کے حوالے سے بات ہورہی ہے مگر وہ اس وقت چونکی جب اچانک ہی چودھری شاہنواز نے دوبارہ کہا۔

"میری بہن میرے سامنے جیسے آ کھڑی ہوئی ہو۔" چودھری شاہنواز کا لہجہ بھیگ سا گیا تھا۔ اتنے سالوں کا پچھتاوا اب ان کے اندر آ گ بن کر ان کو جھلسا رہا تھا۔

"ہاں ناں، مجھے لگا کہ یہ میرا ہی وہم ہے مگر چال ڈھال، بات چیت سب......" بیگم شاہنواز نے بھی حیرت سے کہا۔ میرب کے حوالے سے وہ دونوں ہی سخت حیرت اور الجھن کا شکار تھے کہ وہ ان کی اپنی بہن سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ سکندر اور میرب نے ساری پلاننگ کرلی تھی۔ ہر بات کو راز میں رکھا تھا مگر بعض

اوقات قدرت سب سے زیادہ طاقت رکھتی ہے اور قدرت کچھ اور بھی چاہتی ہے۔ انسان بھید چھپاتا ہے اور قدرت بھید کھولتی ہے۔ انسان کی اس میں اپنی ہی بھلائی مضمر ہوتی ہے۔

''اب......اماں میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔'' گھر آ کر عابی نے باپ کے کمرے میں جا کر سب کچھ سچ سچ بتانے کی ٹھان لی تھی۔

سچ سن کر چودھری شاہنواز رونے لگے، آبدیدہ تو بیگم شاہنواز بھی تھیں، کہتے ہیں غم انسان کو نرم کردیتا ہے۔ یہ غم نہ ہوں تو انسان کٹھور سخت دل ہی رہے مگر اوپر تلے غموں کی آمد انسان کے دل کو نرم کردیتی ہے۔ اس کے دل میں سختی کو نرمی میں بدل دیتی ہے اور اپنی اولاد کا دکھ تو ایسا دکھ ہوتا ہے کہ اچھے اچھوں کو موم کردیتا ہے اور عابی کے ساتھ ہونے والی ناانصافی نے اب چودھری شاہنواز کو سرتاپا بدل دیا تھا۔ برسوں پہلے ہی چودھری رب نواز کے بہکاوے میں آ کر ہی انہوں نے اپنی بہن کے ساتھ اتنی بے اعتنائی کا سلوک روا رکھا تھا۔

''پاگل ہے سکندر، سچ بتا دیتا تب بھی میں نے کب انکار کرنا تھا۔ یہ تو اور اچھی بات ہے کہ میرب کے رگوں میں ہمارا ہی خون ہے۔'' چودھری شاہنواز کی بات سن کر عابی خوشی سے نہال ہوگئے تھے۔

''شکر ہے اللہ کا۔'' عابی رودی، یہ خوشی کے آنسو تھے۔

''ابا میں آپ سے ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں۔'' اب کے عابی کا سر جھکا ہوا تھا۔ لہجہ مودب مگر مضبوط تھا۔

''میں نے ایک مرتبہ جو زخم سہا ہے۔ میں دوبارہ اس درد ناک مرحلے سے گزرنا نہیں چاہتی پھر سے، آپ نے وہاں میرب کے گھر میں جو میرے حوالے سے کہا تھا۔ میں اس کے لیے کچھ کہنا چاہتی ہوں اگر اسے بغاوت نہ سمجھا جائے۔'' عابی کے انداز پر دونوں میاں بیوی نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔

''میں اب کبھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' عابی نے بالآخر ہمت مجتمع کرکے کہہ ہی دیا۔

''اور اگر میں کہوں کہ تمہاری شادی ہم بخشو سے کررہے ہیں تب بھی یہی جواب ہوگا۔'' چودھری شاہنواز کا لہجہ سنجیدہ تھا اور ان کی آنکھوں میں نرمی ہی نرمی تھی۔ عابی نے حیرت کے جھٹکے سے سر اٹھا کر باپ اور ماں کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں رقم سوال دیکھ کر بیگم شاہنواز نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ہاں میری بچی یہی سچ ہے۔ میں نے تیرا رشتہ سمیرا کے بیٹے سے طے کردیا ہے۔ یہ ہمیں پہلے ہی کرلینا چاہیے تھا مگر ہم نے اپنا شملہ اونچا کرنا تھا۔ سو کرلیا۔'' لہجہ درد میں ڈوبا تھا۔ عابی ماں کے گلے لگ کر دھواں دھار رو دی۔

''اب تیری اور سکندر کی شادی ساتھ ساتھ ہی ہوگی۔ اپنی بیٹی جائے گی تو دوسری گھر آئے گی ناں۔'' بیگم شاہنواز نے ہنس کر کہا۔

❀......❀......❀

صبح وشام بس یہ کہے مجھے
ہاں تو کہے مجھے
تیرے ہاتھ میں جو یہ میرا ہاتھ ہے
ہوں میں خوش بہت
کہ تیرا ساتھ ہی میری حیات ہے
غموں کا غماز تھا تیرا یہ چہرہ کبھی
اک آرزو وصل میں
میں بھی تو تھی بھٹکی ہوئی
مجھے آئینہ قرار دو
کہ مجھے آج سے اب سے
ازل سے ازل تک
مجھ کو اتنا پیار دو
یہ جو جلتا بجھتا سا دیا سا ہے
جو جلے اگر تو نہ بجھے کبھی
کہ محبتوں کے سفر ہیں ہم
محبتوں میں جیا کریں

میرب اور سکندر کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں آ گئی

تھیں۔ ان کی زندگی خوشی سے بھر گئی تھی اور میرب کو یہ سب ایک خوش گمان خواب جیسا لگتا تھا۔ وہ ان دس دنوں میں گاؤں کے ماحول میں رچ بس گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ کمرے میں دو بار جھانکنے کے بعد تیسری بار جھانک کر دیکھ رہی تھی کہ سکندر جاگے کہ نہیں۔ اس کو سکندر سے اتنی محبت تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ جب سکندر سو رہے ہوں وہ تب بھی سکندر کو چپکے چپکے دیکھا کرے۔ وہ اتنی دیر سے شدید بور ہو رہی تھی، ناشتے کا وقت ہوا چلا تھا۔ سب نے ناشتہ بھی کرلیا تھا۔ اس کی ساس نے تو کہا تھا۔

''دھی رانی جلدی سے ناشتہ کرلے، سکندر تو اب نجانے کب جاگے گا۔ اس کے انتظار میں کب تک بھوکی بیٹھی رہے گی۔ دیکھ تو سکھ کر کانٹا ہو رہی ہے۔'' وہ ساس کے گلے سے لگ گئی اور انہوں نے بھی محبت سے گلے لگایا تھا۔

''میری امی کو میں نے کھو دیا مگر اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی صورت میں امی دے دیں۔'' وہ رو دینے کو ہوئی۔

''دیکھ یہ رونا دھونا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ ایک تو سب سوچیں گے کہ میں روایتی ساس کی طرح تم پر ظلم و ستم کر رہی ہوں۔ دوسرا اپنی صحت خراب کرنی ہے اب بس میں ہمیشہ تمہارے چہرے پر مسکان دیکھوں یہ رونا دھونا نہیں۔'' وہ اپنی ساس کی ایسی محبت پر خوشی سے دوہری ہو رہی تھی۔

اب اس سے صبر نہ ہو سکا تو کمرے میں جا کر اس نے سکندر کے پاس بیٹھ کر ان کے ماتھے پر بکھرے بالوں کو چھوا۔ سکندر نے اس کی کلائی تھام لی، مضبوط مردانہ گرفت سے اس نے کسما کر ہاتھ چھڑوانا چاہا، بند آنکھوں کے ساتھ سکندر کے چہرے پر بڑی ہی خوب صورت مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ میرب کا دل مغرور ہو چلا تھا کہ اس مسکراہٹ کی اصل وجہ وہ ہی تھی یعنی اس دلکش چہرے پر جو محبت کی دھنک رنگ بکھر رہے تھے۔ اس کا مرکز وہی تھی۔

''یہ کیا حرکت ہے۔ ایک تو جاگ رہے ہیں اوپر سے ہنس رہے ہیں۔ دوسرا میرا ہاتھ بھی تھام رکھا ہے۔ چھوڑیں میرا ہاتھ۔'' وہ نروٹھے پن سے بولی۔

''اچھا جی یہ ہاتھ تو اب نہیں چھوٹ سکتا، اب تو یہ ہاتھ عمر بھر کے لیے تھام لیا ہے۔'' وہ محبت سے لبریز لہجے میں بولا۔

''ویسے سکندر اگر آپ میرا ہاتھ اسی طرح تھامے رکھیں گے تو میں ساری عمر بھوکی ہی مر جاؤں گی۔''

''ارے تم نے کچھ کھایا نہیں اب تک۔'' سکندر ایک دم ہی سیدھا ہو کر اٹھ بیٹھا۔

''یہ اچھی بات نہیں ہے۔'' سکندر نے خفگی سے کہا۔

''ہاں تو آپ کے بنا ہی کھا پی لوں۔ اچھا نہیں لگتا ناں۔''

''بیگم صاحبہ۔ جلد ہی مجھے کام کاج کے لیے جانا پڑے گا تب دیر سویر ہو جائے گی تو کیا سارا دن بھوکی رہو گی۔ یہ سب نہیں چلے گا۔ میں دوبارہ نہ دیکھوں یہ سب۔'' وہ اسے محبت بھری ڈانٹ پلا رہا تھا۔

''اچھا ابھی تو چلیں ناں میں نے آپ کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بنایا ہے۔'' وہ ضدی سی ہوئی۔ اسے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔

''اچھا تم چلو بس دس منٹ میں آیا۔'' اور پھر واقعی دس منٹ بعد سکندر نہا کر باہر نکل آیا تھا۔ سرخ شرٹ اور نیلی پینٹ میں ملبوس سکندر کا سرخ و سفید رنگ اور بھی زیادہ نکھر کر سامنے آ گیا تھا۔ اس نے نظر نہ لگے یہ سوچ کر ہی نظر پھیری تھی۔ سکندر لگ ہی اتنے پیارے رہے تھے کہ وہ نظر چرانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

ناشتہ بہت ہی پر تکلف سا تھا۔ بل دار پراٹھے اور لسی تھی، ساتھ میں آملیٹ تھا میرب نے اس کی پسند کا انڈوں کا حلوہ بھی پکایا تھا اور ساتھ میں حلوہ پوری بھی تھی۔ اتنا لذیذ ناشتہ اس نے سیر ہو کر کھایا۔ گاہے بہ گاہے وہ بیگم شاہنواز سے نظر چرا کر میرب کے منہ میں نوالہ ڈال دیتا تھا۔ میرب چور نگاہوں سے ساس کو دیکھتی جو بیٹھی ہوئی کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

''اماں کیا بات ہے بڑی چپ ہیں؟'' سکندر نے ماں سے پوچھا۔

''ہاں...... سکندر میں سوچ رہی تھی کہ تو جب شہر چلا جائے گا تو میری دھی تو اداس ہوجایا کرے گی۔ یہ تو تیرے بغیر ایک نوالہ منہ میں نہیں ڈالتی۔'' ساس کا اس کے لیے فکر مند لہجہ اسے خوش کر گیا۔

''اماں پریشانی کی کوئی بات نہیں، میں نے شہر میں اپنے کاروبار میں ایک شخص کو شراکت داری کروادی ہے وہ اور میں مل کر کام کریں گے۔ مجھے ہفتے میں ایک دن جا کر سارا حساب کتاب دیکھنا ہوگا۔ باقی سارے معاملات وہی دیکھے گا۔ پھر اماں میں اتنا خود غرض اور کٹھور نہیں ہوں کہ اتنے سال آپ کو جدائی دے جاؤں۔ میں یہیں اپنی ہی زمین میں رہوں گا۔'' سکندر کی بات پر بیگم شاہنواز کا چہرہ کھل اٹھا اور چہرے پر خوشی کے ساتھ مامتا کا نور بھی امڈ آیا تھا۔

''ڈھیروں دعائیں میرے بچے تیرے لیے۔'' میرب نے مسکرا کر سکندر کو دیکھا تھا۔

❁......❁......❁

''میرے گھر میں تو نور اتر آیا ہے۔'' سمیرا نے محبت سے کہا تو عالی مسکرادی۔

''اماں کیسی باتیں کرتی ہیں۔''

''ہائے جب تو مجھے اتنا مان دیتی ہے اور اماں کہتی ہے تو مت پوچھ کتنی خوشی ملتی ہے۔'' سمیرا نے خوشی سے کہا۔

''آپ بختو کی اماں نہیں میری بھی تو اماں ہی ہیں ناں، پھر آپ نے ہمیشہ مجھے بیٹی کی طرح چاہا ہے۔'' وہ سر جھکا کر دل کی ترجمانی کرنے لگی تھی۔ عالی شادی کے بعد بہت ہی خوش تھی۔ ایک دو مرتبہ وہ اور بختو گھر گئے تھے اور گھر میں میرب اور سکندر کو آباد و شاد دیکھ کر ان کا دل مسرور ہوجاتا تھا۔

❁......❁......❁

''تم اتنے افسردہ کیوں رہنے لگے ہو میرے بیٹے۔'' زرینہ نے گلفام کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اسے آواز دی۔

''آپ کا مجھے اپنے بیٹے کی طرح چاہنا، فکر کرنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' گلفام نے واقعی پورے خلوص اور دل سے کہا۔ اس کی ماں نے تو کبھی بھی اسے اس طرح نہ سمجھا تھا مگر زرینہ نے اسے اتنے عرصے میں ماں جیسا پیار دیا تھا۔

کچن میں کیا کام کروانا ہے۔ کیا پکانا ہے سب اس کی پسند کے مطابق تیار ہوتا تھا۔ وہ گھر کی مالکن ہوکر بھی بس سادہ سے حلیے میں پھرا کرتی تھیں۔ دولت خان کی فکر میں گھلتی، کبھی بی جان کی دوائیوں کی فکر کرتی تو کبھی گلفام کے لیے متفکر ہوتی وہ بالکل ایک سادہ سی خاتون تھیں اور اس کی اس سادگی میں اس کی اصل خوب صورتی پنہاں تھیں۔

''ایسا تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' گلفام نے بات کو ٹالا۔

''ماں سے کچھ نہیں چھپتا۔ میں نے تمہیں اپنی کوکھ سے نہیں جنم دیا مگر پھر بھی میں تیری ماں ہوں۔ میرے بچے میرب کے لیے اب اداس ہونا چھوڑ دے۔ وہ اب اپنے گھر بار والی ہے۔ خوش ہے اپنی زندگی میں ہر اچھی لگنے والی شے ہماری ملکیت بن جائے یہ کہاں ممکن ہوتا ہے۔'' زرینہ نے مامتا سے لبریز لہجہ میں کہا۔

''جی بس دل نے پتا نہیں کیوں یہ سمجھ لیا تھا وہ بس میری ہی بنے گی۔ جب کہ میں نے اور اس نے بھی ایسا کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ میں اس کی خفگی کو اس کی ادا سمجھ بیٹھا تھا نا سمجھ یہ نہیں سمجھا کہ وہ واقعی مجھ سے خفا تھی۔ اتنی خفا کہ یہاں آ کر چلی گئی۔'' اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر اداس سے کہا، گلفام کا لہجہ گلوگیر اور آنکھیں لہو رنگ ہورہی تھی۔

''تم اداس مت ہو۔ اگر مجھے ماں سمجھتے ہو تو میری ایک درخواست ہے۔'' گلفام نے اچانک ہی زرینہ کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''آپ بس حکم کریں۔ آپ واقعی میری ماں ہیں۔ آپ نے اس گھر کو مکمل ایک گھر کی شکل دی ہے۔ ہم

سب جب شام کو لان میں چائے پیتے قہقہے لگاتے ہیں تب میرا دل کرتا ہے کہ کاش یہ وقت رک جائے۔ میں نے اتنے ماہ و سال میں یہ جانا ہے کہ زندگی میں سب رشتے صرف خلوص کی عمارت پر ہی کھڑے ہوتے ہیں اور رشتے سے خلوص ہی مفقود ہو تو پھر کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا ہے۔'' وہ جذباتی ہوا۔

''میں آخری بار نگینہ سے ملنے گئی تھی۔ تو میں نے دیکھا کہ شبانہ کی وجہ سے ان کے گھر والے بہت پریشان ہیں۔''

''نگینہ نے مجھ سے کہا کہ میں شبانہ کے لیے کوئی رشتہ تلاش کروں۔ تو میرے ذہن میں پہلا خیال تمہارا ہی آیا۔ بیٹا تم آج میرے کہے پر حامی بھر دو۔ وہ لڑکی اس گھر میں آ کر اس گھر میں بس جائے گی۔ مجھے یقین ہے۔ دراصل اس کا ایک طویل پس منظر ہے۔ جس طرح تم میرب کی شادی سے سوگوار ہو۔ اسی طرح شبانہ کو رد کر کے میرب کو بہو بنایا گیا ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ اس صورت حال میں اس کی ذہنی کیفیت کیا ہوسکتی ہے۔'' وہ خاموش ہو کر اس کے تاثرات دیکھ رہی تھیں۔

''اگر تم ہاں کہو تو بات کروں۔'' زرینہ کی بات پر گلفام کو اچانک وہ خوش شکل مگر نخوت والی لڑکی کا خیال آیا جو شادی کی تقریب میں بھی ایک جانب ہی بیٹھی رہی تھی اور نگینہ کی رخصتی کی تقریب میں بھی چپ رہی تھی۔

''یہ وٹہ سٹہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے نگینہ آپی کا گھر خراب ہو۔'' گلفام نے سنجیدگی سے کہا، اس پر زرینہ نے گہری سانس لی۔

''میں نے ہر لحاظ سے سوچا اور تمہارے بابا سے بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب تم ہی اس گھر کی کل مالک ہو۔ تم جو بھی فیصلہ کرو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس گھر کی ساری ذمہ داری اب تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ دراصل مجھے لگتا ہے کہ جب انسان ٹوٹ کر بکھرتا ہے تو پھر اس کا سارا غرور اور اس کی ساری اکڑ ملبے تلے دب جاتی ہے اور پھر اس کی جگہ عجز آ جاتا ہے۔'' زرینہ کی بات میں وزن تھا وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' وہ گلفام کو دعا دیتی باہر نکل گئیں۔

''دراصل وہ اسے کیسے بتاتیں کہ جو چال عرصہ پہلے چودھری نواز کے ساتھ چلی تھی۔ اب زرینہ نے دوبارہ چلی تھی۔ وہ چاہتی تو صاف دوٹوک انداز میں انکار کر دیتیں۔''

وٹہ سٹہ انہیں پسند نہ تھا مگر وہ اس لیے چپ رہی تھیں کہ زرینہ جس طرح ماں تھیں۔ بیگم رب نواز بھی ایک ماں تھیں۔ شبانہ نے سکندر کی شادی کا سن کر اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد یہ بات پورے پنڈ میں مشہور ہوگئی تھی کہ وہ سکندر کی ٹھکرائی ہوئی ہے۔ پنڈ سے بات نکلتے نکلتے کب یہ دوسرے گوٹھ میں چلی گئی۔ حتیٰ کہ ہر کسی کی زبان زد عام ہوگئی تھی۔

اسی قدر پریشان کن حالت میں چودھری رب نواز اور بیگم رب نواز تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ یہ دنیا مکافات عمل ہے۔ انسان جو بیج بوتا ہے اس کا پھل بھی کھانا پڑتا ہے۔ انسان جو کرتا ہے وہ اس کو اپنے عمل کے بعد کرنا بھی پڑتا ہے۔ شبانہ کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔ وہ چپ رہتی تھی۔ اسے نہ کھانے پینے کا ہوش نہ کسی چیز کی پروا تھی اسے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوا تھا کہ سکندر کی تو جہاں شادی ہونی تھی ہوگئی تھی مگر اس کا کیا ہوا تھا۔ اس کی بدنامی ہوگئی تھی۔ لوگ اس پر تضحیک آمیز جملے کسنے لگے تھے۔ اس کے گھر جب دور دور سے خواتین آتیں تو ان کو ایک ہی ٹوہ ہوتی تھی کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

چودھری رب نواز نے کسی کی بیٹی کو رلایا تھا اور آج ان کی اپنی بیٹی ہی خون کے آنسو رو رہی تھی۔ کرلا رہی تھی۔ ان کا کہا ان کے سامنے آ گیا تھا مگر اب بھی وہ یہ سمجھتے کہ دولت کے بل بوتے پر شبانہ کی کہیں بھی شادی کروا دیں گے مگر ہر کوئی شبانہ کے چہرے پر بہت گہری سنجیدگی سے گھبرا جاتا۔

جب بیگم رب نواز نے بطور ماں رو رو کر اس کے

سامنے ہاتھ پھیلائے تو زرینہ کانپ گئی تھی۔ اسے اپنی بیٹی کا وہ وقت یاد آ گیا تھا جب بدنامی ان کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ وہ یا تو اپنی بیٹی کو بیاہ دیتیں یا بیچ دیتیں۔ آج یہ سب رب کی عطا تھی اور اب وہ رب کے شکرانے کے طور پر کس لڑکی کی زندگی بچانا چاہتی تھیں۔ اس نے رات گلفام کی آمادگی کے حوالے سے بی جان سے بات کی تھی۔ سب اہل خانہ کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ پھر دو دن بعد سب ہی رشتہ لے کر باقاعدہ چودھری رب نواز کے گھر آ گئے تھے۔

چودھری رب نواز نے اس رشتے کو ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ وہ نم آنکھیں لیے جھک گیا تھا۔ اونچی شملے والا چودھری آج اپنے آپ میں بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔ نگینہ کو تو گھر میں اور بھی عزت مل گئی تھی۔ یوں بھی امل اس پر جان چھڑکتا تھا مگر اکثر امل کو عابی کے ساتھ کیے جانے والے اپنے ناروا سلوک کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔

اس میں زیادہ عمل دخل نگینہ کے رویئے کا تھا۔ اس نے امل کو سر تا پا بدل کر رکھ دیا تھا۔ امل شرمسار رہتا تھا پھر شبانہ کی حالت دیکھ کر کڑھتا تھا۔ جس دن رشتہ طے پایا اور سادگی سے نکاح کی رسم کے بعد شبانہ گلفام کے سنگ بیاہ کر چلی گئی۔ اس دن اچانک امل باپ کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

''باباجان میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہی عابی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا مگر میں سمجھتا ہوں کہ بطور والدین آپ مجھے روک سکتے تھے۔ میری اصلاح کر سکتے تھے۔ آپ نے اور اماں نے کبھی مجھے نہیں ٹوکا بلکہ مزید شہہ دی۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ یہی نہیں، آپ جانتے تھے اور اماں بھی جانتی تھیں کہ میں نگینہ کو پسند کرتا ہوں۔ عابی سے شادی کے لیے آمادہ نہیں تھا مگر آپ نے مجھ پر زور زبردستی کی۔ اس کا نتیجہ دیکھ لیا۔ خیر جو ہونا تھا ہو گیا مگر میں اب اس سب کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تایا جان سے معافی مانگوں اور مجھے آپ دونوں کا ساتھ چاہیے۔'' امل کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

''مگر وہ تو تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے اب تم کس طرح جاؤ گے۔ وہ تو شاید ہمیں دھکے دے کر نکال دیں۔'' چودھری رب نواز جزبز ہوئے۔

''اباجان، کوشش کر لیتے ہیں، باقی جو رب کی رضا۔'' یہ ان کی بہو نگینہ کے الفاظ تھے اور جس کی بات کی بہت زیادہ وقعت رکھتی تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا تو جیسے کہتی ہے ویسے ہی کر لیتے ہیں۔''

❁......❁......❁

وہ سب اس وقت چودھری شاہنواز کے دالان میں بیٹھے تھے۔ زنان خانے میں سب موجود تھے۔ مرد بھی تو گھر کے ہی تھے۔ امل نے پہلے چودھری شاہنواز سے معافی مانگی، نجانے کیسے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ وہ عابی سے بھی معافی مانگنا چاہتا تھا۔

''عابی اپنے گھر خوش باش ہے۔ اسے تیری معافی کی ضرورت نہیں۔'' بیگم شاہنواز نے اوکھے لہجے میں کہا۔

''بیگم اونچے لہجے میں مت بولو۔ پہلے اپنی اصلاح کرلو پھر کسی کی اصلاح کرنے میں دخل دینا۔'' چودھری شاہنواز نے بیگم کو گھورا اور بیگم شاہنواز حیرت سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھتی رہی گئیں۔

''ہماری یہ بہو، یہ بچی میرب صرف ہماری بہو نہیں ہے بلکہ ہماری آپا کی نشانی بھی ہے۔ یہ میرب وہی بچی ہے جسے آپ دل وجان سے چاہتی تھیں اور کیا ہم مجرم نہیں ہیں، ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ مجرم ہیں۔ کہانی تو برسوں پہلے شروع ہوئی تھی جب ہم نے اپنی مردانہ انا کے زعم میں اپنی بہن کی شادی زور زبردستی کرنا چاہی تھی۔ اباجی کے فیصلے میں تذبذب تھا مگر اس میں حتمی کیل ہم نے ٹھونکی تھی۔ ہم نے کہا تھا کہ اباجی یہ غلط ہے اور اس کا پھل ہم نے کھایا، عابی اور شبانہ کی بربادی پر اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہماری بہن جو دکھ اپنے اندر ہی لے کر چل دی اس کے مجرم ہم دونوں ہیں اور پھر ہم دونوں ہی نہیں ہماری بیویاں بھی ہیں۔ یہ بچی میرب ہمیں بتاتی ہے آج کیا غلط کیا درست ہے۔ ہمیں ہی نہیں

بلکہ سکندر کو بھی۔'' چودھری شاہنواز سانس لینے کو رکے۔
''آپ درست کہہ رہے ہیں بھراجی۔ ہمیں بھی یہاں ہماری بہو نگینہ نے ہمت اور حوصلہ دے کر بھیجا ہے کہ جائیں معافی تلافی کرلیں۔ آپ نے اہل کی شخصیت میں یہ جو نکھار دیکھا ہے یہ اس ایک لڑکی کے ہی مرہون منت ہے۔'' چودھری رب نواز نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ میرب اداس ملول بیٹھی رہی، اپنی ماں کے آخری دن اسے یاد آرہے تھے۔ ان کا رونا، کڑھنا کہ وہ اپنے بابا جان کا آخری دیدار بھی نہ کرسکی تھیں اور منع کرنے والے یہی دونوں بھائی ہی تھے جو رشتے میں اس کے سگے ماموں، اس کا اپنا خون۔
''میں سمجھتا ہوں کہ من پسند شادی کرنے میں کوئی عار نہیں اگر اس میں بڑوں کی رضا مندی اور خوشنودی بھی شامل ہوجائے، ہماری بہن خودسر نہ تھی پھر اس کا باقاعدہ رشتہ آیا تھا مگر ہم نے کیا کیا؟ بلاوجہ کی ضد اور زعم..... آج جب اپنی بیٹی کا وقت آیا تو ہم نے ہر ذات، برادری، فرقے، ذات پات کو پس پشت ڈال دیا۔ میرب اسی ماں کی بیٹی ہے تو پھر اس شخص کی بھی تو بیٹی ہے جسے برسوں پہلے ہم نے ٹھکرایا تھا۔ دیکھے بنا جانے بنا۔ عثمان صاحب کتنے اچھے ہیں ہم جانتے ہیں پھر جب عابی کے لیے نیچے جانا پڑا تو ذات سے نیچے جانے میں بھی میں نے کوئی مضائقہ نہیں سمجھا کیوں؟ کیونکہ اپنی بیٹی اور اپنی اولاد کا درد تھا مگر بہن کا درد نہ تھا۔ بہن کا درد ہوتا تو اس وقت اس کی آہوں اور سسکیوں کو سن لیتے۔'' چودھری شاہنواز کا لہجہ درد میں ڈوب گیا تھا۔
''جی آپ سچ کہہ رہے ہیں گلفام بھی ہماری برادری کا نہیں ہے اور ہم نے اس کا رشتہ شبانہ سے طے کردیا، شبانہ بیاہ کر گلفام کے گھر جاچکی ہے۔ یہ بات سن کر میرب کو گونا گوں سکون محسوس ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دوطرفہ بے سکونی کا شکار تھی۔ ایک طرف گلفام اسے چاہتا تھا۔ اگرچہ اس میں اس کا تو کوئی بھی قصور نہ تھا۔ اس نے کبھی بھی حوصلہ افزائی اور شہہ نہیں دی تھی مگر وہ چاہتا تھا اور وہ بیاہ کر ادھر آگئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ گلفام کو اس کی شادی سے رنج پہنچا ہے آخری مرتبہ اس کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ اس نے دیکھا تھا تو تب اس کے دل پر مزید بار آ گیا تھا۔ جب اس نے سنا کہ شبانہ نے سکندر کے پیچھے اپنی جان لینے کی کوشش کی ہے مگر اس سب میں وہ قصوروار نہ تھی۔ اس نے تو بس سکندر کو چاہا تھا اور پھر سکندر بھی تو اس کو دیوانہ وار چاہتے تھے۔
''ماشاءاللہ ہم خوش ہیں کہ شبانہ بیٹی کا گھر بس گیا۔''
''میں نے دل سے معاف کردیا ہے۔ بس اللہ بھی ہمیں معاف کردے۔ ہمارے گناہ بہت بڑے ہیں۔'' چودھری شاہنواز نے دیوار گیر تصویر کی طرف دیکھا، دیوار پران کی آپی کی تصویر آویزاں تھی۔ جس میں وہ مسکرا رہی تھیں۔ جیسے کہ آج وہ بہت زیادہ خوش ہوں کہ آج سب کے دل ایک دوسرے کے لیے محبت سے لبریز تھے۔
وہ سب اس کے لیے غیر کب تھے۔ وہ سب تو دل کے مکین تھے اور جو دل کے مکین ہوتے ہیں۔ وہ کب دل سے بے دخل کیے جاتے ہیں۔
اسی وقت نجانے چودھری رب نواز کے جی میں کیا آیا کہ اس نے آگے بڑھ کر بڑے بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اب وہ مزید شبانہ کی جانب سے بری خبر کے منتظر نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ جان گئے تھے کہ کل انہوں نے جو سلوک عابی سے روا رکھا ہے وہی سلوک آج ان کی اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہوسکتا تھا۔ چودھری رب نواز کے ہاتھوں کو چودھری شاہنواز نے تڑپ کر تھاما اور اپنے بھائی کو دل سے گلے لگالیا۔ یہ منظر دیکھ کر بیویاں بھی سیدھی ہوئیں اور نرم پڑگئی تھیں۔
یہی وجہ تھی کہ اس رات بیگم شاہنواز نے پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا اور میرب ان کے ساتھ ساتھ رہی پھر انہوں نے سمیرا کو کہلا بھیجا کہ عابی کو کچھ دیر کے لیے بھیج دے۔ وہ چاہتی تھیں کہ عابی کے دل سے بھی یہ پھانس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل جائے، ماں تھیں ناں اس لیے ایسا سوچتی تھیں۔

عابی آئی اور اس کے ہمراہ بخشو بھی تھا۔ بخشو اور عابی کے چہرے حسرت اور اندرونی خوشی سے کھل رہے تھے۔ امل کو دیکھ کر عابی تو چپ کرگئی مگر بخشو کو بہت غصہ آیا تھا۔ عابی نے اپنا ہاتھ بخشو کے کندھے پر رکھا اور عابی کا لمس پاتے ہی اس کے کھینچے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ یہاں ہے تو کوئی جواز ہے پھر امل نے سب کے سامنے عابی سے معافی مانگی اور عابی نے بھی پورے دل سے اسے معاف کردیا تھا۔

''جانتے ہو امل مجھے اب یوں بھی کوئی دکھ نہیں ہے۔ جو ہوا نہ ہوتا تو مجھے میرا بخشو نہ ملتا۔ میرا بخشو جو مجھے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھتا ہے۔ میرے لیے میری کل کائنات وہی ہے اور اس کو پا کر مجھے اب یوں بھی کوئی غم نہیں رہا، تم یہ سب نہ کرتے تو شاید میرے نصیب میں بخشو نہ لکھا ہوتا اور اس سب کے لیے میں تمہاری مشکور ہوں۔'' عابی کی بات نے وہاں موجود سب ہی لوگوں کو انگشت بدنداں کردیا۔ عابی واقعی بہت بڑے دل کی مالک تھی۔ اس کا دل اور ظرف دونوں ہی وسیع تھے۔ بخشو نے بہت ہی فخر سے اپنی عابی کو دیکھا جو اس کی بیوی، اس کی عزت بن گئی تھی۔

''بخشو...... تمہارا شکریہ کہ تم نے ایک بار کہنے پر عابی کو بھیج دیا۔'' بیگم شاہنواز جو کبھی اس کی مالکن تھیں آج ایک بیٹی کی ماں بن کر مخاطب ہوئیں۔

''آپ کیسی باتیں کرتی ہیں، ہم نے تو یوں بھی آنا ہی تھا۔'' بخشو کی بات پر عابی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ وہاں سب ہی تو موجود تھے اور متوجہ بھی۔

''کیوں سب خیریت ہے ناں؟'' بیگم شاہنواز کچھ گھبرائیں۔ اگرچہ اب وہ عابی کی طرف سے بے فکر رہتی تھیں مگر ماں کے دل کو ایک دھڑکا سا تو لگا ہی رہتا ہے۔

''جی آپ نانی بننے والی ہیں۔'' بخشو نے سر کھجا کر کہا تو سب کے منہ سے خوشی سے بھرپور آوازیں نکلیں۔ ملازم نے اسی وقت سب کا منہ میٹھا کروایا۔

خوشی سے چودھری شاہنواز کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ انہوں نے آج کسی کی بیٹی کو دل سے معاف کیا اور اب اپنی بیٹی کی طرف سے یہ خوشی کی خبر سننے کو ملی تھی۔ وہ واقعی خوش سے نہال ہوگئے تھے۔

❀......❀......❀

''بیگم صاحبہ کچھ تو اپنی صحت کا خیال رکھو مجھے روتے بسورتے نڈھال بچے نہیں چاہیے تمہاری طرح۔'' سکندر نے لاڈ سے کہا۔

''کیا کہا...... میں روتی بسورتی ہوں؟'' جب سے میرب کو اللہ رب العزت نے اولاد کی خوش خبری دی تھی۔ وہ کھانے پینے سے کترانے لگی تھی اور اپنی صحت کا بالکل بھی دھیان نہیں رکھ رہی تھی۔ کاروباری معاملات میں الجھا ہوا سکندر جب ایک ہفتے بعد واپس لوٹا تو اسے میرب پہلے کی نسبت بجھی بجھی اور کمزور سی لگی، اسے دیکھ کر رونے لگی تھی۔ وہ تو اس کے گلے سے لگی روتے ہوئے الگ ہونے پر ہی آمادہ نہ تھی۔ شاید اداسی کا شدید ترین دورہ تھا۔

''میں نے ایک بات کہنی ہے۔ میں اب جب تک منا نہیں آجاتا کہیں نہیں جاؤں گا۔'' سکندر نے اس کو ایسی بات کہی کہ میرب نے چونک کر اسے خود سے الگ کیا۔

''کیا ناک صاف کرتی رہتی ہو سارا کندھا ہی گیلا کردیا۔'' سکندر شرارت سے بولا تو میرب نے اسے کھٹ کھنی بلی کی طرح گھورا۔

''اچھا بابا خفا نہ ہو تمہاری خفگی برداشت نہیں ہوتی۔'' سکندر نے محبت سے کہا۔

''میں آپ سے خفا ہوسکتی ہوں بھلا۔ دل کے مکین ہیں آپ۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔ محبت اور نور کی کہکشاں اس وقت ان دونوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔

bazsuk@naeyufaq.com

سمیہ عثمان

رخ کومل شہزادی......سرگودھا
تصویر کائنات کا خالق ہے اللہ
دل کو نور دے وہ احسان ہے اللہ
اے بندہ ہے مومن دل کیوں اداس ہے
دل سے ذرا دیکھ تیرے ساتھ ہے اللہ

ماہا بشیر حسین......ڈنگہ
دراز قامت، گلاب چہرہ
خمار آنکھیں اجال رکھنا
تیری اداؤں پر مر نہ جائیں
خدا کی بندی خیال رکھنا

تبسم بشیر حسین......ڈنگہ
جب بھی ساون کی شوخ راتوں میں
کوئی وارث کی ہیر گاتا ہے
سوچتی ہوں اس گھڑی مجھ کو
کیوں تیرا شہر یاد آتا ہے

نجم انجم اعوان......کراچی
کچھ اور بھی جذبات کو بے تاب کیا اس نے
جب مہندی لگے ہاتھوں سے آداب کیا اس نے

سباس گل......رحیم یار خان
تمہارے بن گزارا نہیں ہے
سوائے صبر کے چارہ نہیں ہے
تمہارے ہجر میں ہر شب اماوس
کوئی جگنو، کوئی تارا نہیں ہے

راؤ تہذیب حسین تہذیب......رحیم یار خان
نئے سال کی ہم خوشی کیا منائیں
ہمارا ہے اب بھی وہی رونا دھونا
سیاست کے میداں میں جاری ہے ہلچل
ہے خبروں میں پہلے سے بڑھ کر کرونا

نادیہ یاسین......ساہیوال
خاک مٹھی میں لیے قبر کی یہ سوچتا ہوں
انسان جب مرتا ہے تو غرور کہاں جاتا ہے

امبر بخاری......راولپنڈی
تم سے دل لگا کر ہم نے یہ جانا زندگی
حسین چہرے اکثر بے وفا ہوتے ہیں

فیاض اسحاق مہانہ......سلانوالی
کہیں بکھری کتابیں، کہیں میلے کپڑے
اپنے کمرے کی حالت ہم نے عجیب بنا رکھی ہے
اپنے وحشت زدہ کمرے کی الماری میں
تیری تصویر عقیدت سے سجا رکھی ہے

اقدس ضیاء......کوٹ شاکر
بارش ہوئی تو پھولوں کے تن چاک ہوگئے
موسم کے ہاتھ بھیگ کر سفاک ہوگئے
بارش کو کیا خبر کہ بارش کی چاہ میں
کیسے بلند و بالا شجر خاک ہوگئے

ثناء اجالا......بھلوال
اب تو کوئی آس پاس نہیں
اب تو آنکھیں ملا کے بات کرو

نوشین جاوید......بہاولنگر
مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
تو ہے موجود اس قدر مجھ میں

سدرہ محسن علی......جھنگ
ٹھوکریں کھا کر بھی اگر نہ سنبھلے تو مسافر کا نصیب
ورنہ راہوں کے پتھر تو اپنا فرض ادا کرتے ہیں

مہوش فاطمہ......کراچی
درد بھی دل کو یہ کہہ کر چھوڑ گیا کہ
اب اجڑے ہوئے گھر کی نگرانی نہیں ہوتی

پروین افضل شاہین......بہاولنگر
پیکر تھا وفاؤں کا محبت کا خدا تھا

وہ میرے لیے سارے زمانے سے جدا تھا
اس شام کی حدت مرے دل سے نہیں جاتی
جس شام ترا سایہ مرے سر سے اٹھا تھا
سائرہ حبیب رحمان......عبدالحکیم
دیکھ کر ان کی آنکھوں میں اپنے نام کی مایوسی
دل رویا تو نہیں مگر پھر کبھی ہنسا بھی نہیں
آنسہ شبیر......گجرات
اس جہاں میں کون کسی کو کیا دیتا ہے
بندہ تو اک وسیلہ ہے خدا دیتا ہے
وہ کرے دوزخ بھی عطا تو کروں اس کا شکریہ
کوئی اپنا سمجھتا ہے تو سزا دیتا ہے
رابعہ اکرم......فیصل آباد
اس نے کہا بھول جاؤ مجھے ساحل
ہم نے بھی کہہ دیا کون ہو تم
نور سحر شاہ......شنکیاری
میں جو سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم کدا تجھے کہاں ملے گا نماز میں
صدف مختار......بوسال مصور
زندگی آ بیٹھ ذرا بات تو سن
دوست بھول بیٹھے ہیں کوئی مشورہ تو دے
عائشہ شکیل......گوجرہ
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
فریحہ شبیر......شاہ نکڈر
عشق دریا ہے جس کا ساحل نہیں ہوتا
ہر دل محبت کے قابل نہیں ہوتا
روتا وہ بھی ہے جو ڈوبا ہو عشق میں
اور روتا وہ بھی ہے جسے عشق حاصل نہیں ہوتا
شہزادی فرخندہ......خانیوال
شکوے شکایتوں کی نہیں یہ ظرف ظرف کی بات ہے
تیرے سو ہم وگمان میں بھی ہم نہیں اور تو لفظ لفظ ہمیں یاد ہے
فاطمہ سہیل......ٹیکسلا
میں تشنہ محبت تھا
تشنیع زمانہ بنایا گیا
یہ جگ نہیں شناسا محبت
تبھی ہدف طعنہ بنایا گیا
وقاص عمر......بنگڑنو حافظ آباد
کہو تو ایک شکوہ کریں تم سے
وقت بہت دیتے ہو پر نجانے کس کو
کوثر خالد......فیصل آباد
نہال بھوک سے مر جائیں مفلسوں کے یہاں
یہ سوچ کر ہی مرا تو گمان رونے لگا
میں کر رہا تھا خلاؤں میں جب بسیرا راج
زمین رونے لگی آسمان رونے لگا
انعم زہرہ......ملتان
کوئی کتنا ہو فریادی محبت ایک نہیں سنتی
پکڑ کر کان میدان میں لے آتی ہے
اور پھر نظروں کا مل جانا ذرا پلکوں کا جھک جانا
بس اتنے سے تردد میں محبت ہو ہی جاتی ہے
رابعہ محمد عمر نائچ......شہداد پور، سندھ
مانا کہ تم اجالوں کے اجالے ہو
مگر اک دیا احتیاط گھر رکھنا
دل توڑنا تو سبھی کو آتا ہے
تم دل جوڑنے کا کوئی ہنر رکھنا
ماریہ نذیر......بھاگٹانوالہ
چھوڑ جاتے ہیں سبھی راہ میں تنہا
رسم الفت میں کہاں رسم وفا ہوتی ہے

کچن گارڈن

زہرہ جبین

حلوہ پوری

اجزاء:۔

چنے	۵۰۰ گرام
پیاز	۲عدد
ٹماٹر	۲عدد
سبز مرچ	۳عدد
لہسن چوپ کیا ہوا	ایک چائے کا چمچ
نمک	حسبِ ذائقہ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچ
پانی	ایک کپ
چنے کا پیسٹ	۱۵۰ گرام

ترکیب:۔

ایک پین میں کھانے کا تیل لیں اور اس میں پیاز ڈال کر براؤن کرلیں۔ اب اس میں لہسن پیسٹ، ادرک پیسٹ ڈال کر دو منٹ تک پکالیں۔ پھر اس میں ٹماٹر، سبز مرچ، کلونجی، ابلے ہوئے چنے پیسٹ، چھولے کا مصالحہ ڈال کر دو منٹ تک پکالیں۔ اب اس میں چنے ڈال کر مزید دو منٹ تک پکائیں اور پانی (تین کپ) ڈال کر دس منٹ تک پکالیں۔ لیجیے مزیدار چنے تیار ہیں۔

پکانے کا وقت: تیس منٹ۔ افراد: تین عدد۔

شہزادی فرخندہ..... خانیوال

پوری بنانے کے لیے

اجزاء:۔

میدہ	۳ کپ
پانی	ڈیڑھ کپ
کھانے کا تیل	ایک لیٹر

ترکیب:۔

ایک باؤل میں میدہ لیں اور اس میں دو کھانے کے چمچ تیل، پانی اور نمک ڈال کر مکس کرلیں۔ اب اسے گوندھ کر تیس منٹ تک فریج میں رکھ دیں۔ اب گندھے ہوئے میدے کی گول گول پوریاں بنالیں اور ایک پین میں کھانے کا تیل لیں اور اس میں تیار شدہ پوریاں ڈال کر فرائی کرلیں۔ آپ کی مزیدار پوریاں تیار ہیں۔

پکانے کا وقت: بیس منٹ۔ افراد: تین عدد

حلوہ بنانے کے لیے

اجزاء:۔

سوجی	۲۵۰ گرام
چینی	۵۰۰ گرام
پانی	ایک لیٹر
گھی	۲۵۰ گرام
الائچی	۶ عدد
زردہ کا رنگ	ایک چائے کا چمچ

ترکیب:۔

ایک پین میں پانی لیں اور اس میں الائچی اور چینی ڈال کر شیرہ بنالیں اب ایک پین میں گھی لیں اور اس میں سوجی ڈال کر براؤن کرلیں اب براؤن کی ہوئی سوجی کو تیار شدہ شیرے میں ڈال دیں اور گاڑھا ہونے تک پکالیں زردہ کا رنگ ڈال کر مکس کرلیں۔ آپ کا مزیدار حلوہ تیار ہے۔

فائزہ بھٹی..... پتوکی

چکن بریانی

اجزاء:۔

چکن	سوا کلو
چاول	ایک کلو
ادرک لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسبِ ذائقہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	تین عدد درمیانی
ٹماٹر (باریک کٹے ہوئے)	چھ عدد درمیانے
دہی (پھینٹا ہوا)	ایک پیالی

سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پسی ہوئی	دو کھانے کے چمچ
دھنیا پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
گرم مصالحہ پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچ
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی)	چھ سے آٹھ عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی
پودینہ (باریک کٹا ہوا)	آدھی گٹھی
ثابت گرم مصالحہ	دو کھانے کے چمچ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
دودھ	ایک پیالی
کیوڑہ ایسنس	چند قطرے
کوکنگ آئل	ایک پیالی

ترکیب:۔

دیگچی میں کوکنگ آئل کو درمیانی آنچ پر تین سے پانچ منٹ گرم کرکے ثابت گرم مصالحہ ڈال دیں۔ جب کڑکڑانے لگے تو پیاز ڈال کر سنہرا فرائی کرلیں۔ ادرک، لہسن، ہلدی اور زیرہ ڈال کر دو سے تین منٹ تک چمچ چلائیں اور پھر ٹماٹر شامل کرکے اتنی دیر پکائیں کہ ٹماٹر گل جائیں۔ جب ٹماٹر اچھی طرح گل جائیں اور ایک پیسٹ کی شکل میں آجائیں تو چکن، نمک، لال مرچ، پسا ہوا دھنیا، پسا ہوا گرم مصالحہ، ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ ڈال دیں پھر دہی ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور درمیانی آنچ پر بارہ سے پندرہ منٹ تک پکائیں۔ چاولوں کو تھوڑے سے ثابت گرم مصالحے کے ساتھ ایک کنی (مکمل ابلنے سے تین چار منٹ پہلے) ابال کر چھلنی سے پانی چھان لیں۔ بڑے سائز کی دیگچی میں چکن کو پھیلا کر رکھیں اور اس کے اوپر چاولوں کی تہہ لگا دیں۔ دودھ میں زردے کا رنگ اور کیوڑہ ایسنس ملا کر چاولوں پر چھڑک دیں۔ دیگچی کو ڈھک کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے گرم توے پر رکھ کر ہلکی آنچ پر دم پر پکائیں۔

انجم انجم...... کراچی

ہرے مصالحے کی بریانی

اجزاء:۔

گوشت	ایک کلو
چاول	ایک کلو
ادرک لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچ
نمک	حسب ذائقہ
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	بارہ سے پندرہ عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا)	ایک گٹھی
کالی مرچ (موٹی کٹی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچ
ثابت گرم مصالحہ	دو کھانے کے چمچ
دہی پھینٹا ہوا	دو پیالی
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
دودھ	آدھی پیالی
کیوڑہ ایسنس	چند قطرے
گھی	ایک پیالی

ترکیب:۔

دیگچی میں گوشت ڈال کر اس میں ادرک لہسن، پیاز، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، پودینہ اور ایک پیالی پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر اتنی دیر پکالیں کہ گوشت اچھی طرح گل جائے۔ دہی میں کالی مرچ اور نمک ملالیں، گوشت کو چولہے سے اتار کر اس میں دہی اور گھی ڈال دیں اور ایک طرف رکھ دیں۔ چاولوں کو گرم مصالحے کے ساتھ ایک کنی (مکمل گلنے سے تین چار منٹ پہلے) ابال لیں۔ چھلنی میں ڈال کر زائد پانی نکال لیں۔ بڑے سائز کی دیگچی میں گوشت کو پھیلا کر رکھیں اور اوپر ابلے ہوئے چاول ڈال دیں۔ زردہ کا رنگ اور کیوڑہ ایسنس دودھ میں ملا کر چاولوں پر چھڑک دیں، چاول ڈھک کر گرم توے پر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر پکائیں۔

طاہرہ مجید...... گجرات

حلیم لکھنوی

اجزاء:۔

گوشت	دو کلو
دلیہ	۳۷۵ گرام

دال ارہر، چنا، ماش، مسور	۳۷۵ گرام	
پیاز	۲۵۰ گرام	
چاول	۶۰ گرام	
ادرک	حسب ضرورت	
ہری مرچ، ہرا دھنیا	تھوڑا سا	
لیموں	دو عدد	
گھی	۳۷۵ گرام	
ہلدی، نمک، مرچ	حسب ذائقہ	

ترکیب:۔
گوشت کا قورمہ تیار کرلیں دوسرے چولہے پر دلیا دھوکر نمک ڈال کر چڑھا دیں۔ تیسرے پر ایک دیگچی میں ارہر کی دال دھوکر ہلکا سا نمک ڈال کر چڑھا دیں۔ جب ادھ گلی ہو جائے تو چنے کی دال ڈال دیں پھر ماش مونگ اور آخر میں چاول ڈال دیں (سب دالیں اور چاول پہلے سے علیحدہ علیحدہ بھگو لیں پھر پکایئے) جب تینوں علیحدہ علیحدہ تیار ہوں تو سب کو ملا کر خوب گھوٹ لیں اور اوپر ہرا مصالحہ کاٹ کر ڈالیں پھر پیاز سرخ کرکے ڈالیں اور دم پر لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد کھولیں۔ پیش کرتے ہوئے اس کے ساتھ لیموں، ادرک اور ہری مرچ کٹی ہوئی استعمال کریں۔

سحرش نعیم ...... سرگودھا

لہسن کی چٹنی

اجزاء:۔

نمک	ضرورت کے مطابق
لہسن کی گٹھیاں	۲ عدد (چھیل کر جوے الگ کرلیں)
سبز مرچ	پسند کے مطابق
لیموں کا رس	پسند کے مطابق
گھی	ایک بڑا چمچ

ترکیب:۔
کسی کٹوری میں گھی کو کڑکڑائیں اور موٹا کوٹا ہوا لہسن گھی میں ڈال دیں۔ ایک منٹ کے لیے بھونیں۔ سرخ نہیں کرنا۔ اب سبز مرچیں کوٹ کر ڈال دیں پھر ایک دفعہ چمچ چلائیں۔ لیموں کا رس اور نمک ڈال کر ملائیں۔ لہسن کی چٹنی تیار ہے۔

بنیش عبدالمالک ...... کہروڑ پکا

فرائی فش

اجزاء:۔

مچھلی	ایک کلو (فرائی کرنے کے لیے ٹکڑے بنوالیں)
لال مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
پسا ہوا لہسن	۲ کھانے کے چمچ
سرکہ	۳ سے ۴ کھانے کے چمچ
اجوائن	ایک چائے کا چمچ
بیسن	آدھا پاؤ
آئل	حسب ضرورت

ترکیب:۔
سب سے پہلے مچھلی کو نمک اور سرکہ لگا کر پندرہ سے بیس منٹ کے لیے رکھ دیں اور پھر اچھی طرح دھولیں۔ اب لہسن، اجوائن، نمک اور مرچ کو اچھی طرح مچھلی کے ٹکڑوں پر لگا دیں۔ ایک بڑی پلیٹ میں مصالحہ لگی مچھلی کے ٹکڑے اس طرح رکھیں کہ ٹکڑے آپس میں جڑے رہیں اب مچھلی کو کم از کم دو گھنٹے کے لیے فریج میں میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں تاکہ مچھلی کا زائد پانی نکل جائے۔ اب بیسن میں حسب ذائقہ نمک اور تھوڑی سی پسی ہوئی لال مرچ ملا کر آمیزہ بنالیں۔ زیادہ گاڑھا آمیزہ نہ ہو۔ آئل گرم کرکے مچھلی کے ٹکڑوں کو بیسن میں ڈبو کر درمیانی آنچ پر دونوں طرف سے گولڈن براؤن فرائی کرلیں۔
مزیدار فرائی مچھلی تیار ہے، گرم گرم نوش کیجیے۔

سحرش ندیم ...... گجرات

alam@naeyufaq.com

زینب احمد

بہار

بہار آکے بہار گزری
نہ دل یہ بدلا، نا آس بدلی
چراغ لے کر پھری بہت میں
نا ذوق بدلا، نا آگ بدلی
وہ کہہ رہا تھا نا بدلا موسم
میں کہہ رہی تھی ہوائیں بدلی
وہ رخ بدل کر چلا گیا پھر
میں راستے میں کھڑی رہی تھی
یہ میں نے دیکھا ہے اور جانا
ہے بدلا موسم بہار بدلی
اسی طرح وہ رخ بدل کر
بتا گیا ہے وہ اپنی خوبی
وہ بدلا ایسے ہے جیسے موسم
تو میں نے جانا ہے یہ آخر پری!
بہار بدلی بدل کے گزری

فاطمہ ناصر..... بہاولپور

وقت کی دھوپ

میری طرف سے وہ رخ بدلتا گیا
پھر بھی جانے کیوں سنورتا گیا
عشق کی داستان لوگ سننے لگے
ہر کوئی پھر آہیں بھرتا گیا
میں نے سوچا دکھاؤں اسے کچھ زخم
وہ پھر سے وار خنجر کے کرتا گیا
وقت کی دھوپ کا کوئی اثر ہوگیا
وہ برف کی طرح پھر پگھلتا گیا
اس سے رسماً پوچھا کبھی میرا حال
میں خوش گمانیوں میں گھرتا گیا
سانس رکنے لگی راج پھر سے میری
دیکھا جب میں نے وہ سمت بدلتا گیا

سید عبادت راج..... ڈیرہ اسماعیل خان

مٹا ہی نہیں

جس کو چاہا وہ ملا ہی نہیں
محبت کا یہاں کوئی صلہ ہی نہیں
شکایت کسی سے ہم کرتے بھی کیا
مجھے کسی سے کوئی گلہ ہی نہیں
جیسا تیرے بچھڑنے کا ملال ہے
میری آنکھ سے آنسو بہا ہی نہیں
من کی کلی مرجھانے کے بعد
پھر پھول کوئی یہاں کھلا ہی نہیں
لاکھ تجھے بھلانا چاہا دل سے مگر
تیری یاد کا عکس مٹا ہی نہیں
قریب رہ کر دیکھ لیا اس کے
فاصلہ دل کا انصر مٹا ہی نہیں

نعیم انصر ہاشمی..... جھنگ صدر

تشکیل باقی ہے

محبت کے کلیسا کی ابھی انجیل باقی ہے
مرے جذبات کی راشد ابھی تشکیل باقی ہے
نظارا دیکھنا ہوگا تری آنکھوں کے اندر کا
کہ جس میں ڈوبنا ہوگا کہیں اک جھیل باقی ہے
ہم اپنی جان بھی دے دیں اگر چاہو مرے حاکم
تمہارے حکم کی کوئی ابھی تعمیل باقی ہے
مجھے رخت سفر اپنا کوئی سامان رکھنا ہے
کٹھن ہیں راستے سارے کہ سنگ میل باقی ہے
ابھی سر کو جھکانا ہے ترے قدموں میں آ کر
ابھی کچھ خواب رہتے ہیں، ابھی تکمیل باقی ہے
لہو دل کا جلانا ہے تو پھر یہ روشنی ہوگی
ابھی تم حوصلہ رکھو، ابھی قندیل باقی ہے

کہ پتھر دل پگھل جائے اگر اک بار آجاؤ
کچھ ایسے ہی ہماری ذات کی تحلیل باقی ہے
ابھی منصف کے آنے میں ذرا سی دیر ہے لیکن
ابھی اک بات کرنی ہے، ابھی تحویل باقی ہے
کوئی خیرات میں راشد ہمیں دینے کو آجائے
محبت کی کسی دل میں ابھی زنبیل باقی ہے
راشد ترین..... مظفر گڑھ

میرے مولا

میں وہ کتابیں علم اور
نصاب کہاں سے لاؤں
جن کو پڑھ کر سمجھ کر
میں اس بے رحم دنیا کے
لوگوں کو اور
ان کی سازشوں کو سمجھ سکوں
میرے مالک
میں ان پڑھ اور جاہل ٹھہری
یہ میری ڈگریاں
اس دنیا کے لوگوں کے سامنے
کاغذ کے بے کار
پرزے ٹھہرے
شگفتہ خان..... بھلوال

شیشہ گری

خوش گمانیوں کا بھی گماں تک نہ رہا
سفر میں منزل کا نشان تک نہ رہا
دہرے چہرے، بدلے لہجوں کی تفسیر ہیں لوگ
اب تو شیشہ گری کا ساماں تک نہ رہا
دل کے ہاتھوں مجبور تھا وہ شخص
پھر اس کا فسانہ فقط زباں تک نہ رہا
یادوں کے دیپ بھی کب تک جلتے رہتے
قربت میں سانسوں کا جہاں تک نہ رہا
اپنے حالات کا اندازہ بھی تھا مجھے شکیل
ساعتوں کے ہاتھ بھی اب زیاں تک نہ رہا
عائشہ شکیل..... گوجرہ

بے خوف صنم

ساتھ میرے ہے
جب تک تو
ڈر ہے کیا مجھے
دنیا کا
دنیا کے ہر وار کو جھیلوں
ڈٹ کے لڑوں ہاں
سب سے میں
ہاتھ میں میرے ہاتھ تیرا
جب تک ہے، سنو ہمدم
تب تک میں نڈر بہت
تب تک میں بے خوف صنم
مدیحہ نورین مہک..... گجرات

میرے نشان

زندگی چل رہی تھی یونہی بے سبب اپنی
کوئی تیرا سبب نہ بن سکے تو میں چلوں
چلے سمندر ساحل پر چھوڑے پیروں کے نشان
کوئی اس مٹی سے میرے نشان نہ مٹا سکے تو میں چلوں
گزارے جو لمحے تیری زلفوں کی چھاؤں میں ہم نے
کوئی اور وہ لمحے نہ جی سکے تو میں چلوں
محسوس کی خوشبو تیرے وجود کی ہم نے ہمیشہ
کوئی اور اس خوشبو کو محسوس نہ کر سکے تو میں چلوں
جئے تیرے خیال کو لے کر طلوع و غروب آفتاب بھی دیکھا
کوئی اور اس آفتاب کی روشنی میں بجھتے نہ دیکھ سکے تو میں چلوں
کہی جو باتیں میرے کاندھے پر رکھ کے سر تو نے
کوئی اور ان باتوں کا تصور نہ کر سکے تو میں چلوں
نہ لی کبھی اجازت تیرے حجرے میں آنے سے پہلے
کوئی اور وہ اجازت نہ لے سکے تو میں چلوں
تراش کے ہیرا بنا دیا تو نے نعمان اس کو
کہ اب تو کسی کا آشیانہ نہ بنا سکے تو میں چلوں
راؤ محمد نعمان..... کراچی

ننھی گڑیا

اے کاش میں اک ننھی گڑیا ہوتی

اے کاش
میں اک ننھی گڑیا ہوتی
ہر چھوٹی بات پر
ہنستی اور کھلکھلاتی
کھلونا ٹوٹتا تو
گھر سر پر اٹھالیتی
پھر سب میرے اپنے
میری دلجوئی کرتے
مجھے دلاسا دیتے مجھے بہلاتے
میرا ٹوٹا کھلونا جوڑنے میں مگن ہوتے
یا پھر ہمیشہ کی طرح
مجھے نہال کردیتے
مجھے غم ہوتا تو اپنی
گڑیا کی شادی کا
خوشی ہوتی تو
جگنوؤں کو پکڑنے کی
تتلیوں سنگ اڑنے کی
ہر دن میرا
معصوم خواہشوں سے بھرا ہوتا
مگر آج
میں ٹوٹ گئی ہوں
دل روز کرچی کرچی ہوتا ہے
خود ہی اسے جوڑنے میں مگن ہوتی ہوں
زندگی کے تلخ ایاموں پر
خاموشی سے آنسو بہاتی ہوں
نہ کوئی واویلا کرتی ہوں
نہ گھر سر پر اٹھاتی ہوں
میں بڑی ہوگئی ہوں
مگر خواہش وہی ہے کہ
اے کاش
میں اک ننھی گڑیا ہوتی

مریم منور......سمندری

حسرت یار

حسرت یار میں ہم مر چکے تھے
کیا کہیں پیار میں ہم مر چکے تھے
کھیل جاری رہا ناچتی رہی کٹھ پتلی
مگر کردار میں ہم مر چکے تھے
ہم تھے انجان اس کی دوغلی فطرت سے
وہ تھا جیت کے خمار میں ہم مر چکے تھے
اسے بتاؤ کہ فیصلے میں عدل نہیں تھا
خطا تھی دل کی بیکار میں ہم مر چکے تھے
کسی پہ دوش نہیں بھول اپنی تھی نگار
دب کے خواہشوں کے انبار میں ہم مر چکے تھے

سدرہ نگار......نامعلوم

پاگل لڑکی

اک لڑکی شوخ و چنچل سی
ہر پل شرارتی مسکراہٹ لبوں پہ لیے پھرتی تھی
ہنسنا، کھلکھلانا اور دوسروں کو ستانا
وہ بس کام یہی کرتی تھی
بن پوچھے کوئی آ بسا من میں اس کے
دل ہی دل میں اس پہ مرتی تھی
انجان تھی وہ بھی اس سے
ہر ستم دل پہ سہتی تھی
اک لڑکی شوخ و چنچل سی
نہ اب ہنستی ہے نہ کھلکھلاتی ہے
نہ دوسروں کو ستاتی ہے
ہر پل چپ، اس کے لبوں پر گھری رہتی ہے
گل وہ اب تو چپ ہی رہتی ہے

گلشن چودھری گل......گجرات

میری آس

میری آس تو اور امید تو
مرا خمار تو اور نیند تو

آرزو ہے تو مرے چارہ گر
اب نہ دیر کر اب نہ دیر کر
جو ہیں منزلیں جو ہیں راستے
یہ ہیں منتظر ترے واسطے
ہم کھڑے ہیں سب تیرے منتظر
اب نہ دیر کر اب نہ دیر کر
مری آس تو اور امید تو
مرا خمار تو اور نیند تو

وقاص عمر......حافظ آباد

جوڑ نہ پائی

دعاؤں کے حصار کو دعائی توڑ نہ پائی
نفرتوں کی ہواؤں کو محبت موڑ نہ پائی
کوشش تو بہت کی پر ناکام ہی ہوئی
میں ٹوٹے بکھرے رشتوں کو جوڑ نہ پائی
بن تمہارے جینا بھی اک عذاب سا ہے
چاہ کے بھی میں تمہیں چھوڑ نہ پائی
بکھری ہوئی ہوں بکھری ہی رہوں گی میں
میں لوگوں کے دلاسوں سے خود کو جوڑ نہ پائی
خواہش تو یہی ہے حاسدوں کی اور یہی رہے گی
پھر بھی مجھے اور تمہیں دنیا توڑ نہ پائی

تبسم بشیر حسین......ڈنگہ

غم کا پنچھی

تو نے دیکھی ہے وہ حالت
کہ جس میں
دکھ بھی صدمے سے دور کہیں مر جاتا ہے

ہاں
مجھ کو اعزاز یہ حاصل ہے
میں نے محسوس کی ہے وہ کیفیت بارہا
کہ جس میں
غم کا پنچھی بھی تھک ہار کے گر جاتا ہے

رمیکا بینال......لاہور

حوصلہ

ہمارا حوصلہ دیکھو!
جب بھی زخم کھائے ہیں
ہم مسکرائے ہیں

سباس گل......رحیم یار خان

فریاد ہے

جنت ارضی مری برباد ہے
ہر طرف اک ظلم ہے بیداد ہے
اے خدا فریاد ہے فریاد ہے
التجا تجھ سے ہے بس امداد ہے

راؤ تہذیب حسین تہذیب......رحیم یار خان

بھولا مجھے وہ شخص

بھولا مجھے وہ شخص ایسا چند ساعتوں میں
کانچ کی چوڑیاں ہوں جیسے ہاتھوں میں
خود کو چھپا کر ہنستے رہنا عادت ہے
پھر چپکے چپکے روتے رہنا راتوں میں
یہ کیا تیرے انداز ہی نرالے ہیں
کچھ سوچ کر بولتے بولتے رک جانا باتوں میں
کسی کی یاد میں گم رہتی کیوں ہو اکثر؟
کھوئی رہتی ہو ہر پل کسی کی یادوں میں
تیری یہ عادت بڑی اچھی لگتی ہے
شرمندگی سے قلم کو دبانا دانتوں میں

سارہ عمر......سعودی عرب

shukhi@naeyufaq.com

شوخئ تحریر

ہماذوالفقار

قرآن پاک

قرآن پاک (یعنی کلام اللہ) اور ذکر و فکر دل اور روح کی خوشگوار غذائیں ہیں لیکن اگر بیمار آدمی کو گھی اور گوشت کی طرح لذیذ اور مقوی غذائیں دی جائیں تو اسے ہرگز لذیذ معلوم نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان سے کچھ فائدہ اور تقویت پہنچتی ہے بلکہ الٹا نقصان ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل کے لوگ فرضی قصوں اور ناولوں کے پڑھنے سے کبھی سیر نہیں ہوتے لیکن قرآن پاک کی ایک سطر پڑھنے سے ان پر موت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ محبت اور عشقیہ کہانیوں سے ان کے نفس کو اور قوت ملتی ہے اور نفس دن بدن موٹا اور فربہ ہوتا جاتا ہے اور دل اپنی مخصوص غذا اور دوا کے نہ ملنے سے بیمار اور کمزور ہوتا جاتا ہے سو جوں جوں جسمانی امراض دنیا میں بڑھتے گئے ان کے لیے علاج اور دوائیاں بھی نئی نئی ایجاد ہوتی گئیں اور اسی طرح قلبی اور روحانی امراض کا قیاس کر لینا بھی ضروری ہے۔

فاطمہ مصطفیٰ......سرگودھا

محبت

محبت کی پہلی شرط عزت ہے اور جو عزت نہیں دے سکتا وہ کبھی محبت بھی نہیں دے سکتا۔

قیما خان......الوینا خان

اعتماد

اعتماد وہ نازک شیشہ ہے جو ایک مرتبہ ٹوٹ جائے پھر کبھی نہیں جڑتا اور اگر جڑ بھی جائے تو چہرے دو ہی نظر آتے ہیں۔

خیر

جو لوگ خیر بانٹتے ہیں محبتیں بانٹتے ہیں وہ لوگ ہمیشہ یاد کیے جاتے ہیں۔

مدیحہ نورین مہک......گجرات

بچے ہمارے عہد کے

پروفیسر اپنے بیٹے سے: ٹام کیا تم جانتے ہو ڈارون نامی سائنسدان کہتا ہے کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔

بیٹا حیران ہو کر۔ ''ڈیڈی کیا میں بھی......''

نورین انجم اعوان......کراچی

مہکتی کلیاں

○ ایک دل کے دو معبود نہیں ہوا کرتے۔

○ محبت ہوس کے مقابلے میں زیادہ عقل مند ہے۔

○ محبت کی تائید تمام عادتوں کو بدل دیتی ہے۔

○ ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے۔

○ بحث و تکرار گفتگو کی موت ہے۔

○ زندگی کا مقصد حصول مسرت نہیں بلکہ تکمیل انسانیت ہے۔

○ زندگی مسلسل عمل ہے اور سکوت یا جمود موت۔

○ انسان کا سب سے بڑا بوجھ غصہ ہے۔

مشا علی مسکان......لاہور

پیاری بات

کسی کے ساتھ پیار سے مذاق ضرور کرنا
مگر کبھی کسی کے ساتھ مذاق سے پیار نہیں کرنا

شہرین اسلم......بہاولپور

کچھ انمول باتیں

☆ جتنا زیادہ سوچو گے اتنی ہی اذیت میں رہو گے یا تو اپنے آپ کو مضبوط کر لو یا پھر مصروف کر لو۔

☆ دوسروں کو سمجھانا مشکل ہو جائے تو خود کو سمجھا لینا چاہیے۔

☆ آپ کی آنکھیں اکثر وہی لوگ کھولتے ہیں جن پر آپ آنکھیں بند کر کے بھروسا کرتے ہیں۔

گلشن چوہدری گل......گجرات چک محمود

کھلا پیسہ

پٹھان بال کٹوا کر گھر آیا، بیوی نے پوچھا۔

”اتنے چھوٹے کیوں کرالیے بال۔“
پٹھان نے کہا”بیگم اس کے پاس کھلا پیسہ نہیں تھا میں نے کہا بیس کے اور کاٹ دو۔“
علشبہ نور.....بھیر کنڈ

سنہری باتیں

❖ معافی نہایت اچھا احسان ہے اور احسان انسان کو غلام بنادیتا ہے۔
❖ زیادہ ہوشیاری دراصل بدگمانی ہے۔
❖ وقت کی اگر قیمت ہے تو اس کا درست استعمال ہے۔
❖ مصائب سے مت گھبرائیں کیونکہ ستارے اندھیرے میں ہی تو چمکتے ہیں۔
❖ علم بے علم اور عمل بے علم سے پرہیز ہی بہتر ہے۔
فہمیدہ جاوید.....ملتان

بل

آج ہی مجھے ملا بجلی کا جو بل
بل کی رقم دیکھ کر لرز اٹھا میرا دل
ایک پنکھا اور دو بلب جلیں
ہلکی سی روشنی پنکھے کے پر نہ چلیں
اٹھارہ گھنٹے رہتی ہے بجلی بند
گرمی اتنی کہ سانس ہونے لگے بند
دن کو مکھیاں رات کو مچھر
کانوں میں گنگنائیں
ہمیں وہ تگنی کا ناچ نچائیں
ان سے بچ کر ہم بھلا کہاں جائیں
بل میں تخفیف کرانے جائیں جب دفتر
وہاں اکثر ملتے نہیں سیٹ پر افسر
کل آئیں پھر بل آپ کا ٹھیک ہوگا
پھر ہر روز یہ سلسلہ تضحیک ہوگا
یہ آج روز بن جاتی ہے کل
کل کل سے دل ہمارا جاتا ہے جل
قاضی صبا ایوب.....اٹک

سنو

میں کیوں رنجور رہتی ہوں
تھکن سے چور رہتی ہوں
کبھی آ کر ملا بھی کر
کوئی مجھ سے گلا بھی کر
جو کچھ بھی پاس ہے میرے
مری جاں نام ہے تیرے
مجھے پھر چوم کر ساجن
اتارو ہاتھ سے کنگن
خموشی ساز بن جائے
تیری آواز بن جائے
جو دل کہتا ہے کہنے دو
خدارا اب نہ شرماؤ
چھپے کیوں ہو نظر آؤ
تمہارے ساتھ رہنا ہے
سب ہی دکھ درد سہنا ہے
تو یہ بے گانگی کیوں ہے
ہر اک شے اجنبی کیوں ہے
پروین افضل شاہین.....بہاولنگر

یادیں

✦ یادیں مایوسیوں میں امید کا چراغ ہیں۔
✦ یادیں انسان کا سرمایہ حیات ہیں۔
✦ یادیں ایک شگفتہ پھول کی مانند ہیں۔
✦ یاد رکھنا بھی ملاقات کی ایک شکل ہے۔
✦ خدا کی یاد سب بلاؤں سے نجات دلاتی ہے۔
شہرین اسلم.....چوک شاہدرہ

بہت یاد آئے

تمہیں قوم نے مال و زر جو دیا تھا
مزے اس پہ کیا کیا نہ تم نے اڑائے
چھڑا جب تمہیں بھی کرپشن کا قصہ
خدا کی قسم تم بہت یاد آئے
راؤتہذیب حسین تہذیب.....رحیم یار خان

خوشی کی عمر

''خوشی کی عمر جانتے ہو کتنی ہے؟''

''بہت تھوڑی۔''

''کتنی؟''

''میری تنخواہ جتنی جو ہفتوں نہیں ہفتے میں ختم ہو جاتی ہے۔ جب خوشی کی عمر مختصر ہے تو دکھ کی عمر دراز کیوں کرتے ہیں ہم ہفتوں، مہینوں ایک ہی بات پر دکھی کیوں ہوتے ہیں؟''

سپاس گل...... رحیم یار خان

ایک سچائی

آج کل انسانوں میں کہاں اتنا ظرف کہ وہ کسی کی غلطی کو معاف کرسکیں وہ تو بس ایک چھوٹی سی خطا کے منتظر ہوتے ہیں پھر آپ کی ساری محبتیں اور ساری قربانیاں خاک میں ملادی جاتی ہیں آپ کے وجود سمیت۔

فرحین عمران...... کراچی

کٹھی میٹھی

۞ اگر کبھی غصہ آئے تو اپنے غصے کا فائدہ اٹھائیں غصے میں گھر کی صفائی کرڈالیں یقین جانیں غصے میں گھر کی صفائی، بہت اچھے سے، بہت جلدی ہو جاتی ہے۔

۞ آپ کا واسطہ دو طرح کے لوگوں سے ضرور پڑتا ہے ''ہائے'' بول کر غائب ہو جانے والے اور ''بائے'' بول کر مزید دو گھنٹے دماغ چاٹنے والے۔

فریحہ شبیر...... شاہ نکڈر

اللہ کا کرم

روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالنے کے بعد بھی ہم اللہ کے محتاج ہیں وہ چاہے تو اس نوالے کو حلق میں پھنسا دے سانس بند ہو جائے اور ہم مر جائیں اتنے محتاج ہونے کے بعد بھی ہم اتنے نافرمان اس کی رحمت تو دیکھو۔ سب نافرمانیوں دیکھ کر بھی نوازتا چلا جاتا ہے نوازتا چلا جاتا ہے، سبحان اللہ۔

ریمانور رضوان...... کراچی

نماز دین کا ستون

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

❁ نماز حق تعالیٰ کی رضا مندی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

❁ نماز فرشتوں کی محبت کا وسیلہ ہے۔

❁ نماز طریقہ ہے انبیا سا یقین کا۔

❁ نماز معرفت الٰہی کی مشعل ہے۔

❁ نماز اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔

❁ نماز دعا قبول ہونے کا سبب ہے۔

❁ نماز کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی۔

❁ نماز سے روزی میں برکت ہوتی ہے۔

❁ نماز مومن کے دل کا نور ہے۔

❁ نماز قبر کے اندر روشنی ہے۔

❁ نماز قیامت کے روز نمازی پر سایہ کرے گی۔

❁ نماز نمازی کے سر کا تاج اور بدن کا لباس ہے۔

❁ نماز کا وزن سب گناہوں پر پڑ جائے گا۔

❁ نماز پل صراط کے لیے پروانہ راہداری (پاسپورٹ) ہے۔

❁ نماز جنت کی کنجی ہے جو جنت کے بند دروازہ کو کھول کر نماز کو اس میں داخل کرے گا۔

عاصمہ عاشق...... حافظ آباد

اصول

خوش رہنے کا اصول یہ بھی ہے کہ جہاں آپ کو لگے کہ وہاں آپ کی جگہ نہیں وہاں سے خاموشی سے خود کو الگ کرلو۔

کلثوم نواز...... گجرات

صحابیات رسولؐ

اب کچھ واقعات صنف نازک کے بھی سن لیجیے تاکہ یہ بات بھی مستحضر رہے کہ اللہ تعالیٰ نے خواتین میں سے کیسی کیسی جاں نثار صحابیاتؓ آنحضرت ﷺ کو دی تھیں۔

غزوہ احد میں اکثر خواتین بشمول حضرت عائشہ صدیقہؓ مشکیں بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں خالی ہونے کے بعد پھر جاتیں اور بھر کر لاتی تھیں۔

عین اس وقت جب کافروں کے ایک دستے نے آنحضرت ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی اور آپ ﷺ کے ساتھ صرف چند جاں نثار رہ گئے تو حضرت ام عمارہؓ آنجناب ﷺ کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہوگئیں، جب کفار آپ ﷺ کی طرف بڑھتے تھے تو یہ تلوار سے روکتی تھیں حضرت صفیہ حضور ﷺ کی پھوپی اور حضرت حمزہؓ کی بہن شکست کی خبر سن کر میدان احد میں پہنچیں، آنحضرت ﷺ نے ان کے صاحبزادے حضرت زبیر کو تاکید کی کہ یہ حضرت حمزہ کی نعش نہ دیکھنے پائیں کیونکہ سید الشہدا کا مشرکین کی خواتین نے بے دردی سے مثلہ کیا تھا آنحضرت ﷺ کا پیغام سن کر بولیں کہ "میں اپنے بھائی کا ماجرا سنتی ہوں لیکن اللہ کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔" آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی نعش پر گئیں اور عزیز بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہوگئیں اور مغفرت کی دعا مانگی انصارؓ میں سے ایک عفیفہؓ کے باپ، بھائی اور شوہر سب معرکے میں شہید ہوئے تھے، باری باری ان سب حادثوں کی خبر سنتیں لیکن ہر بار یہ پوچھتیں رسول اللہ ﷺ کیسے ہیں؟" لوگوں نے کہا بخیر ہیں بے اختیار پکار اٹھیں کل مصیبۃ بعدک جلل "آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔"

عثمان عبداللہ...... کراچی

باتیں یاد رکھنے کی

○ کسی انسان میں خوبی دیکھو تو اسے بیان کرو لیکن اگر خامی دیکھو تو وہاں تمہاری خوبی کا امتحان ہے۔

○ ہر انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہے اگر اسے سمجھنا ہے تو اسے بولنے دو۔

○ صرف جائے نماز وہ جگہ ہے جہاں رو لو تو سامنے والا تماشا نہیں بناتا۔

حمیرا قریشی...... حیدرآباد، سندھ

خوب صورت باتیں

❁ رشتوں کو سنبھالنے کے لیے جھکنا پڑے تو جھک جائیں لیکن بار بار آپ ہی کو جھکنا پڑے تو رک جائیں۔

❁ اس دن پر رو جو تیرے عمر کا گزر گیا اور تو نے اس میں نیکی نہیں کی۔

❁ خواہشوں کو بے لگام مت چھوڑو یہ باغ ہو جائیں تو حرام، حلال جائز، ناجائز کچھ بھی نہیں دیکھتی۔

❁ گزری ہوئی زندگی کو کبھی بھی یاد مت کرو کیونکہ جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ ضرور ہو کر رہتا ہے۔

نجم انجم اعوان...... کراچی

عبادت اور محبت

کسی نے ثمرہ سے پوچھا۔ محبت اور عبادت میں کیا فرق ہے؟

تو

ثمرہ نے مسکرا کر کہہ دیا۔

محبت عبادت جیسی ہوتی ہے اور عبادت میں اکثر محبت کو ہی مانگا جاتا ہے۔

ثمرہ گلزار...... کوٹلی، گجرات

محبت

محبت ایک ہیرے کی مانند ہوتی ہے
جس کی چمک انسان کو اندھا کر دیتی ہے
اور وہ اس ہیرے کی پہچان نہیں کر پاتا
اور دوسرے پر یقین کرتا چلا جاتا ہے
یہاں تک کہ وہ اپنی ذات کو بھلائے ڈوب جاتا ہے

انتخاب: ثوبیہ نظیر...... آزاد کشمیر

husan@naeyufaq.com

جویریہ احمد

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ! شروع اللہ تبارک و تعالیٰ کے بابرکت نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ ڈاک کا نظام اب بہت ہی زیادہ خراب ہوتا جارہا ہے۔ ہر ماہ آپ سب کی شکایات موصول ہوتی ہیں کہ ہمارا تبصرہ شامل نہیں کیا۔ اب کافی تاخیر سے ڈاک ہم تک پہنچتی ہے یا پھر سرے سے ملتی ہی نہیں۔ اس وجہ سے محفل میں شرکت ہونے سے رہ جاتی ہے۔ اگر آپ قارئین کے پاس میل کرنے کی سہولت ہے تو اس سے فائدہ اٹھائیں اور اپنا تبصرہ میل کردیں، اب بڑھتے ہیں آپ سب کے تبصروں کی جانب۔

ثمرہ گلزار ...... کوٹلی گجرات ۔السلام علیکم! حجاب فرینڈ السلام علیکم پاکستان۔ جوہی جی دیکھیے تو ذرا آپ کی محفل میں کون آیا ہے ارے حیران مت ہوئیے میں کوٹلی کی ایک پری ثمرہ آپ کی محفل کو چار چاند لگانے کے لیے آئی ہوں۔ ہاہاہاہاہا۔ اس ماہ کا ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا گزارے لائق جوہی جی عید آرہی ہے عید پر ماڈل کا پیارا سا اسٹائل دیجیے گا۔ ''حمد و نعت'' ہمیشہ دلچسپ ہوتی ہے۔ ''بات چیت'' نہیں پڑھی وہ اینڈ میں پڑھوں گی۔ ''مرگ تمنا'' مادرا آپی ویسے تو آپ بہت اچھا لکھتی ہیں پر یقین جانیے میں نے تین قسط اس ناول کی پڑھی مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا آخر تنگ آ کر پڑھنا ہی چھوڑ دیا۔ ''عشق نگر کے مسافر'' میں ارسل اور ماریانہ کا کپل بہت پیارا ہے۔ آپی ندا حماد اور فاریہ کو بھی ملا دیں اور ناول کا اینڈ کردیں پلیز۔ مکمل ناول میں ''دل کو کس کا ملال تھا'' شرجیل کو عائشہ کا عائشہ کو اذان کا اذان کو صابر کا اور سنبل بی بی کا اذان کا (ہاہاہاہاہا) عائشہ کے ساتھ بہت برا ہوا مجھے پتا تھا وہ مرنے والی لڑکی عائشہ ہی ہے۔ ''میرے سکندر'' میں سکندر اور میرب کو ملا دیں۔ نگینہ اور امل کو بھی ملا دیں۔ عابی اور بخشو کو بھی ملا دیں پھر ناول کا پیارا پیارا اختتام ہوجائے گا۔ ویسے جوہی جی دیکھیے میں نے دومنٹ میں ناول کا اختتام کردیا، ہاہاہاہاہا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ ''بزم سخن'' میں سمیہ عثمان ہم سے کیا کوئی ناراضی جو آپ کبھی بھی جگہ دیتی ہیں۔ ''کچن کارنر'' میں کچھ بھی یاد نہیں رہتا سب انوکھی انوکھی ڈشیں ہوتی ہیں۔ ''موج سخن'' میں ہماری باری پتا نہیں کب آنی ہے۔ ''شوخئ تحریر'' میں ساری باتیں اچھی طرح سے ذہن میں بٹھالیں۔ ''حسن خیال'' نہیں پڑھا۔ فاطمہ ظفر اینڈ عشرت فاطمہ مارچ میں آپ دونوں کی برتھ ڈے ہے۔ ''مٹی مٹی ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔'' اس کے علاوہ نجمہ نذیر آپی کی طرف سے ان کی بھتیجی ربیعہ ملکانی کو بھی سالگرہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ ربیعہ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ بلکہ سب پڑھنے والوں کو بھی۔ اللہ رکھا بھائی میں نے آپ کو انکل کہا آپ کو برا لگا میں مذاق میں کہہ رہی تھی۔ ویسے بھائی آپ اور ظہیر بھائی کا تبصرہ اے ون ہوتا ہے۔ خوش رہیں، ہمیشہ اس کے علاوہ حجاب کے سب پڑھنے والوں کو میرا ڈھیر سارا سلام سب دعا کیجیے اللہ مجھے صحت دے آمین اللہ حافظ۔

اتنے برے تو نہ تھے ہم\
جتنے الزام لگائے لوگوں نے\
بس کچھ مقدر برے تھے\
کچھ آگ لگائی اپنوں نے

☆ پیاری ثمرہ! ماڈل کو میں تیار نہیں کرتی ورنہ تم چڑیل دیکھ کر خود کو تصور کرتیں۔

رمشا آصف ...... خان گڑھ ۔السلام علیکم! جوہی آپی۔ امید کرتی ہوں تمام دوست خیریت سے ہوں گی۔ اس بار حجاب تیرہ تاریخ ہفتے کے دن کو اسکول سے واپسی پر میں خود لیتی آئی تھی۔ فرینہ اعجاز کے علاوہ تمام ماڈلز کا قحط پڑ گیا ہے؟ مجھے اچھی نہیں لگی۔ ہنس تو ایسے رہی تھی جیسے خطرے کا سائرن بج رہا ہو۔ ایک تو مجھے فرینہ اچھی نہیں لگتی اور سونے پہ سہاگہ بار بار اس کی تصویریں آنچل وحجاب پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس بات پر مجھے بہت غصہ آتا ہے۔ ''بات چیت'' پڑھی۔ اس کے بعد ''حمد و نعت'' کی جانب ہمیشہ کی طرح دونوں بہترین تھیں۔ ''دل کو کس کا ملال تھا'' اس ماہ کی زبردست تحریر رہی۔ ویسے میں نے تبصرہ اسی کہانی کے لیے کیا ہے۔ نادیہ آپی کے سوالوں کے جواب جو دینے تھے تو آپی جی میرے خیال سے عائشہ کو اذان کو معاف کردینا چاہیے۔ ویسے اذان کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو صابر کے خاندان کی تلاش میں تھا تو اس کو صابر کے خاندان کا فرد مل گیا۔ اذان کے جنون نے اسے اس حالت میں پہنچایا ہے کہ اس پر قتل کا مقدمہ ہوگیا۔ ویسے آپی آپ راہینہ کو نہ مارتی تو کیا ہوجاتا؟ مجھے اس کا کردار اچھا لگتا تھا۔ اگر وہ مکاریاں کرتی بچی تھی تو انجانے میں عائشہ کو اذان کو معاف کردینا چاہیے تھا تاکہ زندگی کا آغاز ہوسکے۔ شرجیل منحوس، گھٹیا انسان، سامعیہ کو یہ راز اپنے سینے میں دفن نہیں کرنا چاہیے۔ شرجیل کو اس کے کیے کی پوری سزا ملنی چاہیے اور میں اس انجام سے سو فیصد مطمئن ہوں گی۔ ارم آپی کے بار بار اصرار کرنے پر تبصرہ کیا ورنہ میرا بالکل بھی دل نہیں تھا (وجہ نہیں پوچھیں گی آپ) وجہ یہ تھی کہ اس بار مجھے کوئی ایک بھی کہانی اچھی نہیں لگی۔ ''محبت ماہ تمام'' صائمہ قریشی سے مجھے اس قدر بورنگ کہانی کی توقع نہیں تھی۔ ''شریک سفر'' انتہائی فضول بورنگ سی کہانی ہم ڈائجسٹ انجوائے ہونے کے لیے لیتے ہیں نا کہ بور ہونے کے لیے کوئی ایک اچھی سی کہانی لگا دیتے آپ لوگ تو کیا بگڑ جاتا ہاں۔ ''موج سخن'' سے صرف

انعم زہرہ اور نعیم انصر نے اچھا لکھا۔ ''بزم سخن'' سے شانزہ شانو، گلشن چودھری، رمشاء شاہ، نجم انجم اور نور سحر شاہ نے اچھا لکھا۔ ''کچن کارنر'' ابھی پڑھا نہیں میں نے۔ ''شوخئ تحریر'' سے ارم آصف، ام ہانی، عائشہ مبین، رخسانہ مبین، وقاص عمر، ثوبیہ سحر، عظمیٰ بٹ اور جویریہ وکی نے اچھا بلکہ بہت اچھا لکھا۔ ''حسن خیال'' میری پیاری دوست حرا گل کا پہلا تبصرہ۔ واؤ دل خوش ہوگیا۔ ان شاء اللہ ضرور آنا آپ ہمارے گھر مالٹے کھا کھا کر تو طبیعت ہی خراب ہے۔ آپ کا تبصرہ اچھا لگا۔ گلشن چودھری آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا پڑھ کر خوشی ہوئی، شکریہ۔ پیاری لڑکی عائشہ شکیل میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ بھی بہت اچھا تھا پیاری دوست پروین افضل بہت مختصر تبصرہ ارم آصف اور رمشاء آصف کا تبصرہ اچھا لکھا۔ ہاں بھئی میں نے خود جو لکھا تو اس لیے پسند آیا۔ ام ہانی کا تبصرہ اچھا لگا۔ ظہیر ملک تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کا تبصرہ کافی طویل تھا اچھا لگا۔ اللہ رکھا چودھری کا طویل تبصرہ پڑھا اچھا لگا۔ شادی کے لیے ابھی سے آہیں نہ بھریں بلکہ دعائیں مانگا کریں پھر جلدی ہوگی میں نے اس بار بہت مختصر کیا ہے تبصرہ کیونکہ مجھے بہت غصہ تھا۔

☆ پیاری رمشا! ہماری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ بہتر سے بہترین دیا کریں پر وہی بات کہ سب کو مطمئن کرنا ناممکن ہے، ان شاء اللہ کوشش کریں گے اس سے بہترین دیں۔

ارم آصف ملک ...... خانگڑھ۔ السلام علیکم! حسن خیال کی شان میری جان جو ہی جانو کو ارم آصف کا سلام قبول ہو، کیوں جو ہی جانو کیا ناں سلام قبول؟ ہاں تو جی جو ہی آپی پہلے تو میری طرف سے مبارک ہو۔ (کیوں بھئی؟) ارے بتاتی ہوں ناں۔ پاکستان کی ٹی ٹونٹی میچ میں کامیابی کی مبارکباد ہو سب کو حجاب مجھے تیرہ تاریخ کو ملا وہ بھی بہت انتظار کرانے کے بعد فرینہ میڈم خود تو اچھی نہیں لگی پر مسکان بڑی پیاری تھی۔ قسم سے اور دیکھ ایسے رہی تھے جیسے یہ کہہ رہی ہوں (دیکھو باجیوں میں تمہاری جان نہیں چھوڑنے والی) ہاہاہاہا اور میں نے وہ گھوریاں دکھائی کہ بے چاری گھبرا کر بولی کہ اب فہرست پر بھی نگاہ دوڑالو، میں نے کہا بچی تیرے نال تے فیر نبٹا گئی (ہاہاہاہاہا) فہرست پر نگاہ دوڑائی تو ''آنگن کی چڑیا غائب'' یہ کیا آپی جی۔ نیا سلسلہ موجود تھا۔ سب سے پہلے تو آئی ہے ''بات چیت'' کی جن سے یہ پتا چلا! کہ نئے افق کے مدیر اور مشتاق انکل کے صاحبزادے اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کریں اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ بہت دکھ ہوا آپی جی ویسے میں نے یہ خبر فیس بک پر جب میں نے آنچل اور حجاب کا آفیشل پیج سرچ کیا تب پڑھی۔ اللہ پاک ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ ''حمد و نعت'' ہمیشہ کی طرح اے ون رہی ماشاء اللہ نیا سلسلہ ''ادب اور میڈیا'' اچھا لگا۔ آپی آپ نے بالکل صحیح کہا کہ اب ڈرامے واقعی گھر توڑنے میں مصروف ہیں بجائے گھر جوڑنے کے اور فلمیں بھی تو کوئی ڈھنگ کی نہیں آرہی ہیں۔ ہاں البتہ یہ رسالے ناول بہت اچھا کردار ادا کر رہے ہیں۔ رسالوں اور ڈراموں کی رائٹرز ایک ہی ہیں جو آپ رسالوں میں لکھتی ہیں جبکہ ڈرامے اُف جبکہ ریڈیو جیسا آپ نے کہا کہ ہر جگہ سنا جاتا ہے۔ ریڈیو کی مقبولیت میں بھی کمی نہیں ہوئی جبکہ مدیران اور ڈائریکٹرز کی ڈیمانڈ مختلف ہوتی ہے۔ ''دل کو کس کا ملال تھا'' ہائے اللہ جی ہماری پیاری آپی نادیہ ہم سے مخاطب تھیں۔ نادیہ آپی آپ کے پہلے سوال کے بارے میں میرا یہ کہنا ہے کہ عائشہ کو اذان کو معاف کر دینا چاہیے۔ قصور عائشہ کا تو نہیں تھا نہ اس کے باپ کا تھا پھر اس کے باپ کے کیے کی سزا عائشہ کو کیوں ملے؟ دوسرا سوال بھی کافی انٹرسٹنگ ہے۔ اذان نے جنون میں آکر جو خسارہ کیا اسے پتا تو نہیں تھا نہ عائشہ کے پریگننٹ ہونے کا اور ویسے بھی اس بچی کے نصیب میں نہیں تھا۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنا، عائشہ اور اذان کو آگے کی زندگی ایک ساتھ گزارنی چاہیے اگر ان کے نصیب میں اولاد ہوئی تو انہیں ضرور مل جائے گی۔ عائشہ نے اپنی زندگی میں کم دکھ تو نہیں دیکھے کیا اب خوشیاں اس کا حق نہیں ہیں؟ آپی آپ جیسے بھی کریں اذان اور عائشہ کو ملائیں ورنہ دل میں تشنگی سی رہے گی۔ ویسے آپی آپ نے کہانی بہت اچھی لکھی ہے موضوع بھی شاندار ہے لیکن کہانی کے درمیان میں ایسی اقساط بھی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کہانی رک سی گئی ہو۔ اس لیے بور ہوتے تھے اور کوئی بات نہیں ہے۔ اب ہو جائے کہانی پر تبصرہ آپی کیا کوئی اتنی حد تک بھی گر سکتا ہے جیسے شرجیل (نادیہ آپی آپ نے شرجیل کا اینڈ بہت برا کرنا ہے) منحوس شرجیل نے کس طرح راہینہ کا گلہ کاٹ ڈالا اور ڈرامہ بھی ایسے رچایا جیسے قتل شرجیل نے نہیں بلکہ اذان نے کیا ہو بھولا بھالا سا اذان قتل کے جرم میں پھنس گیا شرجیل تیرا تو اللہ مالک ہے۔ سامعہ اللہ کی بندی کیا تمہیں تمہارا ضمیر ملامت نہیں کرے گا؟ اب یہ سامعہ پر منحصر ہے کہ وہ اذان کی پھانسی رکواتی ہے یا نہیں ''عشق نگر کے مسافر'' اف اللہ جی اتنی خطرناک کہانی ہے پر اب پتا نہیں فاریہ اور حماد کا کیا بنے گا دلاور نے ایک ہو کر سب کی زندگی برباد کر دی لیکن وہ اب فاریہ کی زندگی بھی برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔ ندا آپی آپ نے اختتام بہت اچھا کرنا ہے۔ ''محبت ماہ تمام'' صائمہ قریشی آپی خوش آمدید آپی اگلے ماہ آخری قسط ہوگی ناں اس لیے دونوں اقساط ایک ساتھ پڑھوں گی ''زندگی دھوپ چھاؤں'' کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر سکی۔ آذر شاہ اور عامش خٹک کے درمیان کیا دشمنی تھی واضح نہیں کیا آپ نے ''میرے سکندر'' میں تو کہتی ہوں کہ امل اور نگینہ کی شادی نہیں ہونی چاہیے۔ جبکہ میرب اور سکندر کا کیا بنے گا اگلی آخری قسط میں پتا چل جائے گا ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا قرۃ العین آپی بہت اچھی کہانی ہے۔ ''وہ کوئی خواب تھا'' آدھی کہانی پڑھ کر ہی پتا لگ گیا کہ ساجد زمانی ایک فلرٹی ہوگا نکما، کہانی بے جا طوالت کا شکار لگی ہے یوں لگا جیسے افسانے کو لمبا کھینچ کر مکمل ناول بنایا ہو۔ ''جگنوں سے بھر لے دامن'' بہت اچھا لگا۔ ''یہ فاصلے رہنے دو'' بس صحیح تھا یہ افسانہ ''شریک سفر'' ناشکری کرنا بے برکتی کا سبب بنتا ہے۔ حقیقت میں بھی ایسا ہوتا ہے اور اسی موضوع پر میں نے پچھلے ہفتے کالم بھی پڑھا ہے فیس بک پر لیکن سلمیٰ فہیم گل

آپی نے بہت اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ ''میری جنت'' یہ عورت پر ہی منحصر ہے کہ وہ اپنے گھر کو جنت بنائے یا پھر جہنم بہت اچھا سبق تھا اس افسانے میں۔ ''بزم سخن'' تبسم بشیر حسین کا شعر دل کو چھو گیا۔ یسمی خان، شانزہ پرویز شانو اور ان کے علاوہ بھی سب کے اشعار اچھے لگے۔ ''کچن کارنر'' یائے جی سب ڈشز لاجواب تھیں منہ میں پانی بھر آیا قسم سے سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں ڈشز۔ ''موج سخن'' نہیں پڑھا ابھی۔ ''شوخئی تحریر'' قاضی صبا ایوب ہاہاہا۔ رخسانہ مبین، عائشہ مبین، ارم صابرہ، لیلیٰ رب نواز، مدیحہ نورین مہک، فیاض اسحاق مہانہ، ام ہانی شاہد، الفت اینڈ فائزہ عباسی، عظمیٰ بٹ (واقعی ایسا ہوتا ہے) اور بھی سب کے انتخابات سپر ڈوپر تھے۔ جبکہ اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی شکریہ ہما آپی جی ہمیشہ خوش رہیں۔ ''حسن خیال'' حرا گل غفور آپ کو حجاب میں پہلی بار شرکت پر خوش آمدید۔ پیاری دوست آپ کو ایسا کیوں لگا کہ آپ مجھے اچھی نہیں لگتی ہو اور مجھے تو یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آرہا ہے کہ میں نے ایسا کیا لکھا کہ آپ کو ایسا لگا (کیونکہ پچھلے ماہ کا حجاب خالہ کے پاس ہے) جس طرح ہم آپ کو اچھے لگتے ہیں بالکل ادھر بھی یہی حال ہے۔ آپ نے مجھے میری سالگرہ وش کی مجھے بہت خوشی ہوئی شکریہ نہیں کہوں گی کیونکہ دوستی میں کیسا شکریہ ہاہاہا۔ گلشن چودھری پیاری دوست کہاں غائب تھیں آپ، ہمارا تبصرہ آپ کو اچھا لگا بہت خوشی ہوئی۔ اب دوبارہ غائب مت ہو جانا میری کیوٹ سی دوست عائشہ شکیل (تسی کتھے غائب تھیں) آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا ہے ماشاء اللہ ایسے ہی آتی رہنا گم نہ ہو جانا اب دوبارہ نور چودھری کی طرح پروین افضل شاہین آپی اتنا چھوٹا سا تبصرہ کیا آپ نے (کیوں بھئی) آپ نے مجھے سالگرہ کی مبارکباد دی آپ کا شکریہ آپی جان اور آپ نے کہا کیک کھلا دو تو اب منہ کھولو آپی (آن آں) ہاں اب بتاؤ کیسا لگا کیک ہاہاہاہا۔ بہت اچھا لگا ناں آپی جان جبکہ مسکان خان اور قرینہ اعجاز سے دور رہیں آنچل اور حجاب کو ام ہانی کا تبصرہ بھی شاندار تھا۔ جبکہ جوہی آپی کا جواب بھی اچھا لگا آپی جان اگر آپ کی سیٹ کوئی بھائی لے اڑا تو ہمارا پہلے اللہ حافظ ہوگا۔ ہاہاہاہا۔ جبکہ ہم ''حسن خیال'' ہم بہنوں کی سیٹ پر بھائیوں کو قبضہ نہیں کرنے دیں گے ہاہاہاہا۔ دیکھا ناں بہنوں اب جلدی جلدی سے اپنی سیٹ پر واپس آجاؤ ظہیر ملک بھائی اور اللہ رکھا بھائی آپ کو میرا تبصرہ اچھا لگا شکریہ جبکہ آپ دونوں کا تبصرہ اچھا ہوتا ہے پر آپ شادی کے رنج کم لگایا کرو۔ جوہی آپی میں آنگن کی چڑیا بھیج رہی ہوں پلیز زیادہ انتظار مت کرانا مہربانی ہوگی اور اگر میری کوئی بھی بات بری لگی ہو تو معاف کر دینا۔ حرا گل اور ایمن غفور آپ دونوں کا آنگن کی چڑیا کب شائع ہوا تھا بتانا ضرور اوکے جبکہ ہم نے جون 2019ء سے حجاب لینا شروع کیا ہے اور آپی میرا تبصرہ پورا شامل کرنا پلیز۔ اللہ پاک آپ کو اور آنچل وحجاب ٹیم کو ہمیشہ اپنی رحمت کے سائے میں رکھے، آمین۔ اللہ حافظ۔

اللہ رکھا چودھری...... ہارون آباد۔ جوہی آپی اور پیارے سے حجاب کے تمام اسٹاف اور قارئین کو السلام علیکم! اس بار حجاب نو تاریخ کو ملا جب میں ہارون آباد شہر میں اپنے پاپا کے ساتھ انگوٹھی پسند کرنے گیا تو کتابوں والی دکان کے سامنے سے گزرا تو نیو وحید کا بی ہاؤس والوں کی دکان پہ حجاب لشکارے مارتا ہوا ملا جسے دیکھتے ہی پاپا کو کہا کہ ابو جی انگوٹھی بعد میں پہلے حجاب۔ سرورق ہر ماہ کی طرح خوبصورت تھا لیکن بہتری کی گنجائش ہمیشہ رہ ہی جاتی ہے۔ اس ماہ کیا کمی تھی یہ جوہی آپی آپ خود ہی بتا دیں۔ فہرست دیکھی اور ''بات چیت'' کو پڑھ کر آنکھیں نم ہوئیں اتنی سردی میں بھی دل گھبرانے لگ گیا تو جلدی سے کمرے کی کھڑکی کھولی، میں جب بھی عمران احمد قریشی صاحب کی وفات کے بارے میں پڑھتا ہوں مجھے سمجھ نہیں آتی دل چاہتا ہے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دوں مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے کوئی ہمیں تپتے صحرا میں اکیلا چھوڑ گیا ہے، ہماری آنکھیں اسے تلاش کر رہی ہیں لیکن ہمارا وہ سایا جو ہمارے سروں سے اٹھ گیا ہے مگر وہ ہمارے دلوں میں سدا رہے گا۔ میں ہر نماز کے بعد ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہوں جب بھی دعا مانگنے لگتا ہوں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ ''بات چیت'' پڑھنے کے بعد ''حمد و نعت'' پڑھی ہمیشہ ہی طرح اللہ پاک کی اور ہمارے پیارے نبی ﷺ کی شان بیان کی گئی۔ ''ادب اور میڈیا'' پڑھ کر خوشی ہوئی بہت ہی اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آنچل اور حجاب کے سلسلے ''آئینہ اور حسن خیال'' کو میری طرح سب ہی پسند کرتے ہیں، باقی سب باتیں غور طلب ہیں۔ ''محبت ماہ تمام'' صائمہ قریشی آپی کی تحریر کی شروعات بہت ہی لاجواب انداز میں ہوئیں لیکن پھر تیسرے پہرے سے لمبے لمبے خط پڑھ کر مجھے بھی وہ وقت یاد آگیا جب مجھ سے محلے کے لڑکے خط لکھواتے تھے اور الحمدللہ میرا اچھا خاصا کاروبار تھا لیکن پھر بدقسمتی سے لاہور ایسا گیا کہ بس نہ پوچھیں (ویسے کتنی خوش فہمی ہے نہ کوئی بھی نہیں رہا ہاہاہاہا) ویسے پہلی قسط بہت خوب رہی لیکن اس قسط کے اختتام پہ تو رونے کو دل چاہا پتہ نہیں اب اگلے قسط میں کیا ہونے والا ہے (مجھے تو ابھی سے ہول اٹھ رہے ہیں۔) باقی اگلی قسط کا شدت کے ساتھ منتظر ہوں لگتا ہے اگلی ناول میں بہت سے خط پڑھنے کو ملیں گے ان شاء اللہ۔ ''عالیہ حرا'' سس کی ایک بار پھر انٹری ہوئی ''جگنو سے بھر لے دامن'' کے ساتھ لیکن پڑھ کر ایسا معلوم ہوا جیسے کہانی کو خود سے ہی لمبا کیا گیا ہے۔ جب کہ کم الفاظ میں بھی یہ خوبصورت میسج بہت اچھے سے لکھا جا سکتا تھا لیکن مجھے تحریر کا پلاٹ بہت پسند آیا ویل ڈن۔ ''مرگ تمنا'' کے بارے میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے کیوں کہ اس کی تعریف کے لیے الفاظ مریخ سے لانے پڑھیں گے ماورا طلحہ آپی تو ہر قسط میں حیران کر دیتی ہیں ایک تو سسپنس اتنا ہے کہ دل چاہتا ہے ایک ہی بار مل جائے ویسے مجھے عزت کا کردار بہت پسند ہے مجھے نہ ہر قسط پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے قسط بہت چھوٹی ہے لیکن جب صفحات دیکھتا ہوں تو خاموشی کے ساتھ اگلی کہانی پڑھنی شروع کر دیتا ہوں۔ ''زندگی دھوپ چھاؤں'' عنوان تو کافی پرانا ہے لیکن ''فاریہ بتول'' نے اس پرانے عنوان پہ

اتنی لاجواب تحریر لکھ کر جان ڈال دی، اختتام بہت ہی پسند آیا اور میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ''شفا سعید سس'' کی تحریر ''یہ فاصلے رہنے دو'' پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وانیہ نے اچھا فیصلہ کیا ویسے مجھے لگ رہا تھا کہ وانیہ اسے روک لے گی لیکن نہ جی شیر کی بچی کو اپنی بات اور احمد وقت پہ یاد آ گئے ویل ڈن۔ ''عشق نگر کے مسافر'' ندا حسنین آپی ان کرداروں پہ اتنا ظلم مت کریں ان مسافروں کو ان کی منزل پہ جانے دیں نہیں تو یہ مسافر اعلان جنگ کر دیں گے کیونکہ عشق نگر کے مسافر ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے تو پھر محبت میں جنگ ضرور ہو جائے گی۔ کہانی کے ساتھ ساتھ شاعری میں جو نظمیں لکھیں بہت پسند آئی، اب دیکھتے ہیں اگلی قسط میں کیا ہوتا ہے۔ ''سلمٰی فہیم گل'' کی تحریر ''شریک سفر'' پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ امینہ جیسا کردار جس نے ہر حال میں اپنے شریک سفر کا ساتھ دیا، ایک سبق آموز تحریر۔ ''دل کو کس کا ملال تھا'' نادیہ احمد آپی آپ بہت اچھے سے لکھ رہی ہیں اور مجھے تو ہر قسط بہت خوب لگ رہی ہے، میں تو یہ ہی کہوں گا کہ آپی آپ کے جو کردار ہیں مگر وہ ہم لوگوں سے زیادہ آپ کو پیارے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ بہت اچھا اختتام کریں گی اور جس موضوع کو آپ نے قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے ماشاء اللہ ایک دم فٹ ہے اور مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگ اس ناول سے سبق حاصل کریں گے، ویسے میرا مشورہ یہ ہے آپی کہ آپ کا جو دل چاہتا ہے وہ لکھیں اگر ایسے مشورے لینا شروع کر دیں گی تو آپ اچھا اختتام نہیں لکھ پائیں گی، میرے محلے کی جو بہنیں یہ ناول پڑھ رہی ہیں ان میں سے صرف ایک نے ہی کہا ہے کہ عائشہ اور اذان کو ملنا چاہیے باقی سب کی رائے میری طرح ہے۔ اس قسط کے اینڈ کی لائینیں بہت پسند آئیں اور اسی وقت اپنی ڈائری میں لکھ لی۔ ''میرے سکندر'' کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اگلے ماہ آخری قسط ہے اور مجھے اپنے سکندر کی فکر ہو رہی ہے قرۃ آپی پلیز سکندر کے ساتھ اچھا اچھا کرنا نہیں تو میری روح پرواز کر جائے گی، مجھے تو ابھی سے اگلی قسط کا انتظار لگ گیا ہے۔ ''وہ کوئی خواب تھا سراب جیسا'' اتنا لمبا عنوان اور کہانی پڑھ کر خاموشی کے ساتھ ''سحرش علی نقوی'' کی تحریر ''میری جنت'' پڑھی میرا ابھی دل چاہا اپنی جنت کے پاس چلا جاؤں لیکن اس کے لیے شاید ایک سال کا لمبا انتظار کرنا پڑے گا مجھے لیکن وہ کہتے ہیں ناں کہ امید پہ دنیا قائم ہے۔ ''بزم سخن'' اور ''موج سخن'' میں ساری کی ساری شاعری ایک سے بڑھ کر ایک رہی ہر شعر ہر نظم اور ہر غزل بہت پسند آئی سب کے لیے بہت سی دعائیں۔ ''کچن کارنر'' میں اس ماہ گھر میں ہونے کی وجہ سے میں نے اپنی بھابی کے ساتھ مل کر ''مونگ کی دال کا حلوہ'' بنایا اور خوب دو دن مزے لے کر کھایا بہت ہی اچھا بنا الحمدللہ۔ ''شوخئ تحریر'' بھی کافی اچھا رہا لیکن اپنا نام نہ پا کر بس نہ پوچھیں۔ ''حسن خیال'' میں آپا کو پڑھ کر بہت دکھ ہوا مجھے لگتا ہے کہ ہماری آمد سب بہنوں کو اچھی نہیں لگ رہی ویسے جو ہی آپی آپ مجھے بتا دیں کہ اگر کسی بہن کو اعتراض ہے تو میں تبصرہ نہیں کیا کروں گا کیوں کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری وجہ سے کوئی دوسرا پریشان ہو، باقی سارے تبصرے بہت اچھے رہے، اس ماہ بہت دکھ ہوا اس لیے زیادہ نہیں لکھ سکا، اگلے ماہ تک کے لیے اللہ حافظ۔

☆ بھائی اللہ رکھا! آپ کے تبصرے پر بھلا کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بس تھوڑا مختصر تبصرہ کیا کریں۔

ظہیر ملک ...... ہارون آباد۔ اس دفعہ حجاب کا انتظار تھوڑا زیادہ کرنا پڑا پہلے تو سات کو مل جاتا تھا اس دفعہ بارہ کو ملا۔ ہمیں تو ٹینشن لگ گئی لو جی اس دفعہ ہم حسن خیال کی ٹرین میں شامل نہ ہو سکیں گے لیکن گروپ میں پوسٹ لگائی تو پتہ چلا کہ ابھی ٹکٹیں بانٹی جا رہی ہیں کیونکہ آخری تاریخ بیس ہے تبصرہ بھیجنے کی دل تھام کر لکھنا شروع کر دیا۔ سرورق پہ فرینہ اعجاز صاحبہ کی مسکان بہت پسند آئی فوراً ایک ڈائیلاگ ذہن میں آ گیا کہ ''یہ مسکان ہم کا دے دے فرینہ ورنہ ہم کیا کر سکتے ہیں سوائے آپ کی تعریف کرنے کے'' بہت پیارے سرورق کے لیے داد قبول کریں۔ فرینہ اعجاز کی مسکان کو چھوڑا تو پیاری سی فہرست نے پکڑ لیا جس میں کچھ پرانے ناموں کے ساتھ نئے نام بھی پڑھے سب کو خوش آمدید۔ ''بات چیت'' میں اس دفعہ ایک غم جو نڈھال کر دینے والا تھا پڑھا تو آنکھیں نم ہو گئیں کیونکہ ہمارے پیارے نئے افق کے مدیر عمران احمد قریشی صاحب کی اچانک موت نے بہت دکھ دیا یہ کمی کبھی بھی پوری نہیں کی جا سکتی ہاں دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ کچھ سنبھلے تو پہنچے ''حمد و نعت'' شریف پہ پہنچے دل کو منور کیا، یاسمین کنول صاحبہ اور زاہد قاسمی صاحب کو بہت سی داد دی۔ اس دفعہ کچھ نیا پڑھنے کو ملا جس میں ''ادب اور میڈیا'' کے حوالے سے کافی بہترین نگارشات پیش کی گئی تھیں سیمار ضا صاحبہ نے ایک بہترین یادگار نشست کو قلم بند کیا، مذاکرے میں جو باتیں بیان کی گئیں وہ بہت زیادہ داد و تحسین کے لائق تھیں اللہ تعالیٰ اس کاروان سفر کو ہمیشہ جاری و ساری رکھے۔ ''محبت ماہ تمام'' صائمہ قریشی صاحبہ کی تحریر پڑھنی شروع کی تو مجھے لگا ابھی ختم ہو جائے گی لیکن واہ جی پڑھتا گیا پڑھتا گیا جب آخر میں پہنچا تو پتہ چلا بھیا ابھی باقی ہے، مزیدار تھی کہانی، ای میل پڑھ کر مزہ آ گیا چلو اسی بہانے ای میل اور پیار بھرے خط لکھنے کا تجربہ بھی ہو گیا ہم بھی لکھا کریں گے جب مسسز کو موبائل چلانا آ گیا تو، فی الحال تو شادی کی سیڑھی نہیں چڑھی اس سلسلے میں صائمہ آپی کی دعاؤں کی اشد ضرورت۔ عالیہ حرا آپی کو پہلی دفعہ پڑھ رہا ہوں لگتا بھی ہے کہ پہلی تحریر ہے ''جگنوں سے بھر لے دامن'' اچھی کوشش کی گئی ہے لیکن متاثر نہیں کیا زیادہ اس نے بقایا مصنفہ کے لیے بہت ساری نیک خواہشات آپ کی مزید بہتر کامیابی کے لیے۔ ''مرگ تمنا'' سلسلہ وار ناول کی قسط نمبر سات میں ماروا ظلحہ آپی نے بہترین لکھا ہمیشہ کی طرح، اچھا جا رہی ہے کہانی، عزت کے کردار سے مجھے عشق ہو گیا ہے اب یہ عشق ع سے بننے والی عزت کے ساتھ برقرار رہتا ہے یا ہونے والی بیوی ع سے برقرار رہتا ہے، یہ قسط بھی اپنے آپ میں ایک بہترین شاہکار تھی جیسے جیسے کہانی بڑھ رہی ہے تجسس بھی مزید بڑھ رہا ہے۔ بہت ساری داد۔

''زندگی دھوپ چھاؤں'' فاریہ بتول صاحبہ نے شروعات اچھی کی کہانی کے درمیان تھوڑی بورنگ سی لگی لیکن اختتام نے پھر چونکا کر رکھ دیا بہت زبردست کہانی لکھی آپ نے جس کے لیے بہت سی داد اور دعائیں قبول کریں اسی طرح لکھتی رہیں اور ادب کی دنیا میں چھائی رہیں بلکہ ہر ماہ تبصرہ بھی لکھا کریں تاکہ مزید بہتری آسکے۔ ''یہ فاصلے رہنے دو'' شفا سعید صاحبہ چھائیں آپ کمال کر دیا پہلے پیراگراف میں ہی حیران کر دیا آپ نے، وانیہ کے اتنے سخت کیر الفاظ پڑھے بہت زیادہ پسند آئے جن الفاظ کو کسی سے شدید نفرت کا اظہار کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ پڑھ کر بہت حیرانگی ہوئی میں تو پہلے پیراگراف کے سحر سے نہ نکلا کہ کہانی اختتام پذیر ہوگئی بہت سی داد اور دعائیں کہانی کے لیے۔ ''عشق نگر کے مسافر'' ندا حسنین آپی ایک بہترین سفر لیے چل رہی ہیں ان کی منزل لگتا ہے ابھی کافی دور ہے ہم جیسے مسافر بھی ان کے ساتھ آہستہ آہستہ اٹھتے، بیٹھتے چل رہے ہیں، سلسلہ وار کہانی کی چھبیس نمبر قسط بھی بہترین انداز بیاں اور عمدہ شاعری کے ساتھ بہترین رہی میں ہمیشہ ان کے قلم کو سلام پیش کرتا ہوں اب بھی ایسا ہی کروں گا کیونکہ یہ سفر جو انہوں نے جاری کیا ہوا ہے یہ کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں یہ خاص لوگوں کا سفر ہے جو وہی چلا سکتے ہیں اور اپنی منزل کی طرف کامیابی سے بڑھتے ہیں، ندا حسنین صاحبہ کے لیے بہت سی داد اور دعائیں کہ آپ نے یہ سفر جاری رکھا ہوا ہے۔ ''شریک سفر'' سلمٰی فہیم گل صاحبہ واہ کیا بات ہے، حالات کے ردوبدل پر بہترین تحریر لکھی آپ نے، شریک سفر کا صحیح انتخاب کیا جو انسان کی زندگی بدل دیتا ہے آپ کی کہانی میں بہت سارے سبق چھپے ہوئے تھے، پہلا اور سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ انسان پر جو بھی مشکلات آئیں ان پر صبر کرنا چاہیے اور رب کریم کا دل و جان سے شکر ادا کرنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ ان مشکلات کو بھی آپ کی آسانی میں بدل دے یہی چیز جب ہمارے معاشرے کا رواج بن جائے گی تو ان شاءاللہ بہت جلد ہمارا معاشرہ امن و سلامتی کا گہوارہ بن جائے گا۔ ''دل کو کس کا ملال تھا'' نادیہ احمد آپی اس بار شروع میں کچھ گفتگو ہم سب قارئین سے کر رہی تھیں آپ کی باتوں سے سو فیصد متفق ہوں آپی آپ نے بہترین لکھا، دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیاں حل فرمائے اور آپ کو مزید بہترین کرنے کی ہمت و استطاعت عطا فرمائے، ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آپ نے جو لکھا کمال لکھا یہ قسط بھی لاجواب رہی بہترین موضوع کا انتخاب کیا اور کمال مہارت کے ساتھ اس پر محو سفر ہیں بہت ساری دعائیں آپ کے لیے۔ ''میرے سکندر'' قرۃ العین سکندر صاحبہ کا تو نام دیکھتے ہیں آنکھوں میں عجیب سے چمک اٹھتی ہے جس کی وجہ ان کا لاجواب لکھنے والا انداز جو ہر قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ زیر مطالعہ سلسلہ وار تحریر کی یہ قسط بھی ہمیشہ کی طرح بہت کمال تھی انداز بیاں اور الفاظ کا چناؤ بہترین ہو تو ہر تحریر سپرہٹ ہوتی ہے ماشاءاللہ اور یہ کمال بھی کسی، کسی کے ہاتھ لگتا ہے بہت سی داد قرۃ آپی کے لیے۔ ''وہ کوئی خواب تھا سراب جیسا'' تہمینہ زہرہ آپی کی تحریر نے شروع سے بہت متاثر کیا انزہ امام کا کردار شروع میں جیسا تھا ویسا ہی رہتا تو بہت پیارا لگتا لیکن اب درمیان میں آ کر اس کے کردار میں بہت ساری تبدیلی آ گئی محبت جس سے ایک بار ہو جائے پھر پوری زندگی چاہے اس کی غلامی ہی کیوں نہ کرنی پڑے اسے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ کہانی کا رخ وہاں سے بدلا جہاں انزہ یونیورسٹی اپنا ماسٹر کمپلیٹ کرنے گئی، یونیورسٹی کی آب و ہوا اسے لے ڈوبی، شروع سے لے کر آخر تک تحریر نے بہت متاثر کیا بہت سی داد کہانی کے لیے۔ ''میری جنت'' تحریر میں سحرش علی نقوی صاحبہ نے مختصر الفاظ میں جو سبق دیا وہ ہر ایک شادی شدہ لڑکی کے لیے مشعل راہ ہے، میں نے اکثر دیکھا ہے ہمارے معاشرے میں اکثر شادی شدہ جوڑے چھوٹی چھوٹی باتوں میں جھگڑتے ہیں اگر انہی باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ خوشی خوشی سے حل کر لیے جائیں تو بہترین خاندان تشکیل پاتا ہے چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہمیشہ انسان کو بڑے بڑے نقصانات سے بچا لیتی ہیں کہانی سپرہٹ تھی۔ ''بزم سخن'' کی محفل میں سمیہ عثمان آپی نے بہت پیارے پیارے اشعار مرتب کیے تھے تمام شعراء کے لیے بہت سی داد اسی طرح اس محفل کو سجاتے رہیے۔ ''پکن کارنر'' زہرہ جبین صاحبہ کا سلسلہ پہلی ہی ریسپیر نے دل جیت لیا ''مونگ کی دال کا حلوہ'' پڑھ کر منہ میں پانی بھر آیا انجم انجم صاحبہ نے اچھی ترکیب بتائی، اس کے علاوہ حرا رمضان، تہمینہ طارق، عروسہ نور، تمنیٰ علی، عائشہ ہاشمی آپ سب کی ریسپیز بہت مزیدار اور باکمال تھیں نیک خواہشات سب کے لیے۔ ''موج سخن'' زینب احمد صاحب کی بزم میں پہنچے تو نعت رسول ﷺ سے دل کو منور کیا، منحہ رمشہ صاحبہ کو نیک خواہشات دیتے ہوئے تمام شاعری پڑھی اچھی رونقیں لگائیں سب نے کہیں پیار محبت، کہیں گلے شکوے، کہیں کام کی باتیں سب بہترین تھا داد قبول کریں شاعر حضرات۔ ''شوخئ تحریر'' سلسلہ میں شوخیاں مارتی ہوئی تحریروں نے بہت متاثر کیا، ہما ذوالفقار آپی نے بہت پیاری بزم سجائے رکھی ماشاءاللہ تمام مصنفین کے لیے دعائیں اور نیک خواہشات امید ہے آگے بھی ایسی بہترین نگارشات پڑھنے کو ملیں گی ان شاءاللہ۔ ''حسن خیال'' میں انٹری ماری تو جو ہی احمد آپی کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پہلی نشست پر براجمان بہترین تبصرے کے ساتھ اس دفعہ ''حرا گل غفور'' آپی تھیں جن کا تبصرہ بہت جاندار تھا آپ نے میرا تبصرہ پسند کیا اس کے لیے شکر گزار، پہلی بار شامل ہونے پر آپ کو خیر مقدم کہتے ہیں، آپی ہم لاہور میں کام کرتے ہیں فرنیچر فیکٹری میں کبھی کبھی جب دن میں فری ہوتا ہوں تو کبھی کبھی سارا دن کام، ڈائجسٹ ہم رات کو پڑھتے ہیں یا ہر سنڈے کو گھر دو یا تین مہینے بعد جاتے ہیں جب ڈائجسٹوں سے فارغ ہو جاتے ہیں، گھر سے واپس آ کر پھر اٹھا لیے یہاں لاہور میں ہم جو مرضی کریں کوئی نہیں پوچھتا۔ ''گلشن چوہدری'' صاحبہ کا تبصرہ مختصر لیکن اچھا تھا۔ ''عائشہ شکیل'' آپی کا چٹ پٹا تبصرہ بہت پسند آیا میرا تبصرہ پسند کرنے پر آپ کا شکر گزار ہوں آتی رہا کریں پیاری آپی اچھا لکھا آپ نے۔ پرنس افضل شاہین صاحبہ بھی ننھے منھے تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں ماشاءاللہ۔ ارم آصف ملک آپی آپ ہر دفعہ ہی باکمال تبصرہ کرتی ہیں اس

دفعہ بھی بہت خوبصورت تھا ماشاءاللہ بہت سی داد پیارے تبصرے کے لیے۔ رمشا آصف آپی کا انتہائی باریک بینی سے کیا گیا تبصرہ بہت کمال تھا ماشاءاللہ میرا تبصرہ پسند کیا اس کے لیے شکریہ۔ ام ہانی راجپوت آپی کا تبصرہ اچھا تھا آپ کے بھائی کے لیے دعا گو ہیں کہ وہ دوبارہ لکھنا اسٹارٹ کرے جو ہی احمد آپی آپ دھیان سے کام کیا کریں آپ کی جگہ کوئی نہیں لے گا ہم تو بالکل نہیں اور نہ ہماری اتنی اوقات ہے آپ کے لیے ہمیشہ دعا گو ہیں اسی طرح محفل سجاتی رہیں اللہ مزید ترقی و ہمت عطا کرے آمین۔ آخری تبصرہ سوہنے ویر اللہ رکھا چوھدری بھائی کا تھا جو بہت پیار اور خلوص بھرا تھا شکریہ پیارے، چائے کی پسندیدگی کے لیے سلامت رہیں۔ ہمارا پیارا سا حجاب ہوا مکمل کیونکہ ہم نے یہ پڑھ لیا تو ختم تو ہوگیا ہی ناں اجازت دیں اللہ نگہبان۔

انشراح ایمان…… حافظ آباد۔ ٹائٹل گرل فرینہ اعجاز کو دیکھ کر بے ساختہ منہ سے ''واؤ'' نکلا ارے فرینہ ڈیئر آپ نے تو نیٹ کا ڈریس پہن لیا ہم تو ابھی تک گرم کپڑوں میں گھوم رہے ہیں۔ گھومتے گھومتے پہنچے ''مرگ تمنا'' کے پاس عزت بہن بھول جا حازم بھائی کو کیونکہ یہ تیرا ہیرو نہیں ہے اور یہ لامیہ کو کیا ہوا شروع شروع میں تو بڑی کول سی بندی لگتی تھی لامیہ سوہنے ہوش کے ناخن لے (ویسے یہ ہوش کے ناخن ملتے کہاں سے ہیں) اس سے پہلے کہ ویرے اذلان کو بیبن ہڑپ جائے ویسے بیبن اور اذلان کی جوڑی بری نہیں ہے لیکن ویرے اذلان کے ساتھ تو لامیہ ہی جچتی ہے باقی جو ماورا اپیا کو منظور۔ ''عشق نگر کے مسافر'' اس ناول نے تو ہمیں ہی گھما دیا مجال ہے جو کسی ایک کردار کی سمجھ آجائے صبیحہ، نیلم، نجل اور بھی پتا نہیں کون کون مجھے لگتا ہے اس ناول کو سوچ سوچ کے میرے دماغ کی لسی بن جائے گی (اور وہ لسی آصفہ خان کو پلادوں گی ہاہاہاہا) ''دل کو کس کا ملال'' نادیہ آپی ہمیں تو آپ سے کوئی شکایت نہیں (ربیعہ کو ہو سکتی ہے اس کو ہر ماہ اسی ناول کا انتظار رہتا ہے) عائشہ کو اذان کو معاف کرنا چاہیے لیکن کس بات کی معافی؟ ''محبت ماہ تمام'' ''میرے سکندر'' مکمل ہونے پہ پڑھیں گے ''وہ کوئی خواب تھا'' سچی بات تو یہی ہے لڑکیوں کو موبائل استعمال کرنا ہی نہیں چاہیے اگر کر رہی ہیں تو غلط استعمال تو نہ کریں کسی کی منکوحہ ہو کے نامحرم سے باتیں کرنا افففففف توبہ۔ ''بزم سخن'' حنا خورشید، سونی علی، پروین افضل، فائزہ شاہ، نور سحر شاہ، تبسم بشیر، امبرین کوثر بلکہ سب ہی چھائیں رہی۔ ''شوخیٔ تحریر'' ام ہانی، عائشہ صدیقہ، گل مینا خان، عائشہ مبین، ہالہ سلیم، مدیحہ نورین زبردست لکھا۔ ''حسن خیال'' میں سب بہنوں بھائیوں کے تبصرے لاجواب تھے کسی ایک دو کا نام لینا ناانصافی ہوگی ویسے بھی حسن خیال میں سے سب لاڈوز ز کیوں غائب ہوگئیں کہیں اپنے اپنے میاؤں کو پیاری تو نہیں ہوگئیں ہاہاہا روشی آپو (روشاف بخت) آپ آئیں گی ناں میرے گاؤں، روشی اپیا آپ بڑی پیاری سی بندی ہیں میری دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کے نصیب بہت اچھے کرے آمین۔

فہمیدہ جاوید…… ملتان۔ حجاب ڈائجسٹ پڑھنے والوں کو میرا سلام! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ پہلی بار حجاب کی محفل میں حاضر ہوں اور اس سے پہلے ''آنگن کی چڑیا'' میں بھی آئی تھی۔ فروری ۲۰۲۱ کا سرورق اچھا لگا اگرچہ فرینہ اعجاز ہی حسب معمول سرورق پر ہی تھیں مگر لباس اور انداز متاثر کن تھے۔ ایسے ہی سیدھے اور جاذبیت والے ہی سرورق لگایا کریں اور بھی منظر کشی والے بھی تاکہ انفرادیت برقرار رہے۔ ''بات چیت'' میں سعیدہ تم نے حجاب میں نئی تبدیلی کا ذکر کیا مگر اس ماہ بھی کچھ نیا اور دلچسپ سلسلہ شروع نہ ہوا۔ حجاب میں جلدی سے اچھے دلچسپ پر تفریح اور اصلاحی سلسلے لے کر آؤ۔ ہاں ''میڈیا اور ادب'' کے موضوع پر سیمار رضا کی سروے رپورٹ بڑی شاندار رہی۔ اس طرح کی اردو زبان کے فروغ کی محافل کا انعقاد کرنا ہمارے معاشرے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری قومی زبان کو فروغ ملے۔ ''صائمہ قریشی'' کے قسط وار ناولٹ کی ابتدائی قسط متاثر کن رہی۔ شروع میں صائمہ نے جس طرح ناولٹ میں خطوط لکھوائے یہ اچھا لگا اور تمام ہی بھائیوں کے ایک جیسے نام بھی اچھے لگے۔ ہیروئن کی مثبت سوچ اور ہیرو کو درست باتیں سمجھانے کا انداز زبردست رہا۔ ''عالیہ حرا'' کا افسانہ بھی کافی اصلاحی رہا اور شکر ہے شائستہ بیگم کو ان کے معیار کی بہو مل گئی۔ بس دنیا مکافات عمل ہے۔ ہر بہو ساس بنتی ہے تو کاش اچھائی کو ہی عمل میں لایا جائے۔ ''مرگ تمنا'' ناول دلچسپ ہے اگرچہ مجھے شروع میں ناول اچھا نہ لگا لیکن کہانی آہستہ آہستہ ہی کھلتی ہے اور شروع کی اقساط تو تعارفی مراحل میں ہوتی ہیں۔ ہاں ماورا طلحہ نے منظر نگاری اچھی کی ہے ناول میں اور مجھے ''عزت'' کا کردار زیادہ پسند ہے جبکہ لامیہ کا کردار کافی الجھا ہوا ہے۔ فاریہ بتول کا مکمل ناول کچھ فلمی سا لگا مگر ارحم نے بڑے بھائی عامش کا چھوٹے بھائی کا ماں باپ کے گزر جانے کے بعد اتنا خیال رکھا اچھا لگا۔ اللہ کرے سب بچوں کی ایسی سوچ ہو اور اینڈ میں عامش اور آرزر کی دشمنی ختم اور عامش کی بہن اور ارحم کی شادی اچھی رہی۔ ''شفاء سعید'' کا آغاز کا افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا کہ وانیہ نے اینڈ میں اچھا فیصلہ کیا اور واقعی ہی عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ عزت کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔ وانیہ نے اپنی ماں کی خاطر اپنی محبت قربان کی یہ بات بھی اچھی لگی اصلاحی پہلو تھا۔ ''ندا حسین'' کا سلسلے وار ناول بھی اپنی منازل طے کر رہا ہے۔ بس اب جلدی سے ماریہ کی مشکلات حل ہو جائیں تو ندا جی پلیز فاریہ کی زندگی میں خوشیاں لائیں جلدی سے۔ ''شریک سفر'' افسانہ بھی معیشت لایا آمنہ نے آخر میں شوہر سے معافی مانگ کر اچھا کیا اور واقعی پیسہ خوشحال اور سکون کی زندگی کی ضمانت نہیں۔ اگر محبت، ہمدردی اور احساس ہو تو پیسے کی کمی کے باوجود بھی ازدواجی زندگی پرسکون گزر سکتی ہے اور یہی رائٹر نے بتانے کی کوشش کی کہانی میں۔ ''نادیہ احمد'' نے ناول کے شروع میں خیالات کا اظہار کیا اور بھرپور کیا اور درست کہا کہ ہر کہانی کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور پھر محض قارئین کو خوش کرنے کے لیے خوشگوار اختتام کہانی کا ہر بار ضروری نہیں کے بہت سے مسائل بتانے ہوتے ہیں اور کب تک عورت ہی مظلوم رہے اور مرد عورت پر اپنی طاقت آزماتا رہے۔ میرے

خیال سے عائشہ اذان کو معاف نہ ہی کرے تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس طرح اذان جیسے لوگوں کو مذید شے ملے گی رائٹر ہر کہانی کو سوچ سمجھ کر بھرپور محنت سے لکھتا ہے تو قارئین کو بھی تنقید کرنی چاہیے مگر تنقید برائے اصلاحی یعنی تعمیری تنقید۔ ''میرے سکندر'' بھی اختتام کی طرف گامزن ہے اور رائٹر نے ہر ماہ ہی دلچسپی برقرار رکھی۔ ''تہمینہ زہرہ'' کے مکمل ناول میں ''ازہ امام'' کا غیر محرم کے ساتھ تعلق رکھنا بڑا ہی معیوب لگا شکر ہے اینڈ میں عقل آ گئی ہیروئن کو ورنہ اپنے پاؤں پر ہی کلہاڑی مارتی ورنہ شہباز احمد جیسے اعلیٰ اخلاق اور محب وطن شوہر کو چھوڑ کر خسارہ ہی ہاتھ میں آتا۔ خیر اچھا رہا یہ ناول بھی۔ ''میری جنت'' افسانہ بھی قابل تعریف ہے حقیقت میں عورت کا سسرال ہی جنت ہے اس کی اگر وہ سمجھے جیسے آخر میں سندس کو سمجھ آ گئی۔ ''بزم سخن'' اس بار اشعار معیاری تھے اور موج سخن میں اس بار ''فریدہ خانم، فوزیہ سلطان اور طاہرہ ظفر'' کی نظمیں زیادہ پسند آئیں جبکہ ''شوخیٔ تحریر'' میں تمام ہی بہنوں نے اچھے اقوال زریں اور احادیث پیش کیں اور مجھے اقوال زریں ہی زیادہ پسند ہیں۔ ''حسن خیال'' میں حرا گل، گلشن چوہدری، عائشہ شکیل، پروین افضل، ارم آصف، رمشا آصف، ام ہانی اور ظہیر ور کھا چودھری اور تمام کو دلی طور پر شکریہ کہنا چاہوں گی کہ میرے ''آنگن کی چڑیا'' کے سوال جواب پسند آئے۔ اب بس حجاب میں کچھ نیا پڑھنے کا انتظار رہے کہ کب کوئی نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اگر حجاب میں رائٹرز کا انٹرویوز کا سلسلہ شروع ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔

☆ پیاری فہمیدہ! آپ کی پہلی بار آمد اچھی لگی۔ آپ کی تجاویز پر ضرور غور کریں گے۔

اس دعا کے ساتھ آئندہ ماہ تک کے لیے اجازت کہ اللہ تبارک وتعالیٰ وطن عزیز کو سلامت رکھے اور ہم سب کی پریشانیوں کو دور فرمائے آمین۔

مصنفین سے گزارش

☆ مسودہ صاف خوش خط لکھیں۔ ہاشیہ لگائیں صفحہ کی ایک جانب اور ایک سطر چھوڑ کر لکھیں اور صفحہ نمبر ضرور لکھیں اور اس کی فوٹو کاپی کرا کر اپنے پاس رکھیں۔

☆ قسط وار ناول لکھنے کے لیے ادارہ سے اجازت حاصل کرنا لازمی ہے۔

☆ نئی لکھاری بہنیں کوشش کریں پہلے افسانہ لکھیں پھر ناول یا ناولٹ پر طبع آزمائی کریں۔

☆ فوٹو اسٹیٹ کہانی قابل قبول نہیں ہوگی۔ ادارہ نے ناقابلِ اشاعت تحریروں کی واپسی کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔

☆ کوئی بھی تحریر نیلی یا سیاہ روشنائی سے تحریر کریں۔

☆ مسودے کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخری صفحہ پر اپنا مکمل نام، پتا اور رابطہ نمبر خوشخط تحریر کریں۔

☆ کہانی ای میل کرنے کے لیے ایمیج کی فائل ہو، ایم ایس ورڈ کی فائل میں اردو میں لکھیں تحریر ہونی چاہیے یا یونی کوڈ پر ہو۔ کہانی کے نام سے فائل کا نام رکھنا ہوگا۔ کہانی کے شروع میں کہانی اور اپنا نام لکھیں اور آخر میں اپنا پورا نام، مکمل پتا اور رابطہ نمبر بھی لکھنا ہوگا۔

☆ ای میل چاہے کہانی کی کرنی ہو یا مستقل سلسلوں میں ہمیشہ نیو ای میل کا انتخاب کریں اور سبجیکٹ میں کہانی اور سلسلے کا نام لکھیں۔ جوابی میل پر کچھ بھی ای میل نا کریں اگر جوابی میل پر کچھ بھی ای میل کیا جائے گا وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔

☆ ای میل پر کہانی یا مستقل سلسلے میں شرکت کے لیے اسکین، امیج، رومن یا پی ڈی ایف قابل قبول نہیں ہوتی۔

☆ دیگر سوشل ایپ پر بھی کہانی یا سلسلوں کی کوئی بھی چیز قابل قبول نہیں ہوگی۔

☆ اپنی کہانیاں دفتر کے پتا پر رجسٹرڈ ڈاک یا کوریئر کے ذریعے ارسال کیجیے۔ 81 بیپر بیر کس ہاکی کلب آف پاکستان اسٹیڈیم نزد آنچل پریس کراچی 75510